فکر و خیال

مضامین، افسانے اور تراجم

مصنف

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اردو

ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی



دیگر مطبوعات

شاعری:

1۔ ساحلِ تشنہ لب (1982)

2۔ سوالیہ نشان (دو ایڈیشن) (1989) (1993)

3۔ اِک ہمسفر اچھا لگا (1998)

4۔ تلاوتِ دل (مجموعہ حمد و نعت) (1998)

5۔ Love's no Crime (2005)

6۔ یہ کافرِ دل نہیں مانا (2007)

7۔ اُس کے نام (2014)

8۔ نہ عشق نوں لیکاں لائیں (2016)

9۔ ابھی زندگی کا جواز ہے (2017)

10۔ کس کی یاد آ گئی! (2022)

تنقید:

1۔ جون ڈن، شخصیت اور شاعری (1993)

2۔ اِقبال، بحضور اقبال (1999)

3۔ جون کیٹس، شخصیت اور شاعری (2001)

نثر:

1۔ ذوقِ تماشا (1993)

2۔ جہانِ مہ و پرویں (1997)

3۔ دیدۂ دل (1998)

4۔ کب رات بسر ہوگی (2001)

5۔ آشوبِ آگہی (2007)

6۔ مجھے ہے حکمِ اذاں (2012)

7۔ ڈپریشن، علامات، اسباب اور علاج (2013)

8۔ یا اللہ! (2018)

9۔ اُوٹ پٹانگ (انشائیے) (2020)

خودنوشت:

1۔ پردۂ سیمیں سے (چند سوانحی جھلکیاں) (2009)

زیرِ طبع:

2۔ The Impact of British Poets on Iqbal

(پی۔ ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ)

فکروخیال

(مضامین،افسانےاورتراجم)

مصنف:
پروفیسرڈاکٹرشیخ محمداقبال
ایم اے انگلش،ایم اے اردو،
ایم فل(گولڈمیڈلسٹ)،پی ایچ ڈی

نام کتاب: فکروخیال
مصنف: پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال
سرورق:
کمپوزنگ: تنویر احمد
مطبع: ثنائی برقی پریس سرگودہا
ناشر: پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال
تعداد: 300
اشاعت: 2022ء
قیمت: -/300 روپے

ملنے کا پتہ:
13۔ لالہ زار (الفاروق کالونی) یونیورسٹی روڈ سرگودہا
فون: 03004489399, 048-3221532
email. iqbalsheikh68@yahoo.com
شاہد بخاری
D-651 فیصل ٹاؤن لاہور
042-35161149, 03004855148

انتساب

شاہد بخاری کے نام
جو میرے دوست بھی ہیں اور محسن بھی
انہوں نے علمی ادبی اور فلاحی کاموں میں
ہمیشہ میری بھرپور مدد کی ہے

فہرست

افسانے

تراجم

English Essays

حرفِ سپاس

نظم و نثر میں جو کچھ میں محسوس کرتا رہا اس میں سے بہت سا شاید سپردِ قلم ہو گیا ہے۔ ابھی معلوم نہیں کہ مزید کیا کیا خیالات ذہن میں آتے رہیں گے اور تجربات ہوتے رہیں گے، یہ ایک قدرتی سا عمل ہوتا ہے، احساسات، خیالات اور تجربات نے کبھی نظم کا روپ دھارا اور کبھی نثر کا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ بھی مشاہدات اور تجربات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ان میں سے کون سے تجربات کتنے وقیع ہیں، کتنے دیرپا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ جو آج سچ نظر آ رہا ہے کل غلط نظر آنے لگے۔ کسی نے کہا تھا کہ بسا اوقات ایک زمانے کا فلسفہ آنے والے زمانے میں حماقت تصور ہونے لگتا ہے۔ میرے مشاہدات اور تجربات کا حشر کیا ہو گا اس کا فیصلہ وقت کرے گا اور مجھے اس سے کچھ سروکار بھی نہیں۔ میں نے جو محسوس کیا، جیسا محسوس کیا تحریر کر دیا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہوتے ہیں وہ لاشعوری محرکات کا نتیجہ ہوتا ہے جیسے غالب نے کہا تھا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس کتاب میں کچھ مضامین ہیں، کچھ تراجم اور کچھ کہانیاں جو اس سے پہلے شائع نہیں ہوئیں تھیں بہرحال نذرِ قارئین ہیں۔

میں اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے اپنے بہت سے احباب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ جن میں شاہد بخاری، سید نسیم الغنی اور شاہد اسلام دانش شامل ہیں۔ تنویر احمد

بدستور بہت سے کام سرانجام دیتے رہے ہیں اور وہی ان تحریروں کو کمپوز کرتے رہے ہیں اور مختلف مراحل میں بھرپور کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

میں بالخصوص سپاس گزار ہوں سید افسر ساجد، ڈاکٹر محسن مگھیانہ اور شاہد بخاری کا جنہوں نے سارے مسودے کو پڑھا مفید مشورے دیئے اور اپنی گراں قدر رائے تحریر کی۔

مصنف: ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

یکم نومبر ۲۰۲۲ء

حرفے چند

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال ایک معروف ماہرِ تعلیم، شاعر، نقاد، نثر نگار اور دانشور ہیں۔ وہ دو درجن کتب کے مصنف بھی ہیں۔ راقم سے ان کا تعلق نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ وہ ایک حیران کن ذہانت کے حامل ہیں۔ اوائل عمر میں بصارت ایسی نعمت سے محرومی کے باوصف انہوں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا، انگریزی زبان وادب کے استاد بنے، اردو میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ کالجوں کے علاوہ جامعات میں بھی تدریس کی، بہت سی علمی ادبی ثقافتی اور سماجی تنظیموں کی صدارت یا سرپرستی کی۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان کی یہ سرگرمیاں ہنوز جاری وساری ہیں۔

میرے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں ان کی مجوزہ تخلیق ''فکر وخیال'' (جو تنقیدی مضامین، انشائی تحریروں، افسانوں اور تراجم پر مشتمل ہے) کے بارے میں یہ تعارفی سطور قلمبند کر رہا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کی تحقیقی اور انتظامی صلاحیتوں کا ایک جہان معترف ہے۔ وہ طویل عرصہ سے ماہنامہ ''سفید چھڑی'' کی ادارت واشاعت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں جو ایک وقیع علمی ادبی اور تنقیدی جریدہ ہے۔ ''فکر وخیال'' موصوف کے متنوع، ادبی رجحانات کی ترجمانی کرنے والا ایک خوش فکر شہ پارہ ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی اردو اور انگریزی تحریروں کو یکجا کیا ہے۔

مشہور شاعر احمد فراز پر ان کے ذواللسانی مضامین خاصے فکر انگیز ہیں۔ علامہ اقبال کے بارے میں ان کا مضمون ان کے ذوق مطالعہ کے علاوہ شاعرِ مشرق سے ان کے فکری اور روحانی لگاؤ کی شہادت دیتا ہے۔ اسی طرح شاہد بخاری کے متعلق ڈاکٹر محمد اقبال کا

مضمون،اول الذکر کی شخصی ادبی اور دیگر خوبیوں کا بڑی عمدگی سے احاطہ کرتا ہے۔

خصوصی بچوں اور ان کی تعلیم کے ضمن میں مصنف کے خیالات نہایت قابلِ قدر ہیں کیونکہ یہ ان کے وسیع ذاتی تجربات اور مقتدر خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔انگریزی ادب کے طالب علم ہونے کی رعائیت سے ڈاکٹر اقبال نے شیکسپیئر کے دو معروف ڈراموں لیئر اور میکبتھ کے تشریحی و تجزیاتی محاکے قلمبند کئے ہیں جو عام قاری کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے۔اسی طرح انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیئر اور شاعروں ملٹن اور ورڈز ورتھ پر ان کے مضامین پنجابی زبان کے قارئین کی معلومات میں ضرور اضافہ کریں گے۔

پروفیسر اقبال کے افسانوں میں کہیں کہیں سوانحی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں یہ ان کی مخفی حیاتی صلاحیتوں اور زندگی کے تجربات کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں۔ان میں رومان اور حقیقت کا ایک معتدل امتزاج بھی ہے اور فنی تقاضوں کا مطلوبہ اہتمام بھی۔

مصنف نے انگریزی فکشن کے کچھ نوادرات کو بطرز احسن اردو میں منتقل کیا ہے۔میکس شلمن، ہیلن کیلر،ایڈگر ایلن پو اور جیمس جوائس کی تخلیقات کتاب کے اس حصہ کی زینت ہیں۔ہیلن کیلر کا افسانہ نما مضمون خاصے کی چیز ہے۔موصوفہ خود ایک رائٹر،مقررہ سیاسی کارکن بھی تھیں۔ان کے خیالات اس بنا پر بھی قابلِ توجہ ہیں کہ وہ محض انیس مہینوں کی عمر میں سماعت و بینائی سے محروم ہو گئیں تھیں۔انہوں نے اپنی ساری عمر تعلیم و تدریس اور حقوقِ معذوراں کی ترویج و دفاع میں گزار دی۔

امید ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کی یہ فکری کاوش بھی قبولِ عام حاصل کرے گی۔کتاب کا عنوان خود اسکی فنی اور معنوی جہات کا تعین کرتا ہے۔

سید افسر ساجد (فیصل آباد)

فکر دیکھیں خیال دیکھیں

گو ہم پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کے نام اور کام سے بہت عرصہ سے واقف تھے اور ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی دھوم کی دھمک ہم تک پہنچتی رہتی تھی۔مزید برآں یہ کہ ان کا ماہنامہ رسالہ "سفید چھڑی" ہم تک تواتر سے پہنچ رہا تھا مگر اُن سے ملاقات کی کوئی سبیل نہیں نکل رہی تھی۔چند برس پہلے سرگودھا میڈیکل کالج سرگودھا میں سالانہ مشاعرے میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا کہ ہم بھی اپنی شاعری کے جوہر دکھائیں تو یہی وہ سنہری لمحہ تھا جب ہماری ان سے بالمشافہ ملاقات ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کسی میں کوئی ایک خوبی کم رکھتا ہے تو دوسری خوبیوں کو اتنا توانا کر دیتا ہے کہ بس اب بشری ہمت و حوصلہ رکھنے والا اپنی قوت ارادی سے اس ایک کمی کو بخوبی پوری کر لیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو جہاں بصارت سے محروم رکھا وہاں بصیرت سے مالا مال کر دیا۔انہوں نے عام لوگوں کی طرح زندگی رونے دھونے کی بجائے اپنے عزم و استقلال سے ایسی روشن بنائی اور سجائی کہ بصارت رکھنے والے کئی ادیب و شاعر بھی ان پہ رشک کرنے لگے۔یہ شاید سرگودھا میڈیکل کالج میں ہم دونوں کی ملاقات کا شاخسانہ ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنی تازہ کتاب "فکر و خیال" (مضامین،افسانے اور تراجم) دیباچہ لکھنے کے لئے ارسال کی ہے اور اپنے خط میں ہمارے یوٹیوب چینل کے ذریعے ہماری فکر انگیز پیش کشوں کو سراہا ہے۔ان کی اس نئی کتاب جس میں زیادہ تر غیر مطبوعہ مضامین ہیں،حیرت انگیز طور پر مختلف ادبی جہتوں پر ان کے قلم کی مضبوط گرفت ان کے ان مضامین میں دیکھنے کو

ملتی ہے۔

’فرازاورمزاحمتی شاعری‘‘ کے آغاز میں رقمطراز ہیں:

’’ایک غالبؔ اوراقبالؔ پر ہی کیا موقوف،ادبیاتِ عالم کے مطالعے سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ شعرا وادباء نے ہمیشہ زندگی کو آئینہ دکھایا اور دلوں کے نہاں خانوں میں جھانک کر دیکھا، ریاکاری اور ظاہریت کا پیرہن تار تار کر دیا۔ ہومرؔ ہو کہ ورجلؔ، دانتےؔ ہو کہ موپساںؔ، ٹالسٹائیؔ ہو کہ حافظؔ وسعدیؔ یا میرؔ وغالبؔ سب نے اپنے اپنے انداز میں زندگی کے درد کو محسوس کیا۔ شاعر کوئی مشین نہیں یا کسی مشین کا پرزہ نہیں کہ اشیائے ظاہری کی محض عکس بندی کرتا رہے بلکہ وہ تو ایک جیتا جاگتا سوچتا اور محسوس کرتا کہیں زیادہ ذی حس اور ذی شعور فرد ہوتا ہے،اس لئے وہ کسی Ivory Tower میں مقیم نہیں ہوتا،اگر شعراء اور ادباء نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے‘‘

اس مضمون میں انہوں نے احمد فراز کی ذاتی زندگی،ان کے ہم عصروں کے ان کے بارے میں خیالات اور ان کے کلام کا عمیق جائزہ لیا ہے۔یہیں ان کی مزاحمتی شاعری کے بہت سے حوالے دیئے ہیں جن میں فرازؔ کی معرکتہ الآرا نظم ’’محاصرہ‘‘ بھی شامل ہے جس کی وجہ سے انہیں جلاوطن ہونا پڑا۔جس کے چند بول یوں ہیں۔

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

احمد فراز کی مزاحمتی شاعری کے چند اور حوالے پیش کرتے ہیں:

شہر والے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریبِ شہر ناپرساں کے پاس

ایک تو خواب لئے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ
ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

ڈاکٹر شیخ اقبال اپنے مضمون ’’احمد فراز آسمانِ غزل کا درخشندہ ستارہ‘‘ میں بھی احمد فراز کی شاعری کی جگمگاتی روشنی سے مزین تحریر میں لکھتے ہیں:

’’غزل نے جانے کتنے شعرا کو خلعتِ شہرت اور قبائے توقیر پہنائی اور جانے کتنے شعراء کے دل ودماغ کی صلاحیتوں سے غزل نے اپنے ناتواں وجود کو وہ صلابت دی جو اُردو اَدب میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔جانے کتنی اصناف شاعری مشہور ومقبول ہوئیں اور پھر دیکھتے دیکھتے ذہن سے محو ہوتی چلی گئیں لیکن غزل نے اپنی قوت اور توانائی برقرار رکھی،غزل نے فراز کو نوازا یا فراز نے غزل کو اس بحث کو فی الحال مؤخر کرتے ہیں‘‘

اس مضمون میں انہوں نے ان کی مشہور زمانہ اس غزل کا بھی حوالہ دیا جو کسی زمانے میں ریڈیو پر بہت مقبول ہوئی اور اب تک ویسی ہی تر وتازہ ہے۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

ایسے میں انہوں نے فراز کی اس شہرہ آفاق غزل کا بھی حوالہ دیا جسے ہم نے واہ کینٹ کے مشاعرے میں ان کی زبانی سننے کا اعزاز حاصل کیا،جہاں ہمیں بھی فراز اور احمد ندیم قاسمی کے

سامنے اپنے اشعار پڑھنے کا موقع ملا۔

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

ڈاکٹر شیخ اقبال اپنے انگریزی مضمون میں بھی احمد فراز کو خوب خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اس سے ان کے انگریزی زبان پہ عبور ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

وہ اپنے مضمون "Ahmed Faraz -A Lover and A Poet" میں رقمطراز ہیں:

"Love and Poetry in Faraz are inseparable.
Both are the offsprings of a thinking mind
and a feeling heart"

ڈاکٹر شیخ اقبال اور ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال کے ناموں کی مماثلت نے بھی ڈاکٹر شیخ اقبال کی تحریروں اور شعروں میں وہ بینائی بھر دی ہے کہ جو لائقِ ستائش ہے شاید اسی وجہ سے انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری اور افکار کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون **"Iqbal's view of struggle in the making of life"** میں لکھتے ہیں:

"Indefatigable endeavours, ceaseless strivings, endless efforts go to the making of the warp and woof of human existence and they, by all means, are the pillars on which the edifice of human existence is erected, and this view point is not only Iqbalian but is endorsed by all scientific and biological evaluations."

جب ڈاکٹر شیخ اقبال کردار نگاری پر آتے ہیں تو اس صنف کا بھی حق ادا کر دیتے ہیں "عجب آزاد مرد ہے" میں شاہد بخاری کی شخصیت کا محبت اور خلوص میں گندھے ہوئے انسان کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا پھر ان کی تحریر کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بلا جھجک ان خدمات اور احسانات کا بھی ذکر کرتے ہیں جو موصوف نے ان کی ذات کے لئے سر انجام دیئے:

اپنے مضمون "ایک دلدار اور غمگسار ہمسفر" میں ریڈیو سے اپنی دلداری کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اسے اپنا غمگسار بھی قرار دیتے ہیں۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"مارکونی کے اس لختِ جگر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جتنے بھی قصیدے پڑھے جائیں تھوڑے ہیں۔ بظاہر ٹی وی نے اس کی جگہ لے لی ہے مگر میرے لئے نہیں بلکہ ان کے لئے جن کا محبوبِ قلب و جاں آواز ہوتی ہے، جو آواز کی دنیا کے باسی ہوتے ہیں، ایسی آواز جس سے خوشبو آتی ہے، ایسی آواز جو تصویریں بناتی ہے، ایسی آواز جو کانوں میں رس گھولتی ہے اور جسم و روح کو توانائی عطا کرتی ہے"

"فطرت کے شاہکار نابغہ روزگار" میں لکھتے ہیں کہ "دنیا کی مہذب اقوام کو کبھی کبھی خیال آیا ہے اور اب تو کچھ زیادہ ہی آنے لگا ہے کہ ایسے نابغۂ روزگار پھولوں اور کلیوں کو ایسی فضا مہیا کی جائے کہ ان کی لطافت، رنگ و بو اور دلکشی میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ اتنا اضافہ ہو کہ پورا ماحول رنگ و نور سے سرشار ہو جائے"

ڈاکٹر شیخ اقبال نے اپنے مضمون "خصوصی تعلیم کا حدود اربعہ" میں کیا حاصل تحریر بات لکھی ہے: آپ خصوصی تعلیم کی بات کرتے ہیں۔ حضور! یہاں تو شاید بہت کم احباب کو معلوم ہو کہ تعلیم کیا ہوتی ہے"

حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شیخ اقبال کو ادب کی مختلف اصناف پر کتنا عبور حاصل ہے

یہ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا بھی ثبوت ہے۔ان کے مضمون ''شکسپئر کے شہرہ آفاق ڈرامے ''میکبتھ'' پر سرسری نظر'' کو دیکھ کر ہمارے جسم میں بھی خوب سرسراہٹ ہوئی وجہ یہ تھی کہ جب ہم گورنمنٹ کالج جھنگ میں زیرِ تعلیم تھے اور وہاں کا شیکسپیئر ڈرامِٹک کلب بہت فعال تھا۔شیکسپیئر کے ڈراموں کے پروفیسر عبدالباری عباسی اردو ترجمہ کیا کرتے تھے اور پروفیسر خلیل اللہ خان ان کو سٹیج پر ڈائریکٹ کیا کرتے تھے۔مہینوں ان ڈراموں کی ریہرسل چلتی تھی۔میکبتھ، اوتھیلو، کنگ لیئر، ہیملٹ جیسے ڈرامے سٹیج ہوئے اور طلبا نے کیا خوب اداکاری کے جوہر دکھائے۔جب نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کالج تشریف لائے تھے تو تب میکبتھ ان کے سامنے سٹیج پر پرفارم کیا گیا اور انہوں نے یہ تاریخی جملے کہے تھے کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں لندن کے کسی تھیٹر میں بیٹھا ہوں۔ہم نے بھی اس میں کوئی چھوٹا موٹا رول ادا کیا تھا۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے اپنے مضمون میں میکبتھ کی کہانی بھی نہایت اختصار لیکن جامع طریقے سے بیان کی ہے اور تین چڑیلوں اور سکاٹ لینڈ کے بادشاہ ڈنکن کے اس قصے کو مختصراً بیان کر کے قاری کے علم میں اضافہ کیا ہے۔

ولیم شیکسپیئر نے ۳۷ ڈرامے اور دو منظوم ڈرامے لکھے تھے ان میں ''کنگ لیئر'' بھی کلاسک ڈرامہ تھا جس پر ڈاکٹر شیخ اقبال نے ''کنگ لیئر۔ایک مطالعہ'' کے عنوان سے سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔دریں اثنا انہوں نے پنجابی میں ولیم شیکسپیئر'' جون ملٹن، ولیم ورڈز ورتھ، کنگ لیئر، پر مضامین لکھ کر پنجابی ادب میں اپنی رلت ڈالی ہے جو پنجابی پڑھنے والوں پہ احسان عظیم سے کم نہیں۔

ڈاکٹر شیخ اقبال کے افسانے ''ٹیلی فون''، احمد بابا، بھول بھلیاں، میرا استاد، کنول، چڑیا، مس ہیملٹ، بات پہنچی تری جوانی تک، وہ ایک جھوٹ سہی اعتبار کتنا تھا، قصہ

ایک شام کا، کون جیتا تیری زلف کے سر ہونے تک، آہ وہ یادیں، ان کے معتبر افسانہ نگار ہونے کی دلیل ہیں۔

جہاں تک ان کے تراجم کا تعلق ہے تو یقین مانیے کہ کسی بھی تحریر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا۔اصل بات یہ ہوتی ہے کہ اصل تحریر کی روح مجروح نہ ہو اور مصنف کا مافی الضمیر بھی فصاحت و بلاغت سے پیش کر دیا جائے۔سو ڈاکٹر شیخ اقبال اپنے ان تراجم میں بھی اپنی تحریر کی چابکدستی کی وجہ سے سرخرو ہوئے ہیں۔

Love is a Fallacy: (Max Shulman) محبت:ایک مفروضہ

Three Days to See :(Helen Keller) بارالٰہ! بینائی کے صرف تین دن

Tell Tale Heart (E.A.Poe) دل چٹی

Araby: (James Joyce) آربی

ان چاروں تراجم سے نہ صرف ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے بلکہ بطور ترجمہ کار ان کی مہارت ثابت ہوتی ہے ہمیں یقین ہے کہ ان کی زندگی کے تمام نمایاں اعزازات میں ایک نئے اعزاز کا خوبصورت اضافہ ہوگا جس کا نام ہے ''فکر و خیال''

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

ڈاکٹر اقبال کے افسانے

پروفیسر ڈاکٹر اقبال ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں، بطور استاد، بطور شاعر، نقاد وہ اپنے آپ کو منوا چکے ہیں ایک دو افسانے ان کے ادبِ لطیف میں بھی شائع ہوئے اس کے بعد کوئی افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ آج اُن کے اکٹھے آٹھ افسانے پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال کے افسانوں میں انسان اور انسانی تعلقات تک رسائی کے لئے سماجی و ثقافتی بندھنوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے، اس حوالے سے ان کا سفر تعلقات کی چھوٹی اکائیوں سے شروع ہو کر بڑی اکائیوں تک دراز ہوتا چلا گیا ہے، یوں سماجی و ثقافتی سطح سے آفاقیت کی طرف گامزن ہو کر انہوں نے سفر کی صحیح سمت کا تعین کیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کا اس سمت میں آگے بڑھتے رہنا ایک جرأت مندانہ اقدام بھی ہے اور عصری شعور کا تقاضہ بھی۔ ان کی تحریروں میں جا بجا اس مضبوط ارادے کا اظہار ملتا ہے۔ علاقائی اقدار کو ویسے بھی در پردہ یا بظاہر آفاقی معیارات سے ہمکنار کرنے کی سعی کرتے رہنا ایک کارِ خیر ہے اور بڑے درجے کا جہاد بھی۔ انہیں اپنے افسانوں کے ذریعے اس طرح کے حوصلے کے اظہار کا بھرپور موقع میسر آیا ہے۔

جن افسانوں کو میں نے پڑھا ہے ان میں ڈاکٹر اقبال نے سماج اور سماجی تعلقات کے حوالے سے بہت سے حساس گوشوں کو صدقِ دل اور سادہ طرزِ بیان سے تحریر کیا ہے۔ ''ٹیلی فون'' میں بتایا گیا ہے کہ دوران گفتگو لڑکی تیمور کی نادیدہ عاشق ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس سے ملتی ہے تو اسے معذور سمجھ کر رد کر دیتی ہے۔

''احمد بابا'' با اصول انسان کا المیہ ہے جسے اس سوسائٹی میں بے اصول ہی ملتے ہیں۔

''بھول بھلیاں'' میں عشق کا سسپنس دکھایا گیا ہے اور

اسد! خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کی کیفیت اس میں دکھلائی گئی ہے۔۔۔

''میرا استاد'' تین frustrated دوستوں کی داستان ہے جن میں انسانیت زندہ ہے۔

'' کنول'' زندگیوں میں زہر گھول دینے والے کا ذکر ہے، جسے روشن خیال شوہر Ignore کر دیتا ہے۔

''چڑیا'' لڑکیوں کی نفسیات سے متعلق افسانہ ہے۔

''مس ہملٹ'' میں بیمرا کے وسوسے رنگ لا کر رہتے ہیں.

''بات پہنچی تیری جوانی تک'' میں ماضی کا سفر خوش اسلوبی سے طے ہوا ہے۔

''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'' میں والدین کی ہٹ دھرمی کی سزا کے بعد ان کا کفارہ قابلِ تحسین ہے۔

شاہد بخاری ایڈووکیٹ (لاہور)

0300-4855148

اُردومضامین

فرازؔ اور مزاحمتی شاعری

اقبالؔ نے شاعر کو دیدۂ بینائے قوم اور غالبؔ نے صریرِ خامہ کو نوائے سروش، بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ ان دونوں عظیم شعراء کی رائے میں شاعر دیدۂ بینا اور دلِ گداختہ رکھتا ہے وہ اشیائے ظاہری کو سرسری طور پر نہیں دیکھتا بلکہ ان کے بطون میں داخل ہو جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر پوری کائنات میں سرایت کر جاتا ہے اور یوں غمِ دوراں غمِ ذات بن جاتا ہے اور غمِ ذات بھی غمِ دوراں کا جزوِ لاینفک نظر آتا ہے۔

ایک غالبؔ اور اقبالؔ پر ہی کیا موقوف، ادبیاتِ عالم کے مطالعے سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ شعراء و ادباء نے ہمیشہ زندگی کو آئینہ دکھایا اور دلوں کے نہاں خانوں میں جھانک کر دیکھا، ریاکاری اور ظاہریت کا پیرہن تار تار کر دیا۔ ہومرؔ ہو کہ ورجلؔ، دانتےؔ ہو کہ موپیاںؔ، ٹالسٹائیؔ ہو کہ حافظؔ و سعدیؔ یا میرؔ و غالبؔ سب نے اپنے اپنے انداز میں زندگی کے درد کو محسوس کیا۔ شاعر کوئی مشین نہیں یا کسی مشین کا پرزہ نہیں کہ اشیائے ظاہری کی محض عکس بندی کرتا رہے بلکہ وہ تو ایک جیتا جاگتا سوچتا اور محسوس کرتا کہیں زیادہ ذی حس اور ذی شعور فرد ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی Ivory Tower میں مقیم نہیں ہوتا، اگر شعراء اور ادباء نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ وہی شعراء اور ادباء زمانے کی دستبرد سے محفوظ و مامون رہ سکے ہیں جنہوں نے زمانے کے درد کو محسوس کیا، اس کے حسن و قبح کی تصویر کشی کی اور نہ صرف تصویر کشی کی بلکہ ایک غیر محسوس اور انتہائی فنکارانہ انداز سے ایک اعلیٰ آدرش اور نقطۂ نظر پیش کیا جس کے توسط سے زندگی کو خوب تر اور خوشحال تر بنایا جا سکتا تھا۔ مانا کہ ادب و فن کوئی واعظانہ اور ناصحانہ عمل نہیں لیکن اگر فن کے تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے کوئی شاعر اور ادیب زندگی کے درد کو محسوس کرتا ہے تو یہ انتہائی فطری عمل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے انگریزی شاعر ولیم ورڈز ورتھ نے شاعر کو ایک ایسا انسان کہا تھا جو دوسرے انسانوں سے کسی طرح مختلف نہیں بلکہ اپنی توانا حسیت کے ساتھ زندگی

پر نظر ڈالتا ہے۔ غالبؔ نے بڑی خوبصورتی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور شاعری کے کردار کی وضاحت کی ہے

نگہم نقب بہ گنجینۂ دل ہا می زد
مژدہ باد اہل ریا کہ ز میداں می رفتم

یوں ادیب و شاعر وہ نقب زن ہے جس سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

چودھویں صدی میں انگریزی شاعر جفرے چوسرؔ نے اپنی شہرہ آفاق نظم Canterbury Tales کے پیش لفظ میں کلیسا کے حکامِ بست و کشاد کا جس طرح پردہ چاک کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ Monk، Friar، Pardoner، کے کردار اس ضمن میں بطورِ مثال پیش کئے جا سکتے ہیں گو شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں معروضی انداز اختیار کیا لیکن اس معروضیت میں بھی اس کی موضوعیت جھانکتی ہے اور اس کے کسی ڈرامے میں بھی شر کو بالآخر کامیابی نہیں ہوتی۔ سترھویں صدی میں ملٹن جیسے شہرہ آفاق شاعر نے کلیسائی حکام پر بھرپور ضرب کاری لگائی۔ نظم دیکھیئے:

What recks it them? What need they? They are sped;
And when they list their lean and flashy songs
Grate on their scrannel pipes of wretched straw,
The hungry sheep look up, and are not fed,
But, swoll'n with wind and the rank mist they draw,
Rot inwardly, and foul contagion spread;
Besides what the grim wolf with privy paw
Daily devours apace, and nothing said,
But that two-handed engine at the door

Stands ready to smite once, and smite no more". ۱؎

اٹھارھویں صدی میں انگریزینڈر پوپ نے کوئن Anne کو بُری طرح ہدفِ تنقید بنایا وہ لکھتا ہے کہ کس طرح ملکہ کا دربار عیش وطرب اور لہو ولعب کا سرچشمہ بن گیا ہے۔

Here Britain's statesmen oft the fall foredoom
Of foreign tyrants and of nymphs at home;
Here thou, great Anna! whom three realms obey,
Dost sometimes counsel take – and sometimes tea.
Hither the heroes and the nymphs resort,
To taste awhile the pleasures of a court; ۲؎

اور روتا تا چلا جاتا ہے کہ کس طرح یہ دربار رقص وسرود کی محفل بن گیا ہے اور کس طرح یہاں زندگی اخلاقی انحطاط کا شکار ہو گئی ہے جہاں سنجیدگی اور متانت ختم ہو چکی ہے اور عیاشی اور عیش پسندی ہی کا دَور دَورہ ہے۔ جوناتھن سوفٹ تو طنز کے ایسے تیر چھوڑتا ہے جو پورے نظامِ زندگی کو گھائل کر دیتے ہیں وہ گویا نشتریت سے کام لیتا ہے اور یہی حال کم وبیش انگریزی کے بہت سے شعراء وادباء کا ہے۔ فارسی ادب میں بھی رودکی سے بہار تک کوئی بھی شاعر ایسا نہیں جس نے اپنے اپنے انداز میں زندگی کو آئینہ نہ دکھایا ہو، اس کے دکھوں کو محسوس نہ کیا ہو، حافظ شیرازی کے چند اشعار ہمارے نقطۂ نظر کو واضح کر سکتے ہیں۔

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ بر گردنِ خر می بینم (۳) ۳؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوتِ می روند آں کارِ دیگری می کنند (۴) ۴؎

حقیقت یہ ہے کہ حق گوئی اور بے باکی اسلامی تہذیب کا طرۂ امتیاز رہی ہے، دار ورسن سے کوئی نہیں ڈرا، نہ کوئی جابر اور آمر ہراساں کر سکا۔ حضرت علیؓ کا قول ہمارے لئے مشعل راہ ہے "میں نے اس وقت اپنے فرائض انجام دیئے جب دوسرے اس راہ میں قدم اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور اس وقت سر اٹھا کر سامنے آیا جب دوسرے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے اس وقت زبان کھولی جب سب گنگ نظر آئے گو میری آواز سب سے دھیمی تھی مگر سبقت و پیش قدمی میں سب سے آگے"۔ ۵؎

جیسا کہ معلوم ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ظالم حاکم کے سامنے لب کشائی کرنا سب سے بڑا جہاد ہے اور شومئ قسمت سے امتِ مسلمہ کو یہ جہاد بہت جلد شروع کرنا پڑا جس کا آغاز شہادتِ حسینؓ سے ہوا۔ غزل نے تو آنکھ ہی شہنشاہی جبریت میں کھولی اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ اورنگزیب کے بعد سلطنتِ مغلیہ کس انداز سے زوال وادبار کا شکار ہوئی۔ ایک طرف حکمرانوں کی مطلق العنانی تھی اور دوسری طرف فرنگیوں کی ریشہ دوانیاں۔ مسلمانانِ برصغیر جس دوہرے عذاب میں مبتلا تھے اس کا اظہار اشاروں اور کنائیوں میں ہمیشہ کیا گیا اور اس کے باعث طرح طرح کے مظالم بھی برداشت کئے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد رقم طراز ہیں: "مزاحمت ہمارے ادب کے خمیر میں رچی بسی ہے کہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی وتہذیبی زوال کا عہد ہے، اٹھارھویں صدی کے آغاز سے اس زوال کی ابتدا ہو گئی تھی اور یہ زوال بنیادی طور پر سیاسی انحطاط کا نتیجہ تھا"۔ ۶؎

اس دورِ انحطاط کے باعث ظلم واستبداد کی نت نئی صورتیں تراشی گئیں لیکن حرفِ حق پر قدغن نہ لگائی جا سکی۔ یہاں مجھے Charles Caleb Colton کا قول یاد آرہا ہے:

"Tyrants have not yet discovered any chains that can fetter the mind". ہے

چنانچہ برصغیر کے شعراء اس دور میں بھی اظہارِ احتجاج تشبیہوں اور علامتوں میں کرتے ہی رہے۔ جعفر زٹلی نے کھل کر لکھا اور مارا گیا۔

چمن خراب کیا، ہو خزاں کا خانہ خراب
نہ گل رہا ہے نہ بلبل ، ہے باغباں تنہا
ایسے ہوا چلی ہے کہ چاروں طرف فساد
جز سایۂ خدا کہیں دارالاماں نہیں
صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ! گلچیں نے یہ کس بلبل کا دل توڑا
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

1857ء کی جنگ کے بعد دہلی کا جو حشر ہوا اس کا اظہار خطوطِ غالب میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ایک قیامتِ صغریٰ تھی جو برپا ہوئی خون کی ندیاں بہیں، عصمتیں لٹیں اور مسلمانوں پہ عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ اس کسمپرسی کی حالت میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے اپنے فہم و ادراک کے مطابق صورتحال پر قابو پانا چاہا۔ اکبرالٰہ آبادی نے طنز و مزاح کے پیرائے میں فرنگی ظلم و استبداد کی دھجیاں اڑائیں اور اہلِ ہند کی سادہ لوحی پر پھبتیاں کسیں، اقبال نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور مغربی تہذیب پر وہ طمانچہ مارا کہ اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا اور سادہ لوح مسلمانوں پر حقیقتِ حال واضح ہونے لگی۔ اقبال کے ولولہ انگیز پیغام ہی کے زیرِ اثر ن۔م راشدؔ، جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی جیسے بے باک شعراء منصۂ شہود پر آئے اور پھر قیامِ پاکستان کے بعد بھی صورتحال کسی طرح نہ سنبھلی۔ جاگیرداروں اور فرنگیوں کی باقیات نے اہلِ پاکستان کو مشقِ ستم بنایا، کبھی جمہوریت کے روپ میں اور کبھی مارشل لاء کی صورت میں۔

فیض احمد فیضؔ، سجاد ظہیرؔ اور حبیب جالبؔ جیسے جیالوں نے نعرۂ حق بلند کیا، اس انداز سے کہ انہوں نے اپنے فن کو فن کے وقار سے محروم نہیں کیا، اس پس منظر میں فراز کی سوچ اور فکر نے جنم لیا اور اپنی تمام تر رومانیت کے باوجود اپنے اہلِ وطن کے درد کو جس شدت سے محسوس کیا وہ تاریخِ ادب میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

احمد فرازؔ کی آواز میں ایک ایسا طلسم دکھائی دیتا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں فی الفور لے لیتا ہے اور اس کی وجہ اس کا خلوص اور صداقتِ اظہار ہے۔ عصری اثرات یقیناً انتہائی اہم ہوتے ہیں لیکن جس ماحول میں فرازؔ نے آنکھ کھولی وہ بھی جوش و جذبے سے لبریز تھا۔ فراز نے پشاور میں خاکسار تحریک کے جواں سالوں کو نعرۂ حق بلند کرتے ہوئے دیکھا تھا، یہ بیلچہ بردار ہمت، سپردگی اور ولولۂ تازہ کا پیکر دکھائی دیتے تھے۔ خود فراز نے بھی اس میں شمولیت اختیار کی اور اس

سے بے حد متاثر ہوا۔

فراز کے ایک دوست فارغ بخاری نے اس کے متحرک اور بے قرار بچپن پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ ''کلاس میں وہ بڑا شریر ہوتا تھا نہ خود کبھی پڑھتا نہ کبھی پڑھنے دیتا، استاد اس کی سیمابی طبیعت سے بہت تنگ تھے کبھی کبھی کہہ اٹھتے کہ اس لونڈے کا کیا کریں'' [8]

اور اس کی بیلچہ برداروں میں شمولیت کا ذکر رضا ہمدانی نے بھی کیا ہے: ان کے مطابق ''جب فراز پشاور میں تھا تو علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک اپنے زوروں پر تھی اور پشاور کے شعراء تحریک سے متعلق ترانے لکھتے تھے، خاکی وردی پہنے بیلچے اٹھائے نوعمر بچے احمد فراز کو بہت اچھے لگتے تھے'' [9]

فراز پر بیلچہ برداروں کے جوش و خروش کا بے پناہ اثر ہوا جس نے بعد میں اس کی شاعری کو بے پناہ متاثر کیا۔ پشاور میں ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں نے بھی اسے بہت متاثر کیا اس کی صوبائی شاخ کے صدر اس کے والد تھے اور خود پشاور شاخ کا جنرل سیکرٹری بنا یوں اس میں ترقی پسندی نے جنم لیا اور اس کا سوچنے کا زاویہ تبدیل ہو گیا پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کا کچھ ایسا غلغلہ ہوا کہ کسی اور کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی چنانچہ فراز اپنے ابتدائی ایام میں خاکسار تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں سے بے پناہ متاثر ہوا مگر یہ تحریکیں اس سے اس کے دل کی گدازی اور روح کی کوملتا چھین نہ سکیں۔

فراز کی اس ذہنی اور دلی کیفیت کو ضمیر جعفری نے نہایت خوبصورتی سے کچھ یوں پیش کیا ہے ''ہم نے اپنے زمانے میں جن دو چار شعراء کو بچشم خود قطرے سے سمندر اور ذرے سے 'راکا پوشی اور 'کے ٹو' وغیرہ بنتے دیکھا، ان میں احمد فراز ایک الگ تمکنت رکھتا ہے۔ بیکن نے فراز جیسے شاعروں ہی کے لئے کہا ہے کہ ان کی خوبصورتی ہی ان کے لئے بہترین سفارشی خط ہوتی ہے۔ فنی موشگافیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ فراز کی شاعری بیک وقت گلاب کا پھول بھی ہے اور آگ کا الاؤ بھی'' ۔ [10]

سید ضمیر جعفری کی یہ رائے فراز کے کلام کا پورا احاطہ کرتی ہے جہاں اس میں میٹھے شیریں اور کومل جذبات ہیں وہاں ایک طوفانِ بلاخیز بھی ہے اور ایک الاؤ بھی ہے۔ دراصل فراز نے اپنے شعور کی آنکھ سے ظلم و استبداد کو بہت قریب سے دیکھا تھا ایوب خان کے مارشل لاء کے تجربے سے بھی وہ گزرا تھا اور اس نے پاکستان کو دولخت ہوتے بھی دیکھا تھا، پھر 1977ء میں اسے قلعہ میں گرفتار کر دیا گیا تھا یہ ابھی جمہوری دور ہی تھا۔ اس سانحہ کا ذکر کشور ناہید نے فراز کے نام ایک خط میں بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ ''کس طرح ملکۂ ترنم نور جہاں کے توسط سے بلیک کوئن کو تیار کیا گیا اور پھر کس طرح فراز کو رہائی ملی اور اگلے ہی سال جب دوسرا مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا فراز نے اپنی معرکۃ الآرا نظم ''محاصرہ'' پڑھی اور پھر انہیں سات سال جلاوطن رہنا پڑا۔ تا دمِ آخر فراز حریت اور انصاف کی تحریکوں میں شامل رہے اور وکیلوں کے جلوس میں بھی شرکت کی تھی جس میں ان کے ساتھ ہر شعبہ حیات سے لوگ شامل تھے اور یہ سب جسٹس افتخار کی بلکہ انصاف کی جنگ لڑ رہے تھے'' [11]

اپنی شاعری کے اس پہلو کے حوالے سے فراز نے آصف فرخی کے ساتھ انٹرویو میں کچھ یوں اظہار خیال کیا تھا ''بے آواز گلی کوچوں میں'' ساری شاعری سیاسی ہے، ''نابینا شہر میں آئینہ'' اس میں ملی جلی ہے اور جلاوطنی کی نظموں میں دونوں طرح کا Shade ہے''۔ [12]

اس انٹرویو میں فراز نے بتایا کہ اس نے طالب علمی کے دور میں پہلی نظم لکھی جس پر انعام بھی ملا وہ کشمیر کے بارے میں تھی جو اس نے زمیندارہ کالج گجرات میں پڑھی تھی۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے ریٹائرڈ جنرل شاہد حامد کی فراز کو سرزنش کا واقعہ بیان کیا ہے، دراصل ایک نعتیہ مشاعرے میں فراز نے ایک نعت پڑھی تھی جو اس کے مجموعے ''نابینا شہر میں آئینہ'' میں موجود ہے، نعت کے اشعار اس کی ذہنی اپج اور افتادِ طبع کے غماز ہیں اور اس کی اندرونی گھٹن کا بھرپور اظہار ہیں۔ چند اشعار دیکھئے۔

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے　　میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ   بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے
ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں   دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے
مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ   جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے
خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے   اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے
ہے تُرش رُو مری باتوں سے صاحبِ منبر   خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے
مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا   میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

لگے ہاتھوں فرازؔ کی معرکۃ الآرا نظم ''محاصرہ'' بھی نذرِ قارئین کرتے ہیں جس نے سیاسی ایوانوں میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا عوام الناس میں اس کی مقبولیت نے بے پناہ اضافہ کیا اور خود انہیں جلاوطن ہونا پڑا۔

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اس کے
وہ برق لہر، بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے

تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کجکلاہ میں ہیں

معززینِ عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں
تم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تمہارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو

وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لئے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اسے ہے سطوتِ شمشیر پہ گھمنڈ بہت
اسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
مرا قلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے
مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کا
جو اپنے چہرے پہ دہرا نقاب رکھتا ہے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا

تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

دراصل آغاز ہی سے فراز میں انقلابی سوچ موجود تھی، اس کے شعری مجموعہ ''تنہا تنہا'' میں ایک نظم ''خیر مقدم'' اس کے احتجاج کا بھرپور اظہار ہے اور اس کی سوچ کی راہ متعین کرتی ہے اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''دردِ آشوب'' جس کے نام ہی سے اس کے فکر کی غمازی ہوتی ہے اس مجموعے میں شامل ایک نظم ''زیرِ لب'' کا ایک بند دیکھئے:

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

اسی طرح اس کی ایک نظم ''غریبِ شہر کے نام'' کے چند اشعار دیکھئے کہ کس طرح وہ طبقاتی ناانصافیوں کے خلاف صف آراء ہونے کو تیار نظر آتا ہے:

غریبِ شہر تری دکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب تری چاہت تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد سکوتِ سخن ادا پہ سلام
دریدہ دل! ترے آہنگِ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ نم پہ نثار

اپنے شعری مجموعہ ''نایافت'' میں بھی وہ جمہوریت نما حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں، اسے ایسا

لگتا ہے کہ روز وشب کا رنگ اور آہنگ پہلے جیسا ہی ہے اور وہ ملول اور دلگیر دکھائی دیتا ہے۔

فرازؔ کے شعری مجموعہ ''جاناں جاناں'' میں بھی احتجاجی رویہ جھلکتا ہے اور رومانی انداز کے باوجود وہ اپنے عہد کی ناانصافیوں کا نوحہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا اور طبقاتی استبداد کے خلاف صف آرا دکھائی دیتا ہے، اس کی نظم ''قلم سرخرو ہے'' کا ایک بند دیکھئے:

قلم سرخرو ہے

قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے جو
ظلم کے موسموں میں
کھلے آسمانوں تلے
اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مَس سے
سکوتِ زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بو ہے
قلم سرخرو ہے

''شب خون'' سکوتِ ڈھاکہ کا مرثیہ ہے شاعر اس المیے پر بہت ملول ہے کہ وطنِ عزیز

لخت لخت ہو گیا ہے، ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔

اپنے شعری مجموعے ''بے آواز گلی کوچوں میں' فرازؔ وطن سے دوری پر ماتم کناں ہے۔ کہ اسے حق گوئی کے باعث اپنی مٹی کو خیر باد کہنا پڑا اور دیارِ غیر میں پناہ لینی پڑی۔

''نابینا شہر میں آئینہ' احتجاج کا ایک اور خوبصورت اسلوب لئے ہوئے ہے، الغرض اس کے کم و بیش تمام شعری مجموعوں میں اس کی بے قرار روح نغمہ سنج دکھائی دیتی ہے، وہ Statusquo سے سخت برہم ہے۔ جس میں ناانصافی بربریت اور عدم مساوات کا چلن ہے اور شاعر یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا، خاموش نہیں رہ سکتا اور جب بولتا ہے تو سخت سزا پاتا ہے لیکن اسے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ ابھی تک ہم نے اس کی چند نظموں کے حوالے سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے، اپنی غزلیات میں بھی اس کا احتجاج اپنی پوری جولانیاں دکھاتا ہے اور فراز اپنی ناپسندیدگی کا فنکارانہ اظہار جس انداز سے کرتا ہے اس نے اسے مزاحمتی ادب میں ایک باوقار مقام عطا کر دیا ہے، سب سے پہلے وہ غزل نذرِ قارئین جو ''مزاحمتی ادب اردو'' کے مولفین نے شامل کی ہے جس سے فرازؔ کے زورِ بیاں، شدتِ احساس، تیکھے لہجے اور پروقار گھن گرج کا اندازہ ہوتا ہے:

وفا کے بھیس میں کوئی رقیب شہر بھی ہے
حذر کہ شہر کا قاتل طبیب شہر بھی ہے
وہی سپاہِ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیب شہر بھی ہے
اِدھر کی آگ اُدھر بھی پہنچ نہ جائے کہیں
ہوا بھی تیز ہے جنگل قریب شہر بھی ہے
اب اس کے ہجر میں روتے ہیں اس کے گھائل بھی
گماں نہ تھا کہ وہ ظالم حبیب شہر بھی ہے

یہ راز نعرۂ منصور ہی سے ہم پہ کھلا
کہ چوبِ منبر مسجد ،صلیبِ شہر بھی ہے
یہی بہت تھا اسیرانِ بے نوا کے لئے
اسی قفس میں کوئی عندلیبِ شہر بھی ہے

اوراب وہ تین اشعار جو"ماہِ نو کےفرازنمبر جنوری۲۰۰۹ء" کےآغاز ہی میں عکسِ تحریر کےعنوان سے درج ہیں:

اک بوند تھی لہو کی سرِ دار تو گری
یہ بھی بہت ہے خوف کی دیوار تو گری
اس مُنحنی بچے کی جراُتِ رندانہ کے نثار
اب کے فقیہہ شہر کی دستار تو گری
کچھ سر بھی کٹ گرے ہیں یہ کہرام تو مچا
یوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار تو گری

فراز کے چودہ کے چودہ شعری مجموعے جہاں محبتوں اورقربتوں کے چمنستان آباد کرتے ہیں وہاں زندگی کی ناہمواریوں اور بےمہریوں کےخارستان بھی موجود ہیں، جہاں صبا وہاں صرصر بھی ہے، بستیاں ہیں اور ریگستان بھی ۔حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر محبتیں کرنے والا شاعر غیض وغضب کا شعری اظہار بھی کرسکتا ہے کبھی محبت کے لئے اس کا دل دھڑکتا ہے تو کبھی زندگی کی تلخیاں اس کے دل کو ریزہ ریزہ کئے دیتی ہیں اور وہ لخت لخت ہو جاتا ہے۔وہ آنسو بہاتا ہے آہیں بھرتا ہےاور کہیں کہیں ماتم کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، بل کھاتی اور رقص کرتی ہوئی ندیوں کے ساتھ ساتھ یہاں دریا ہیں ان میں طغیانیاں اور سیلاب بھی ہیں ۔دراصل فرازؔ نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کوایک ساتھ محسوس کیا ہے۔وہ حسیناؤں کے جھرمٹ میں زندگی کی کلفتوں اور اذیتوں کونظر انداز نہیں کرپاتا ۔کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے کہ ناز و نعمت میں پلا ہوا شاعر جس کی

جھولی میں زندگی نے وہ سب کچھ ڈال دیا جو اس نے چاہا اور جو اس نے نہیں بھی چاہا،اور ایک موقع پر اس نے یہ کہا تھا کہ وہ خوش ہے کہ اسے وہ شہرت ملی جو غالبؔ کو اس کی زندگی میں نہیں ملی تھی۔

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

بایں ہمہ اس کی ذاتی فتوحات اسے زندگی سے نبرد آزما عوام الناس کی اذیتوں سے بےخبر نہیں ہونے دیتیں یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں جگہ جگہ طبقاتی کشمکش کا ذکر ہےاور اسے آزادی مساوات اوراخوت کی روش کو ترک کئے جانے کا سخت افسوس ہےاور وہ اس کا اظہار جگہ جگہ کرتا ہے۔اسے اس کا بھی افسوس ہے کہ اس کے اپنے قبیلہ کے لوگ یعنی ادیب وشاعر ذاتی منفعتوں کی خاطر اپنے قلم کو بیچ چکے ہیں:

شہر والے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریبِ شہر ناپُرساں کے پاس

اور وہ اس تلخ حقیقت سے بھی واقف ہے:

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ
خوش نوایانِ چمن سب ہیں اسیرانِ قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزارِ عنادل ٹھہرا
زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا
تو بھی دل کو لہو کی اک بوند سمجھا ہے فرازؔ
آنکھ گر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا
ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے

ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں
یہی کہا تھا میری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

مندرجہ بالا اشعار میں ایک انقلابی آہنگ نظر آتا ہے لیکن یہ آہنگ کہیں نعرہ نہیں بنتا بلکہ شاعری کی مانوس علامتوں میں پیش کیا گیا ہے یہ وہی انداز ہے جو ہمیں فیض کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن فیض کے کلام میں جس ترفع کا احساس ہوتا ہے وہ فیض ہی کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی منچلے نے فراز کو "فیض میڈ ایزی" کہا تھا گو صورت حال یوں نہیں تاہم فراز نے خود فیض کے اثرات کو قبول کیا ہے اور یہ اثرات ناگزیر بھی تھے تاہم فراز نے ایک ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس کی تفہیم عام قاری کے لئے آسان ہے، چند اور اشعار دیکھئے:

ایک دو خواب لئے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ
ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ
بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

قدرت اللہ شہاب نے بھی کچھ اسی طرح محسوس کیا ہے۔" احمد فراز عوام کا شاعر ہے، وہ ایسے استعاروں میں بات کرتا ہے جو خطابت اور تنگ نظرانہ قوم پرستی سے بالاتر ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی شاعر ہے"[۱۳]

یہاں فراز کی ایک اور قاری سریندر کور کی رائے بھی فراز کی مزاحمتی شاعری کو ایک بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔ "فراز کی زیادہ تر شاعری طبقاتی فرق کے خلاف ہے، وہ ایسے لوگوں سے ملوا کر جو مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان امیروں سے جو انسان کو اشیاء کی طرح استعمال کرتے

ہیں انسان کی آنکھوں پر سے پردے ہٹا دیتا ہے اس کی شاعری کچلے ہوئے عوام کے دل کی آواز ہے۔ فراز ایک ایسا لکھاری ہے جس نے ایک مظلوم و مجبور معاشرے کی ہر برائی دیکھی ہے اور برداشت کی ہے لیکن اس کی روح پھر بھی سلامت رہی ہے"[۱۴]

انہی خیالات کا اظہار فیض کی زبانی سنیئے:۔

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن
تجھے صحراؤں میں گرجا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں پر برسا

دراصل فراز نے اپنی تمام تر خوش بختیوں کے باوجود زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی وہ کہتا ہے۔

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

اس خوش شکل، خوش اندام اور خوش گفتار شخصیت کے چہرے پر سلوٹوں کی بات علامتی ہی سہی لیکن یہ سچ ہے کہ فراز نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کو وظیفۂ حیات بنایا۔ دونوں اس کی شاعری کی روحِ رواں ہیں اس نے دونوں کے پھل چکھے، دونوں نے اس کے گلشنِ حیات کی آبیاری کی، چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی طرح فراز نے بھی بیک وقت زلفِ بتاں کو بھی سنوارا اور کاکلِ گیتی کو بھی، ذات کے غم کو بھی ملحوظِ نظر رکھا اور کائناتی درد کو بھی۔ اس طرح انہوں نے اپنے زمانے سے کہیں زیادہ زندگی پانے کا اہتمام کر دیا تاریخ ادب و شعر کا سینہ ہمیشہ ان کے ذکر سے روشن رہے گا اور ان دونوں کے اشعار پڑھ پڑھ کر جانے کتنے جواں سال اور عمر رسیدہ لطف و حظ اٹھاتے رہیں گے۔

حوالہ جات

1. H.C Beeching, Poetical works of John Milton, Page, 41

2. Alexander Pope, "The Rape of the Lock", Canto.iii, Economic Front, Publications, Lahore

3۔ مولانا قاضی سجاد حسین، مرتب "دیوانِ حافظ"، ص۲۸٦

4۔ ایضاً۔ ص۲۱۱

5۔ ڈاکٹر رشید امجد، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات پاکستان

6۔ ایضاً۔ مضمون "اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت" ص۲۵

7۔ Dr, Laurence J. Peter, " Peter Quotation"Tranny",P.503

8۔ فارغ بخاری، "ماہِ نو۔ احمد فراز نمبر"، ص، ۲۷

9۔ رضا ہمدانی، "ماہِ نو احمد۔ فراز نمبر" ص۔۳۱

10۔ سید ضمیر جعفری، احمد فراز شخصیت اور فن، از محبوب ظفر، آرا، ص، ۱۵۳

11۔ کشور ناہید، "ماہِ نو۔ احمد فراز نمبر"، ص، ۲۳۔۲۴

12۔ آصف فرخی، ماہنامہ ادبِ لطیف، انٹرویو احمد فراز، 2009، ص۱٦

13۔ قدرت اللہ شہاب، احمد فراز شخصیت اور فن، از محبوب ظفر، آرا، ص۔۱۵۵

14۔ سریندر کور۔ ایضاً۔ ص۱۵٦

....

احمد فراز۔۔۔آسمانِ غزل کا درخشندہ ستارہ

"غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے"

غزل نے جانے کتنے شعرا کو خلعتِ شہرت اور قبائے توقیر پہنائی اور جانے کتنے شعراء کے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے غزل نے اپنے ناتواں وجود کو وہ صلابت دی جو اُردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ جانے کتنی اصناف شاعری مشہور و مقبول ہوئیں اور پھر دیکھتے دیکھتے ذہن سے محو ہوتی چلی گئیں لیکن غزل نے اپنی قوت اور توانائی برقرار رکھی، غزل نے فراز کو نوازا یا فراز نے غزل کو اس بحث کو فی الحال مؤخر کرتے ہیں ابھی اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے پچاس سو سال چاہئیں، اس میں کلام نہیں کہ فراز اور غزل کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، مانا کہ فراز نے لازوال نظمیں بھی تحریر کیں، منظوم ڈرامے بھی پیش کئے لیکن اس کا تعلقِ خاطر جو صنفِ غزل سے رہا ہے اس کی ایک اپنی ہی شان ہے۔

فراز کے ایک مداح اور دوست مخمور سعیدی کے مطابق "فراز بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے، وہ اپنی غزلوں کے حوالے سے زیادہ پہچانے گئے اس کی ایک وجہ شاید ان کی شاعری رہی کہ ان کی کچھ غزلیں بعض مشہور گلوکاروں نے اتنے خوبصورت انداز میں گائی ہیں کہ وہ سننے والوں کے حافظے میں گلوکاروں کی بنائی ہوئی دھنوں کے ساتھ محفوظ ہو گئی ہیں"[1]

یہی بات ایک اور نقاد طاہر محمد خان نے بھی کہی ہے کہ "فراز میری نظر میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے، وہ نظم کے مقابلے میں غزل بڑی ہنرمندی سے کہتا ہے وہ دو مصرعوں میں اپنی بات پوری نظم کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے کہہ جاتا ہے، ان مصرعوں کا ابلاغ بھرپور ہوتا ہے اتنا موثر کہ بات دل میں نہ صرف اتر جاتی ہے بلکہ نقش ہو جاتی ہے"[2]

دراصل فراز غزل کا شاعر ہی ہو سکتا تھا اس کے لطیف جذبوں، کومل خیالات، بوقلموں تجربات، محبت کی حرارت اور گرمی کو غزل ہی سنبھال سکتی تھی۔ فراز کے ہاں محبت کو اساسی

اہمیت حاصل ہے۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ ادبیاتِ عالم میں محبت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے کسی کو شاعر بنا دیا، کسی کو ادیب، کوئی موسیقار بنا تو کوئی سنگتراش، کوئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو کسی نے اس محبت کی خلش کو دور کرنے کے لئے جانے کتنے غم، کتنے دکھ اور کتنے آشوب پال لیئے۔

Love is the whole history of a woman's life;

It is only an episode in man's[۳]

مگر ہماری رائے میں مرد ہو یا عورت سب کا خمیر محبت سے تیار ہوا ہے، محبت کے بغیر شاید یہ تمام دنیا بے رنگ اور بے روپ ہوتی اور زندگی کسی حوالے سے بھی رہنے کی جگہ نہ ہوتی، محبت کے تریاق نے جانے زندگی کے کیسے کیسے زہر کو قند میں تبدیل کر دیا۔لیکن احمد فرازؔ زہر آشنا، حشر آفریں اور قیامت خیز محبت کا شاعر نہیں ہے، وہ میرؔ، فیضؔ، ناصرؔ کاظمی اور بہت سے اور شعراء کی طرح محبت کی ہولناکیوں سے دوچار نہیں ہوا۔اس کی زندگی کے سرسری مطالعے سے مترشح ہے کہ وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا۔آغاز ہی سے اسے زندگی کی وہ راحتیں حاصل تھیں جو کم انسانوں کے حصے میں آتی ہیں، سید خاندان سے منسلک ہونے کے باعث اور مشہور و معروف شاعر اور قلم کار باپ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے زندگی نے وہ کچوکے نہیں لگائے جو بہت سوں کا جزو لاینفک ہیں شروع ہی سے وہ ذمہ دار اور باوقار منصبوں پر فائز اور متمکن رہا جن کے باعث اس کی زندگی کو بلا کی تقویت اور فقید المثال حوصلہ ملا اور وہ محبت کی دیوی جو اسے جلا کر خاکستر کر سکتی تھی اس پر مہربان ہو گئی، اسے اپنے چاروں طرف حسن ہی حسن دکھائی دیا، رعنائی ہی رعنائی، پذیرائی ہی پذیرائی، تحسین و آفرین، انعام و اکرام، محبت اور قربتیں اور جانے کیا کیا کچھ۔

خوش قسمت تھا وہ کہ آغازِ جوانی ہی سے خوبرووں میں رچ بس گیا اور حسن کشاں کشاں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ایک نقاد ہرچرن چاولہ کے مطابق "میں نہیں جانتا کہ فراز کا مزاج خود ہی لڑکپن سے عاشقانہ تھا یا شوخ اور چنچل حسیناؤں نے انہیں لڑکپن اور معصومیت کے دور میں ہی

ٹھونک بجا کر اور عشق کی راہوں پر ڈال کر بہت پہلے جوان بنا دیا تھا مگر جب لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ احمد فراز جب شاعری کی گھوڑی پر چڑھتا تو کئی گھوڑیوں ورگی چھوریاں دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگنے لگتیں اور اس بات کا زیادہ تو نہیں، کسی حد تک میں بھی آنکھوں دیکھا گواہ ہوں"[۴]

ہرچرن چاولہ کو یقین ہو یا نہ ہو تاہم فرازؔ کی قریبی ساتھی کشور ناہید کی گواہی کو معتبر سمجھا جانا چاہیے، وہ فراز کو اپنے ایک خط میں رقم طراز ہے۔"مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ اس دور میں کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں آپ کو محبت بھرے خطوط تحریر کیا کرتی تھیں"[۵]

چلیئے کشور ناہید سے بھی زیادہ فرازؔ کے بہت قریبی دوست فارغ بخاری کی زبانی سنئے۔"لڑکیاں سگریٹ کے نئے برانڈز کی طرح اس کے بریف کیس میں سجی رہتی ہیں۔جس برانڈ کو جی چاہا پیکٹ کھول کر سلگا لیا اور چند کش لے کر اسے پھینک کر دوسرے برانڈ کا سگریٹ سلگایا اس اعتبار سے اس نے پاکستانی شعراء میں مجازؔ کی کمی کو پورا کر دیا ہے"[۶]

یہ امر واضح ہو گیا کہ وجوہات کچھ بھی ہوں ہمارے شاعر احمد فراز گویا ہمارے عہد کے یوسف ٹھہرے، بھلا ایسے میں محبت آزار کب تھی ہے اور عشق کی منزل پر کیونکر پہنچ سکتی ہے جہاں مکمل سپردگی، ایثار اور جاں کاہی، درکار ہوتی ہے۔چنانچہ ہمیں محبوب ظفر کی رائے سے اتفاق نہیں کہ "فرازؔ نے اپنی شاعری میں جس عشق کی بات کی وہ سچا اور خالص ہے انہوں نے کبھی اپنے عشق کو جھوٹ کی کھونٹی پر آویزاں نہیں کیا اور اپنی شاعری سے دلوں کو جوڑنے کا کام لیا ہے"۔[۷]

ہماری رائے ہے کہ فرازؔ عشق کی منزل تک پہنچا ہی نہیں تھا وہ صرف آشنائی اور دوستی کی منزل بلکہ آشنائیوں اور دوستیوں کی منزلوں تک ختم کر رہ گیا تھا۔اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنی غزلوں میں آشنائی، دوستی اور محبت کو زندہ و جاوید کر گیا۔اس نے ماورائیت اور عینیت کی بجائے ارضیت اور حقیقت پسندی کو اوڑھنا بچھونا بنایا اور محبت کے ان پہلوؤں پر اپنی شاعری کی اساس رکھی جو عام زندگی میں عام انسانوں کو درپیش ہوتے ہیں۔اس نے محبت کو چیستان نہیں بنایا اور نہ ہی اپنے

اظہار بیان کو غیر ضروری علامت نگاری اور گنجلک اسالیب اظہار سے بوجھل کیا۔ علامتیں وہی استعمال کیں جن سے ہم سب واقف ہیں۔ فرازؔ نے دل کی کہی اور اس کا دل یقیناً حسن کا گرویدہ تھا، محبت چاہتا تھا لیکن ہمارے معاشرتی سیاق و سباق میں محبتیں چند روزہ تجربہ ہوتی ہیں ان کی عمر کوئی طویل نہیں ہوتی، ہاں! وہ عشق میں تبدیل ہو جاتی ہیں، جب زندگی کا حبس بڑھتا ہے، جب سانس لینا عذاب ہو جاتا ہے اور دل کی دھڑکن رکنے لگتی ہے، اگر اس کیفیت سے پہلے ہی کوئی دم ساز مل جائے، کوئی مسیحا از خود آ کر کارِ مسیحائی سرانجام دینے لگے، کوئی غمگسار اور چارہ ساز ہمہ وقت دستیاب ہو، جمالیاتی حس کی تسکین ہوتی رہے، دل بہلتا رہے، آنکھ کی تشنگی بجھتی رہے اور جسم کو آسودگی ملتی رہے تو پھر کچھ ہم سفروں کی یادیں تو ضرور آ سکتی ہیں لیکن وہ یادیں آسیب نہیں بنیں، اس لئے فرازؔ کسی آسیب سے دوچار نہیں ہوا اس کے لئے کوئی یاد روح فرسا نہیں بنی، کسی نے اس کے جسم کو شکست و ریخت سے دوچار نہیں کیا، اسے ہم سفر ملتے رہے، خوبصورت ہم سفر، چاہنے والے ہم سفر اور جب ایسا ہو تو سفر کی کلفتیں، راحتیں بن جاتی ہیں اور ہر قدم منزل نما ہوتا ہے لیکن فراز کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے ان تجربات، واردات اور محسوسات کو اتنی خوبصورتی اور دلآویزی سے پیش کیا ہے کہ ہر قاری جھوم اٹھتا ہے، روح کو وجد آنے لگتا ہے، دل سرخوشی سے سرشار ہو جاتا ہے اور پورا بدن تھرکنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرازؔ کی زندگی کا آغاز ہی حوصلہ افزا اور دل خوش کن نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب ظفر نے فرازؔ کے جس پہلے شعر کی نشاندہی کی ہے وہ محبت میں گندھا ہوا ہے۔

رُک جایئے کہ رات بڑی مختصر سی ہے
سن لیجئے کہ رات بڑی مختصر سی ہے

یوں اس کا سفر محبت جاری ہوتا ہے اور پھر جاری و ساری رہتا ہے، چند اشعار دیکھئے ہمارے نقطۂ نظر کو اور واضح کریں گے:

تیری باتیں ہی سنانے آئے

لوگ بھی دل ہی دکھانے آئے
کیا رُخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی
یہ زخم ہیں ان دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑھی تھی

یہاں زخموں کا ذکر موجود ہے لیکن وہ زخم نہیں جو میرؔ اور فیضؔ جیسے شعرا کا مقدر تھے۔
اس کی غزل جس کا مطلع ہے"

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

نہ جانے کتنے مشاعرے لُوٹے اور جب اسے مہدی حسن نے اپنی خوبصورت آواز دی تو یہ پوری غزل ہی زندہ و تابندہ ہو گئی، شعر پڑھتے جایئے جھومتے جایئے، آپ بھی اس کا لطف اٹھایئے، اپنے دل کی دھڑکنیں سنیئے، اسی غزل کے چند اشعار دیکھئے:

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ
کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ
پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لئے آ
اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لئے آ
اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں

یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لئے آ

چند اشعار اس لئے نذرِ قارئین کئے گئے ہیں کہ بارہا ان اشعار کے سحر میں راقم الحروف گرفتار رہا ہے اور اس نے اپنے سیدھے سادے انداز میں ان اشعار کی ہارمونیم پر ایک دھن بھی تیار کی ہے اور اپنی تنہائیوں کو اسے گا گا کر مشکبار بنایا ہے۔ ان اشعار میں ہجر و فراق کا ذکر تو ہے مگر یہ ہجر او فراق جان لیوا نہیں میٹھے میٹھے درد سے مملو ہے۔

فرازؔ، دلِ انساں کی کیفیات کو جس انداز سے پیش کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے کیونکہ یہ کیفیات اس کے دل پر گزری ہیں اور اس نے یقیناً دوسروں پر گزرتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ اس کا مندرجہ ذیل شعر جانے کس کس کے دل کی دھڑکن بنا رہا ہے اور کتنے سن سن کر سر دھنتے رہے ہیں۔

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

فراز دل کی نادانیوں، حماقتوں اور خوش فہمیوں سے خوب خوب واقف ہے وہ جانتا ہے کہ دل کیا کیا چاہتا ہے، کس کس پر مر مٹ جانا چاہتا ہے۔

مدتوں سے یہی عالم نہ توقع، نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے

ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان کے جاتے جاتے
اس کی وہ جانے اسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فرازؔ اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

اس کی آنکھوں میں کبھی غور سے دیکھا ہے فرازؔ
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا
کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

آپ نے دیکھا کہ فرازؔ اپنے تجربات کو اپنے محسوسات کو اور حسنِ جمال کو کس چابکدستی اور کس فنکارانہ کمال سے شعری پیکر عطا کرتا ہے، محبتوں کے چھوٹے چھوٹے تجربے بھی محبت کرنے والوں کے لئے بڑے اہم ہوتے ہیں، محبت لمحوں میں وہ رنگ بھر دیتی ہے کہ وہ شوخ اور دل کش ہو جاتے ہیں، ہر منظر اک نیا منظر دکھائی دیتا ہے، ہر صبح سبدِ گل لئے ہوتی ہے اور ہر شام قندیلِ حسن۔ لیکن کبھی کبھی ہجر و فراق کا تصور چیزوں کی ہیئت بدل دیتا ہے خوشی جامِ زہر نوش کرتی ہے اور کرب و نشاط آغوشِ غم میں پناہ لیتے ہیں لیکن پھر کسی کی یاد زندگی میں اک نئی امید کو جنم دیتی ہے اور سب کچھ جھومنے لگتا ہے:

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ

گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

اور وہ غزل جو ہم نے اس سے اس کی زبانی پہلی اور آخری بار اس مشاعرے میں سنی جس کا اہتمام اس کی وفات سے کوئی چار ماہ پہلے اپریل 2008 میں یونیورسٹی آف سرگودہا نے کیا تھا اور جس کے دوران راقم کی پہلی اور آخری مرتبہ اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی، وہ کمال غزل ہے:

چند شعر دیکھئے۔

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

اس غزل کا ہر شعر حسن و جمال کی بے مثال تصویر پیش کرتا ہے، ہر شعر میں ایک منظر ہے، دلکشا اور روح پرور۔ سہلِ ممتنع کی بہت ہی عمدہ مثال۔

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

فرازؔ نے "سنا ہے" کی تواتر سے ایک حیرت انگیز کیفیت پیدا کی ہے کیونکہ حسن کی لامتناہی پرتیں ہیں ---- ستر پردے بلکہ یہ ستر ہزار پردوں میں پنہاں ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں جہاں جھانکتا ہے قیامت ہی تو برپا کر دیتا ہے۔ فرازؔ یہ غزل بار بار سنایا کرتے تھے اور ناظرین و حاضرین بار بار اسی غزل کا تقاضہ کرتے تھے، اس غزل میں نہ کوئی فلسفہ ہے نہ منطق بلکہ جذبات کا

ایک برجستہ اظہار ہے جو انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کے نزدیک شاعری کی شرط اول ہے، یہ الگ بات کہ یہ برجستگی عمر بھر کے محسوسات اور مشاہدات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

محبت کے ہزار رنگ ہوتے ہیں بلکہ ہزار آہنگ، ہزاروں روپ اور ہزاروں ہی پیکر۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں کبھی جدائی، کبھی وصل، کبھی رنج، کبھی راحت، کبھی یادیں، کبھی باتیں اور جانے کیا کیا کچھ اور پھر فراز میدانِ محبت کا مشاق کھلاڑی تھا اس نے جانے کتنے چوکے اور چھکے لگائے، کتنے گول اسکور کیے، اس کے کیچ بھی پکڑے گئے لیکن وہ گھبرایا نہیں۔ اگلی اننگ خوب کھیلی کبھی کبھی پینلٹی سٹروک تک پہنچا اور پھر ڈی سے باہر بھی ہو گیا لیکن ہمت نہیں ہاری یوں اس نے محبت میں ہاکی اور کرکٹ کی سب ٹیکنیکس استعمال کیں۔ چنانچہ اس کی شاعری میں محبت کے ہفت رنگ ہیں محبت کی قوسِ قزح اپنے سارے رنگ بکھیرتی ہے تبھی تو وہ عوام و خواص کی آنکھوں کا تارا ہے محبوب شاعر ہے اور من پسند شخصیت۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹین ایجرز نے اسے بہت پسند کیا بلکہ بہت ہی پسند کیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء طالبات کا وہ محبوب دل و نظر رہا لیکن شباب اور جوانی کے یہ دن کسے بھولتے ہیں ساری عمر آسیب کی طرح پیچھا کرتے ہیں اور جب پیچھا کرتے ہیں تو فراز کی دلی واردات اور عملی گھاتیں یاد آتی ہیں اور یاد پر کسی سن و سال اور عمر کے دروازے بند نہیں ہوتے، آپ پچاس کی دہائی کے پیٹے میں ہوں یا ساٹھ کے۔ جانے ماضی کے کتنے پھول اور کتنی کلیاں آپ کی شاخِ دل و دماغ پر کھلی ہوتی ہیں۔ یادیں آتی رہتی ہیں کبھی کبھی تو یہ یادیں گھاؤ بن جاتی ہیں سوہانِ روح ٹھہرتی ہیں، سو ایسے میں یادِ رفتہ کو آواز دینا پڑتی ہے ماضی سے معانقہ کرنا پڑتا ہے اگر صورت حال یوں ہے تو پھر فراز ہر عمر اور ہر سن کی دل کی دھڑکن ہوا۔ اب ہم اس کی سید غزل سے کچھ اور پھول اور کلیاں نذرِ قارئین کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ فرازؔ نے کتنے سیدھے سادے، صاف ستھرے اور مترنم انداز میں محبت کے مختلف رنگوں کو شعر بند کیا ہے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

فرازؔ کے دو اشعار جو ہمیں سولہویں صدی کے انگریز شاعر جون ڈن کی یاد دلاتے ہیں جس نے پہلی بار محبت کو صرف روحانی ہی نہیں بلکہ جسمانی تجربہ بھی بتایا تھا کہ وہ محبت ہی نہیں جس میں کوئی پابندی اور قدغن ہو محبت تو ایک دوسرے میں ضم ہو جانے کا نام ہے۔ شعر ہے:

But o! alas , so long so far

Our bodies why do we for bear?

They are ours, though they are not we,

We are the intellegences , they the spheres. ۸

اور اب فرازؔ کے اشعار دیکھئے:

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

محبت کا وجد اور سرمستی جگر مراد آبادی کا طرۂ امتیاز ہے لیکن کہیں کہیں فرازؔ میں بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

وصل اور قرب کی لذت کی تصویر اس سے بہتر کیا ہو گی:

تری قربت کے لمحے پھول جیسے

مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

جب یہ شعر نظر سے گزرتا ہے تو جانے کتنے فرقت کے مارے پھڑک اٹھتے ہوں گے:

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

محبت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ جسے بہت سے شاعروں نے پیش کیا ہے مگر فرازؔ کی جدتِ اظہار ملاحظہ ہو:

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نجانے مانگے

لمحۂ جدائی کا ایک رنگ یہ بھی ہے:

اے فرازؔ اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

فرازؔ کی ایک اور جانکاہ تصویر دیکھئے جس کا تجربہ فراز جیسے خوش بخت کو شاید نہ ہوا ہو۔

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

اور کبھی کبھی عاشق پر یہ صورت بھی گزرتی ہے اور وہ کچھ دل برداشتہ سا ہو جاتا ہے باایں ہمہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

فراز یہ بھی جانتا ہے اور یہ کتنی تلخ حقیقت ہے:

راستے بھر کی رفاقت ہی بہت ہے جانِ من

ورنہ منزل پہ پہنچ کر کون کس کا آشنا

لیکن اس سے کہیں زیادہ حقیقت پر مبنی تجربہ کیا ہو سکتا ہے اور فراز سے بڑھ کر اس تجربے کی کیفیت سے کون زیادہ واقف ہو سکتا ہے:

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

جو شعر زبان زدِ عام و خاص ہوا ہے اور بہت سے کمپیئرز کی زبان پر ہوتا ہے وہ بھی فراز کی جدتِ طبع کا پتا دیتا ہے:

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

ایک اور شعر جو کہ بظاہر ایک عام جذبے کی ترجمانی کرتا ہے لیکن پھر بھی جب فراز کے شعری پیکر میں ڈھلتا ہے تو اس کی شان ہی دوبالا ہو جاتی ہے:

فراز تو نے اسے الجھنوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو

اول اول کی محبت کا جو جادو ہوتا ہے وہ سر چڑھ کے بولتا ہے فراز کہتا ہے:

اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پئے بھی تیرا چہرہ تھا گلستاں جاناں

فراز نے محبت کا کوئی پہلو بھی تو نظر انداز نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ وہ محبت کرنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا یہی نہیں کہ یہ تجربات اس پر بیتے بلکہ یہ بھی کہ اس کی نفسیاتی سوجھ بوجھ نے اسے محبت کے مختلف رنگوں سے آشنا کیا وہ رنگ جو محبت کرنے والوں کو بڑے عزیز ہیں جن پر وہ جان چھڑکتے ہیں، راقم الحروف کو حال ہی میں اس کے شعری مجموعوں "جاناں جاناں"، "درد آشوب" اور "نابینا شہر میں آئینہ" پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے گویا میں نے کم و بیش سارے فراز کو ایک

بار پھر پڑھ لیا ہے، ہر شعر پر داد دینے کو جی چاہتا ہے اور بہت سے اشعار پر دل کے تار بج اٹھتے ہیں اگر یہ کیفیت راقم پر گزرتی ہے تو ان پر کیا کیفیت گزرتی ہوگی جو ابھی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں اور شہر محبت کے باسی ہیں۔ شیکسپیئر نے اپنی کامیڈیز میں محبت کے کم و بیش ہر پہلو کو پیش کیا ہے اور اس کے کردار محبت کے ہر تجربے سے گزرتے ہیں۔

اسی طرح فراز کے قاری بھی فراز کے کلام سے محبت کے وہ جام نوش کرتے ہیں جو ان میں نئی زندگی بھر دیتے ہیں جیسا کہ پہلے کہا گیا یہ سچ ہے کہ محبت کا دل ہلا دینے والا اور جھنجھوڑ دینے والا جذبہ فراز کے ہاں کم ہی ملتا ہے لیکن یہ سب کچھ ہی تو محبت نہیں، محبت کی شگفتگی، تازگی اور ہلکی ہلکی کسک، میٹھا میٹھا غم، ہجر کی لذت، وصال کی راحت، باہمی نوک جھونک اور اس طرح کی بہت ساری کیفیات بھی بے پناہ دلکشی اور جاذبیت رکھتی ہیں۔ اشعار کی بھرمار طولِ کلام کا باعث بن سکتی ہے لیکن یہ اشعار فراز کے ہیں جنہیں جتنی بار پڑھیئے ہمارے اپنے دلوں کی دھڑکن محسوس ہوتے ہیں۔ چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

ے ہر نیا عشق نیا ذائقہ رکھتا ہے فراز
آج کل پھر تری غزلوں کی ادا اور گی

ے اپنی بانہوں میں سمٹ آئی تھی وہ قوس قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگڑائی کی

ے یہ خواب ہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دھند ہے بادل ہے کہ سایہ ہے کہ تم ہو

ے وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

ے شعلہ تھا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو
میں کب کا جا چکا ہوں صدائیں مجھے نہ دو

؎ اس قدر مسلسل تھیں شدتیں جدائی کی
آج پہلی بار اس سے میں نے بے وفائی کی

؎ شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

؎ گفتۂ یار پہ فرازؔ کس طرح حرف گیر ہوں
ہم نے بھی اس سے بارہا جھوٹ ضرورتاً کہے

؎ ایک لمحے کے لئے صدیوں کا خوں ہو جائے گا
ایک خواہش کے لئے عمریں گنوا دی جائیں گی

؎ دل کس کے لئے کراہتا ہے
وہ یار تو اب بیاہتا ہے

؎ یہ ظلم دیکھ کہ تو جانِ شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرمِ سخن

؎ بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جدا ہو جانا

؎ زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

مندرجہ بالا اشعار فرازؔ کی نوبہ نو محبتوں اور رنگا رنگ چاہتوں کے نمائندہ اشعار ہیں جن سے ان کی پوری حیاتِ محبت کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کسی خاتون نے خواتین کی ایک تقریب میں فرازؔ سے کہا آج آپ خواتین کے بارے میں کچھ سنائیں انہوں نے کہا میں نے ہمیشہ خواتین کے لئے ہی لکھا ہے۔ یہ تو ایک مبالغہ ہوا کیونکہ فرازؔ کی غزل میں حب وطن، حب آزادی اور حب انسانیت جیسے موضوعات جگہ جگہ موجود ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کی بیشتر غزلیں خواتین ہی

سے متعلق ہیں، ویسے رام بابو سکسینہ نے غزل کا مطلب ہی عورتوں سے باتیں کرنا بتایا ہے اور فرازؔ نے خوب خوب باتیں کی ہیں۔ راقم نے اس مضمون کا ذیلی عنوان "غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے" قائم کیا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

"کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے"

حقیقت یہ ہے کہ فرازؔ نے غزل کے پردے میں اپنی محبوباؤں سے خوب خوب گفتگو کی ہے اور کچھ ایسے خوبصورت انداز سے کہ یہ گفتگو ہزاروں قارئین کے لئے ان کے دلوں کی دھڑکنیں بن گئی ہے، اس نے نظم میں بھی خواتین کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کا اصل میدان غزل ہی ہے جہاں وہ اپنے دل کی بات خوب خوب کہہ سکتا ہے تاہم اس گفتگو کا اختتام فرازؔ کی ایک نظم "یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں" جو اس کے شعری مجموعہ "جاناں جاناں" کے آغاز ہی میں درج ہے سے کیا جا رہا ہے:

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں

اداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں

جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

☆☆☆

حوالہ جات

1۔ مخمور سعیدی، مضمون ''احمد فراز کچھ باتیں، کچھ یادیں، ماہنامہ تخلیق لاہور، شمارہ فروری 2009ص، 112

2۔ طاہر محمد خان، مضمون ''احمد فراز کا سماجی رویہ اور مزاحمتی شاعری''، ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر 2008ء ص، 5

3- Bergen Evans. Dictionary of Quotations, Avenel Books NewYork. Page 410

4۔ برج ن چاولہ، ''احمد فراز شخصیت اور فن'' مصنف، محبوب ظفر، آرا، ص 155، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد

5۔ کشور ناہید، مضمون ''احمد فراز کی تنہا تنہا، جاناں جاناں''، ''ماہنامہ ''ماہِ نو''۔۔احمد فراز نمبر'' جنوری 2009، ص 22

6۔ فارغ بخاری، مضمون 'دشمنِ جاناں' ایضاً۔ص 30

7۔ محبوب ظفر، ''احمد فراز شخصیت اور فن'' مضمون ''احمد فراز کی غزل''، ص 49

8- Love and Devine Poems by John Donne, Publisher Kitab Mahal Urdu Bazaar Lahore.Page.300

☆☆☆

عجب آزاد مرد ہے

۳ مارچ ۲۰۰۲ء کو، میں اپنے روز و شب کے کچھ زندہ کچھ مردہ کچھ افسردہ اور کچھ تابناک خواب سمیٹے سرگودہا سے لاہور کچھ اس طرح منتقل ہوا کہ مجھے اب وہیں سکونت پذیر ہوا ہے، وہیں اپنی علمی ادبی مساعی کو بروئے کار لانا ہے۔ گویا میں نے سوچ سمجھ کر اور غور وخوض کے بعد ایک ہجرت کا فیصلہ کیا تھا تا کہ میرا سفر علم وادب تیز تر ہو سکے۔ میں لاہور پہنچ گیا لاہور میں میرے جانے سے قبل ہی میرے احباب کا ایک اچھا خاصا حلقہ، ماہنامہ ''سفید چھڑی'' کی وساطت سے وہاں موجود تھا اور ویسے بھی کوئی دو اڑھائی سال قبل دھنکر ز فورم فار سوشل اپ لفٹ "(لاہور) کی بنیاد میں نے اور میرے احباب نے رکھ دی تھی اور ٹاؤن شپ (لاہور) میں نابیناؤں کے لئے ایک ادارہ بھی قائم کر دیا تھا۔ میں نے اپنی رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا مکان بھی خرید لیا تھا جس میں اپنی علمی ادبی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی تھیں۔

ایک شام میں ماڈل ٹاؤن لائبریری میں جا پہنچا جہاں مظفر غفار صاحب نے لاہور آرٹ فورم "LEAF" کے نام سے سالہا سال سے ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی جس کے ایک ماہ میں کوئی 8/10 اجلاس ہوا کرتے تھے، اس پروگرام میں عطا الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد بھی مدعو تھے۔ اتفاق سے بہت کم مقررین بروقت پہنچ پائے تھے۔ مظفر غفار صاحب کی نظر مجھ پر بھی پڑ گئی اور انہوں نے مجھے سٹیج پر بلا لیا۔ میں نے اپنی ایک انگریزی کی نظم اور دو اردو کی غزلیں پڑھیں اور سامعین کی فرمائش پر اپنا تعارف بھی کروایا۔ اشفاق نقوی مرحوم بھی وہاں موجود تھے، وہ روزنامہ ''ڈان'' کے ادبی رپورٹر تھے اور مجھے کچھ نہ کچھ پہلے ہی سے جانتے تھے، اجلاس ختم ہو گیا۔ میں اگلے اجلاس میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ میری ملاقات شاہد بخاری سے ہوئی، یاد رہے کہ شاہد بخاری کو سرگودہا میں شاہد شاہ کے نام سے جانا جاتا تھا وہ سرگودہا کے کچہری بازار سے ملحق بلاک نمبر 6 میں

مٹھائی والی دکان کے ساتھ والے گھر میں قیام پذیر تھے جہاں سے سرگودہا کے مقامی ادبا وشعرا کا گزار ہوتا رہتا تھا۔ اگر چہ ان سے اجمالی ملاقاتیں سرگودہا میں بھی ہوتی رہی تھیں اور وہ ایک آدھ بار میری رہائش گاہ پر بھی تشریف لائے تھے۔ لیکن اصل ملاقاتیں میرے والد شیخ اللہ دیا اور ان کے والد سید محمد شاکر شاہ صاحب کی ہوا کرتی تھیں۔ وہ اکثر ملا کرتے تھے، تبادلہ خیال کرتے تھے، ہجرت کے قصے ایک دوسرے کو سناتے تھے کیونکہ دونوں کا تعلق مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال (بھارت) سے تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب بخاری صاحب گورنمنٹ کالج سرگودہا میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے تھے تو ان سے میری کچھ ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر نہایت سرسری سی مگر بخاری صاحب مجھے بتاتے ہیں کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ میں جس سال بخاری صاحب سے ملا وہ 4th year میں تھے میں اسی سال گورنمنٹ کالج سرگودہا میں تعینات ہوا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرے شاگرد پروفیسر اطہر انصاری کے بڑے بھائی طیب صاحب طلبا کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ مجھ سے انگریزی سیکھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی میجر ظاہر شاہ نے مجھ سے Braille سیکھی تھی۔

لیکن اصل ملاقاتیں تو لاہور میں شروع ہوئیں جو اتنی بڑھیں کہ ہم صبح و شام آپس میں ملنے لگے اور اگر نہیں مل پاتے تھے تو ٹیلی فون پر گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ دراصل بخاری صاحب کی صورت میں مجھے ایک ایسا دوست مل گیا تھا، ایک ایسا ساتھی مل گیا تھا جسے سچ مچ دوست اور ساتھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ میری ادبی اور فلاحی سرگرمیوں سے بہت متاثر ہوئے تھے اور پھر لاہور کی کوئی ایسی ادبی محفل نہیں تھی جہاں وہ مجھے لے جانا نہیں چاہتے تھے، جہاں وہ میرا تعارف نہیں کرواتے تھے، وہ اپنے بارے میں بہت کم اور میرے بارے میں احباب کو زیادہ سے زیادہ بتاتے تھے۔ انہیں تو سب ادبِ لطیف اور اخبارِ جہاں کی بدولت جانتے ہی تھے لیکن مجھے ان احباب سے متعارف کرانے میں بخاری صاحب نے جو کردار ادا کیا اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔

ہاں تو ''LEAF'' کے اجلاس میں پہلی بار محترم نقوی صاحب نے مجھے سنا تو انہوں نے میرے بارے میں بخاری صاحب سے دریافت کیا، بخاری صاحب نے سب کچھ بتایا جو وہ جانتے تھے اور لاہور میں میری آمد کا سن کر وہ دوسرے پروگرام میں شریک ہوئے اور پھر اجلاس کے فوراً بعد وہ مجھے نقوی صاحب کی رہائش گاہ پر بھی لے گئے۔ اس وقت سے تا دمِ تحریر میں بخاری صاحب کے ساتھ ہوں بلکہ وہ میرے ساتھ ہیں۔ میں نے کئی بار ان کے بارے کچھ لکھنا چاہا لیکن انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔

بخاری صاحب کی شخصیت پر کچھ لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہو رہا ہے ایک تو اسلئے کہ میں ان کی ممنونیت کے سحر میں گرفتار ہوں اور دوسرا اس لئے کہ ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہتی ہے کہ اسے احاطۂ تحریر میں لانا بہت مشکل ہے، ان کی محبتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ خوش قسمت ہیں کہ انہیں ایسی رفیقۂ حیات ملی اور ایسے بچے ملے جو سچ مچ ان سے انتہائی پیار کرتے ہیں۔ بخاری صاحب کے حوالے سے ایک اور انتہائی اہم بات یہ ہے کہ وہ مرد ادیبوں اور شاعروں میں مقبول تو ہیں ہی لیکن خواتین بھی ان کا بہت احترام کرتی ہیں، خواتین کی شاید ہی کوئی ایسی محفل ہو جس میں بخاری صاحب کو مدعو نہ کیا جاتا ہو، خواتین ان سے ملنے میں ہچکچاتی نہیں۔ میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ ان کے خلوص اور محبت کی وجہ سے ہے، میں نے آج تک ان کے بارے میں کوئی سکینڈل نہ سنا نہ پڑھا حالانکہ اس کے امکانات بہت زیادہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ڈاکٹر شہناز مزمل کی ادب سرائے اور پروفیسر زیبی کے حلقہ اربابِ سخن کے جنرل سیکرٹری رہے ہیں اور میڈم شائستہ کی ان کے رسالے میں معاونت کرتے رہے، میں انہیں بارہا ٹیلی فون کرتا رہا ہوں جب بھی ٹیلی فون ان کی مسز نے اٹھایا تو ان کے لہجے سے کبھی برہمی کا اظہار نہیں ہوا۔ ایسا لگا کہ ان کی بخاری صاحب کے ساتھ بھرپور ذہنی ہم آہنگی ہے اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ بخاری صاحب کہاں اور کس محفل میں ہیں، کس مرد کے ساتھ گئے ہیں یا کس خاتون کی محفل میں ہیں لیکن میں نے ان کے انداز سے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ ان پر بھرپور اعتماد رکھتی ہیں اور انہیں ایک نہایت

عمدہ انسان گردانتی ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ کوئی ضرورت مند مرد ہو یا عورت، جہاں تک بخاری صاحب سے ممکن ہوتا ہے وہ اپنے وسائل کے مطابق بھرپور مدد کرتے ہیں یا کروا دیتے ہیں۔ مجھے اس کے بارے میں جب بھی پتہ چلتا ہے تو انتہائی خوشی ہوتی ہے کہ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" جو دوسروں کا دکھ درد بانٹتے ہیں۔ بخاری صاحب میرے دستِ راست ہیں مجھ سے محبت کرتے ہیں مجھے جگہ جگہ متعارف کراتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ بینائی کی محرومی کے بعد جو کچھ میں کر پایا ہوں اسے دوسروں کے سامنے لایا جانا چاہیے تا کہ تحریک ہو اور رویے سے دیا جلے۔ سماجی حوالوں سے انہوں نے ہر دکھی کی مدد کی ہے۔ وہ ہر ایک کے کام آتے ہیں اور میرے علم میں ایسے لوگ ہیں جن کا حوالہ دینا یہاں مناسب نہیں ہوگا جن کی بخاری صاحب نے دامے درمے سخنے قدمے مدد کی یا کروائی۔

بخاری صاحب کے اپنے ذرائع آمدنی محدود سہی لیکن ان کا دل بہت کشادہ ہے اور اگر دل کشادہ ہو تو اللہ تعالیٰ راہیں نکال دیتا ہے تو پھر اللہ تو نیتوں کو جانتا ہے اور دلوں کے حال سے واقف ہے۔ میں نے لاہور میں نابیناؤں کی بحالی کے لئے تھنکرز فورم فار سوشل اپ لفٹ کی بنیاد رکھی۔ بخاری صاحب کو اس کا جنرل سیکرٹری بنانا چاہا انہوں نے سختی سے منع کر دیا لیکن میں نے اس سے بھی زیادہ سختی سے کہا کہ وہ جنرل سیکرٹری بنیں گے اور انہیں بننا پڑا، مجھے فخر ہے کہ جہاں وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں میری سختی کو بھی قبول کرتے ہیں مجھے معلوم ہے کہ بخاری صاحب کو کیسے منانا ہوتا ہے، کیسے اس حاکم پر حکم چلانا ہوتا ہے اور یہ گُر میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔ یہ گُر خلوص سے مملو ہوتا ہے بخاری صاحب نے نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے لئے جتنی خدمات سرانجام دی ہیں اس سے میں بھی واقف ہوں اور میرے نابینا دوست بھی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

وہ جس شخص سے ملتے ہیں اسے نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے آگاہ کرتے ہیں اور عطیات کی اپیل کرتے ہیں، شاعروں اور ادیبوں کے لئے بھی ان کا دامن دل ہمیشہ کشادہ

رہتا ہے، بخاری صاحب کا ایک بہت بڑا آئیڈیل پہلے پاکستانی اسپرانتو دان علامہ مضطر عباسی (مرحوم) ہیں جن کی وہ اتنی تعریف کرتے ہیں کہ میرا دل بھی کرتا ہے کہ کاش میں بھی ان سے استفادہ کر سکتا۔ بخاری صاحب یونیورسل اسلامی اسپرانتو ایسوسی ایشن کے صدر ہیں اور اس کی ترویج کے لئے کوشاں رہتے ہیں کیونکہ یہ آسان ترین زبان ہر قسم کے تعصب سے پاک ہے۔

ادبی دنیا میں جن احباب سے وہ بہت متاثر ہیں اور جن کے وہ بہت ممنون ہیں ان میں اشفاق نقوی کا نام سرفہرست ہے اشفاق نقوی شاعر اور روزنامہ "ڈان" کے کالم نگار تھے۔ بخاری صاحب کے مطابق انہی کی رہنمائی میں انہوں نے کالم لکھنے شروع کئے اور اب بخاری صاحب اخبارِ جہاں میں باقاعدہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں پر ہفتہ وار کالم رقم کرتے ہیں اور جانے کتنے چھوٹے بڑے اخبارات میں ان کے کالم چھپتے ہیں۔ وہ "ادب لطیف" کی چیف ایڈیٹر صدیقہ بیگم کے بہت ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے انہیں کتابوں پر تبصرے لکھنے کی مہمیز ہوئی اور اب تک وہ کوئی سو سے زائد کتابوں پر تبصرے لکھ چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ادب لطیف سے انہوں نے وہ کچھ سیکھا جو شاید وہ زندگی بھر نہیں سیکھ سکتے تھے۔ میری صدیقہ بیگم سے بھی ملاقاتیں رہی ہیں وہ نہایت پر خلوص اور ہمدرد شخصیت کی مالک ہیں وہ نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بھی ہماری مدد کرتی رہی ہیں۔ ادب لطیف ایک بہت بڑی علمی ادبی حقیقت ہے، ملک کے صفِ اول کے ادیب و شاعر اس جریدہ کے مدیر رہے ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ یہ ادارت میرے دوست اور میرے محسن شاہد بخاری کے پاس بھی رہی ہے۔

ادبی میدان میں ان کی اتنی خدمات ہیں کہ میں بہت کچھ جانتے کے باوجود بہت کم قارئین کی نذر کر پاؤں گا، محترمہ شہناز مزمل کی قائم کردہ ادبی تنظیم "ادب سرائے" کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے شاہد بخاری سے کون واقف نہیں، وہ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک اس کے جنرل سیکرٹری رہے اور اب بھی اس ادبی تنظیم کے ساتھ ان کی تمام ہمدردیاں شامل ہیں۔ آج کل وہ حلقہ اربابِ سخن کے جنرل سیکرٹری ہیں جس کے باقاعدگی سے اجلاس ہوتے ہیں اور پروفیسر

درنجف زیبی اس تنظیم کی بانی اور شاہد بخاری اسکے سیکرٹری ہیں۔ وہ ایک عرصے سے ہفت روزہ "نکھار" میں بھی کالم لکھ رہے ہیں اور مختلف علمی ادبی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اس طرح اور بھی درجنوں جریدے ہیں جن سے بخاری صاحب کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ "دستک مری" کے وہ قانونی مشیر ہیں، لاہور کی ادبی دنیا میں بخاری صاحب کی شخصیت اب جانی پہچانی ہے بلکہ وہ بہت سی علمی ادبی مجالس کی روحِ رواں ہیں۔ لاہور کی علمی ادبی مجالس کی روحِ رواں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اردو دنیا میں بھی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ بخاری صاحب کے نظریات اور خیالات بہت ترقی پسندانہ ہیں۔ وہ بے جا تقلید کے قائل نہیں، وہ اجتہاد کے قائل ہیں وہ فکر کی نئی شمعیں فروزاں کرنا چاہتے ہیں اور عمل کو نئی جہت دینا چاہتے ہیں ان کے بعض نظریات اتنے فکر انگیز ہیں کہ ہم انہیں بچ مچ اکیسویں صدی کا ایک مفکر کہہ سکتے ہیں، مجھے مفکر کا لفظ لکھتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی کیونکہ قرآن کو وہ پوری دنیا کے لئے ہدایت نامہ سمجھتے ہیں میرے ساتھ قرآن اور سیرت نبویؐ کے حوالے سے جس انداز سے وہ گفتگو کرتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ وہ شاید ذہن رسا رکھنے والوں کی سوچ کا حصہ بھی بن جائیں۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں، قرآن مجید کو وہ ترجمے کے ساتھ پڑھنے پر زور دیتے ہیں، ان کی تالیفات "قرآنی اوامر ونواہی" اور تعلیمات قرآنی قارئین کے دلوں میں گھر کر چکی ہیں اور، ان کی مذہبی فکر کی آئینہ دار ہیں، وہ بے جا رسومات کے قائل نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دکھی انسانوں کی مدد ہو بلکہ سکھی انسانوں کو اور سکھ ملے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خواتین میدان عمل میں آئیں اور مشکلات سے دوچار لوگوں کی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں، ان کا خیال ہے کہ سیرت النبیؐ کو صحیح طرح پیش ہی نہیں کیا گیا۔ آپ کی سیرت آپ کا کردار ہمارے تمام مسائل کا حل ہے وہ میری نعت کا یہ شعر اکثر Quote کرتے ہیں کہ

ہر دکھ کا مداوا تیری سیرت تیرا کردار
جب سے انہیں بھولے ہیں پریشان بہت ہیں

ان کی گھریلو زندگی کے حوالے سے بھی مجھے بہت کچھ معلوم ہے، میں جانتا ہوں کہ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ان سے کتنا پیار کرتے ہیں، ان کے ساتھ بخاری صاحب کا اندازِ تکلم جارحانہ ہوتا ہے لیکن ان کے بچے اس میں محبت کو تلاش کر لیتے ہیں، ان کے گھر میں اکثر ادبی محافل ہوتی رہتی ہیں، ادیبوں اور شاعروں کی وہ مہمان نوازی کرتے رہتے ہیں میرے لئے وہ کئی تقریبات اکادمی ادبیات، لاہور کلب، PILAC میں منعقد کرا چکے ہیں۔ اپنے گھر پر یہ سارا اہتمام کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے اس کا مجھے پوری طرح سے احساس ہے اور جس خوش اسلوبی سے اس کا اہتمام ان کی اہلیہ کرتی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کتنی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ چھوٹی موٹی باتیں ہر گھر میں ہوتی ہیں، چھوٹے موٹے اختلافات بھی ہو جاتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ زندگی کا کارواں شاداں وفرحاں رہے اور آگے بڑھتا چلا جائے۔ وہ اپنی دونوں بچیوں کی شادی بذریعہ مسجد فورم کر چکے ہیں اور دونوں بچیاں اپنے گھروں میں خوش ہیں، میری دعا ہے کہ سب کی اولاد اتنی فرمانبردار ہو جتنی کہ شاہد بخاری کی ہے اور سارے باپ اتنے شفیق ہوں جتنے کہ شاہد بخاری۔ اللہ کی مہربانی سے وہ نانا و دادا بھی بن چکے ہیں۔

بخاری صاحب خود کہتے ہیں اور جانے کیوں کہتے ہیں لیکن کچھ کچھ سچ بھی کہتے ہیں" یار مجھے زیادہ بولنا نہیں آتا میں کئی بار وہ کچھ نہیں کہہ پاتا جو کہنا چاہتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ سب کچھ کہہ پاتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ ان کے کہنے کا انداز ان کا اپنا انداز ہے، وہ انداز جو ان کی رگ و پے میں پیوست ہے، جب میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ تھنکرز فورم کے اجلاسوں کی کمپیئرنگ کریں اور لاہور میں ادارہ کی سرپرستی کریں تو میرے بعض اہلکاروں نے کہا "سر ان سے نمٹنا کوئی آسان نہیں یہ تو ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان سے نمٹنا مجھے آتا ہے میں ان کی برہمی میں محبت تلاش کر سکتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ 2004ء سے میں اور شاہد بخاری زندگی کے سفر میں بڑی حد تک پہلو بہ پہلو رواں دواں ہیں۔ جتنی آسانی سے اور اپنی مرضی کے مطابق میں ان سے ٹیلی فون پر گفتگو کر لیتا ہوں وہ کسی اور سے ممکن نہیں۔ بخاری

صاحب کی جتنی طویل گفتگو مجھ سے ہوتی ہے میرا گمان ہے کہ اتنی طویل گفتگو ان کی کسی صنفِ لطیف سے بھی نہ ہوتی ہوگی۔شکر ہے بخاری صاحب مرد ہیں ورنہ ان سے گفتگو کرنا میرے لئے بہت مشکل ہوتا اور میری اہلیہ کبھی برداشت نہ کر سکتی۔وہ خوش قسمت ہیں کہ ان کی اہلیہ انکے دوستوں کی دوست ہیں اور ان کے ساتھیوں کی ساتھی۔

جو کچھ میں نے ابھی تک بخاری صاحب کی شخصیت کے بارے میں قلم بند کیا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو میں قلم زد کرنا چاہتا ہوں۔Flash Back کی طرح جانے کیا کیا میرے ذہن پر منعکس ہوتا ہے۔مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا علمی اور ادبی ذوق کوئی دو چار برس کی بات نہیں، یہ قصہ تو ان کی پوری عمر پر پھیلا ہوا ہے جب وہ بہت چھوٹے سے تھے تو ان کی اماں ان کو نہایت دلپزیر کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔وہ کہتے ہیں کہ ان کہانیوں نے انہیں کہانیوں کا گرویدہ بنا دیا اور اوائل عمری ہی میں انہوں نے اتنی کتابیں پڑھ ڈالیں جو ہم جیسے شاید ابھی تک بھی نہ پڑھ سکے ہوں۔جب وہ سکول کے دنوں کی بات کرتے ہیں، تو وہ اپنے دور کے نہایت ہر دل عزیز اساتذہ کی بات کرتے ہیں۔جن میں صوفی ذبیح اللہ، مولانا الیف اللہ، مولوی وحیہ اور سید شاہد محسن صاحبان جیسے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے انہیں قلم کے فن سے آشنا کیا پھر جب وہ کالج پہنچے تو انہیں پروفیسر خورشید الحسن رضوی صاحب، ممتاز شاہ صاحب، قیوم شاکر صاحب اور صاحبزادہ عبدالرسول صاحب جیسا ساتذہ ملے۔جس محبت اور خلوص سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اساتذہ کی کتنی عزت ہے۔بخاری صاحب کے احباب میں شوکت بلوچ ایڈووکیٹ، پروفیسر مختار حسین ظاہر، حافظ عبدالحمید (بیکری والے)، پروفیسر انیس اعظمی، طیب انصاری جیسے کئی علم و آگہی سے سرشار لوگ شامل ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ اُن دنوں سرگودہا کے ممتاز قانون دان ملک اقبال صاحب علامہ اقبال پر لیکچر دیا کرتے تھے۔پھر وہ یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں انہیں بیرسٹر اعجاز بٹالوی صاحب جیسے مشہورِ زمانہ اساتذہ ملے۔بٹالوی صاحب LLB کے دوسرے سال میں ان کے انچارج ٹوریل گروپ بھی رہے،

جن کی بدولت 1970ء سے ہی ان کا حلقہ اربابِ ذوق میں داخلہ ممکن ہوا۔

بخاری صاحب کا کمال یہ ہے کہ جب وہ اپنے ماضی کی گفتگو کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہے ہوں، سب کچھ ان پر بیت رہا ہو، ان کو اپنا ماضی اس قدر یاد ہے جیسے یہ ان کا حال ہو انہیں ہر گفتگو یاد ہے، ہر جملہ، ہر مصرعہ۔بخاری صاحب کو مطالعے کی چاٹ بچپن ہی سے لگ گئی تھی، میں حیرت زدہ ہوں کہ انہوں نے بیسیوں نہیں سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں اور ان پر بے تکان گفتگو کر سکتے ہیں، ان کی گفتگو میں بلا کی روانی ہے اور بلا کی دل سوزی ہے۔بخاری صاحب جب جی چاہے مصرع سازی بھی کر لیتے ہیں، باقاعدہ شاعری جانے انہوں نے کیوں نہیں کی لیکن وہ جذبوں کی شاعری سے واقف ہیں ان سے گفتگو کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کتنے زندہ دل اور توانا روح ہیں۔وہ بڑے کمال کے جمال پرست بھی ہیں، جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، میں محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں، جو کچھ میں محسوس کرتا ہوں وہ دیکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔میں نے کہا ناوہ بڑے دین دار ہیں مگر ان کے دین نے ان سے دنیا نہیں چھینی بلکہ دنیا ان کی جھولی میں ڈال دی۔

مشہور شاعر اسرار زیدی کے بعد وہ "اخبارِ جہاں" میں لاہور کی ادبی ڈائری تحریر کرتے رہے ہیں یوں لاہور کی ادبی دنیا ان کے وجدان اور فکر کا حصہ بن گئی ہے۔وہ جس قدر ماضی سے محبت کرتے ہیں اس قدر حال کے بھی گرویدہ ہیں، جہاں وہ روح کے نغمے سنتے ہیں وہاں جسم کی شہنائی سے بھی محروم نہیں۔ان کی حسیات بیدار ہیں اور احساسات توانا۔وہ کبھی ماڈل ٹاؤن میں ہوتے ہیں تو کبھی جوہر ٹاؤن میں، کبھی نیلے گنبد کے قریب تو کبھی لاہور کے کسی اور حصے میں۔کبھی پیدل، کبھی موٹر بائیک پر کبھی کار میں تنہا اور کبھی کار میں احباب کے جھرمٹ کے ساتھ۔امجد بٹ صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ انہوں نے کتنوں کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا لیکن کتنے ہیں جنہوں نے ان پر قلم اٹھایا، میرا خیال ہے کہ شاہد بخاری جیسے احباب جریدۂ حیات پر از خود رقم ہو جاتے ہیں، انہیں کسی خامہ فرسائی کی حاجت نہیں ہوتی، وہ شہرت کے پیچھے نہیں دوڑتے، شہرت

خود انہیں گلے لگاتی ہے۔ بخاری صاحب پر بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے یہ ہم سب پر فرض ہے کہ ہم ایسی شخصیات کو نذرِ قارئین کریں جو ہمہ وقت علم و ادب کی خدمت میں اپنی زندگی وقف کئے ہوتے ہیں۔ ضعفِ بینائی کی وجہ سے شاہد بخاری نے ادبی مجالس میں جانا اب موقوف کر رکھا ہے لیکن فارغ پھر بھی نہیں بیٹھے، اپنے گھر کے قریب پارک D بلاک فیصل ٹاؤن میں P.H.A لائبریری کی منظوری حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کے جلد افتتاح کے لئے ہم سب دعا گو ہیں کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق یہ سب ادب دوستوں کی ادبی بیٹھک بھی "پاک ٹی ہاؤس" کی طرح ہوگی۔

☆☆☆☆

ایک دلدار اور غمگسار ہمسفر

زندگی ایک ایسا سفر ہے جس کی مدت کا تعین، کوئی کر سکا ہے اور شاید نہ کوئی کر سکے گا شاید یہ حوصلہ افزا بات بھی ہے کہ ہمیشہ کچھ کرنے اور کچھ کر گزرنے کی خواہش باقی رہتی ہے کیونکہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کب عرصہ حیات ختم ہو جائے یہی بات تو Andrew Marvell نے اپنی نظم "To His Coy Mistress" میں کہی تھی اور اپنی محبوبہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے اور اختتام کی طرف لئے جا رہا ہے، اس لئے اے مری روحِ زندگی ناز و ادا سے کام مت لو اور محبت کے لئے ہاتھ بڑھاؤ، اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں ایک سو سال تمہارے ہونٹوں کی تعریف کرتا رہتا، ایک سو سال تمہارے رخسار کی اور تمہارے ہر عضو کی تعریف میں ایک ایک صدی بتا دیتا کیونکہ وقت کم ہے اس لئے آگے بڑھو، میرا ہاتھ تھام لو، مجھے سہارا دو۔ مانا کہ عرصۂ حیات بہت مختصر ہے، بہت ہی مختصر لیکن اس سفر میں جتنے ہمسفر ہوتے ہیں کچھ چلچلاتی دھوپ میں بھی جینے کا عہد کرتے ہیں لیکن جب پگھلنے لگتے ہیں تو رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

میری زندگی میں بھی مجھے بہت سے ہم سفر ملے، جان سے پیارے، آنکھوں کے تارے اور دل کے سہارے لیکن میں جس ہم سفر کا ذکر کرنے چلا ہوں وہ ہرجائی ثابت نہیں ہوا، دکھ سکھ میں میرے ساتھ رہا میرے آنسو پونچھے، مجھے تسلیاں دیں، مجھے نگر نگر کی سیر کرائی، علم کی دولت سے نوازا، میری تنہائیوں کا ساتھی بنا اور مجھے کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ جی ذرا بوجھیئے تو سہی، یہ ہم سفر کون ہو سکتا ہے؟ جی ہاں یہ ہم سفر ہے "ریڈیو" جس کا ہم 2010ء میں سال منا رہے ہیں اور بجا طور پر منا رہے ہیں۔ کیوں نہ منایا جائے اور ریڈیو جیسی محیر العقول ایجاد کو خراجِ تحسین پیش کیوں نہ کیا جائے۔ مارکونی کے اس لختِ جگر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جتنے بھی قصیدے پڑھے جائیں تھوڑے ہیں۔ بظاہر ٹی وی نے اس کی جگہ لے لی ہے مگر میرے لئے نہیں

بلکہ ان کے لئے جن کا محبوبِ قلب وجاں آواز ہوتی ہے، جو آواز کی دنیا کے باسی ہوتے ہیں، ایسی آواز جس سے خوشبو آتی ہے، ایسی آواز جو تصویریں بناتی ہے، ایسی آواز جو کانوں میں رس گھولتی ہے اور جسم و روح کو توانائی عطا کرتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ سو فیصد نابینا افراد کو ضیافتِ طبع ریڈیو ہی فراہم کرتا ہے لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وطنِ عزیز کا ایک بہت بڑا حصہ بجلی سے محروم ہے اور جہاں بجلی ہے بھی وہاں بھی ہر وقت لوگ بجلی کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں جب روشنی ساتھ چھوڑ جاتی ہے تب ریڈیو اپنی روشنیاں بکھیرتا ہے، ڈرائی سیلز کے ذریعے ریڈیو گانے لگتا ہے، رقص کرنے لگتا ہے، شعور و آگہی بانٹنے لگتا ہے، نگر نگر کی خبریں دینے لگتا ہے، یہی نہیں ہزاروں مسافر اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ریڈیو ہی کے فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ ایک کار پر ہی کیا موقوف، ایک ٹریکٹر پر سوار کسان، آری چلانے والا مزدور اور فیکٹری میں کام کرنے والا محنت کش ریڈیو کے بغیر بے جان اور بے روح نظر آتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کے کام پر جمی ہوتی ہیں اور ریڈیو اس کے کانوں میں رس گھول رہا ہوتا ہے، وٹامنز کا کام کر رہا ہوتا ہے۔ ٹی وی آپ سے آپ کی آنکھیں چھین لیتا ہے مگر ریڈیو جو آپ کا سچا دوست اور وفادار ساتھی ہے ایسا نہیں کرتا۔ آپ کام کرتے جایئے، لکھتے جایئے، پڑھتے جایئے، حساب کے معمے حل کرتے جایئے، عمارتیں بناتے جایئے اور ریڈیو سنتے جایئے۔

اس میں کلام نہیں کہ یہ دور ٹی وی کا دور ہے لیکن ریڈیو کے وہ کارپردازان جو نئی سے نئی خبر تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے، تعصب سے کام نہیں لیتے اور دنیا کو سچ مچ ایک عالمی گاؤں سمجھتے ہیں، ریڈیو کو ٹیلی ویژن کے ہم پلہ اور ہم سر بنا دیتے ہیں، اگر آج کا ریڈیو پاکستان یہی کردار ادا کرنے لگے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے سامعین میں کوئی کمی واقع ہو۔ لیکن وطنِ عزیز میں ریڈیو کے ساتھ سوتیلی اولاد جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ٹرانسمیٹرز پرانے، آلات زنگ آلود اور کارپردازان اپنے مستقبل سے خائف، اقتصادی مشکلات کا شکار، بھلا سوچیئے! ایسے میں میرا وضعدار اور غمگسار ہمسفر کیا کرے، اپنے پیارے شہر سرگودہا میں نہ ریڈیو پاکستان لاہور کی

آواز سنائی دیتی ہے نہ اسلام آباد کی نہ راولپنڈی کی اور نہ ہی کسی اور اسٹیشن کی اور ساتھ ہی وائس آف امریکہ، چائنا ریڈیو، بی بی سی اپنی بلند ترین آواز کے ساتھ ان کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں اپنے پڑوسی ملکوں کے اسٹیشنز تو صاف سنائی دیں اور ہم اپنے ملکی اسٹیشنز کی آوازوں کو ترستے رہیں، یہ تو بھلا ہوا ایف ایم 93 سرگودہا کا جو کوئی چار سال پہلے قائم ہو گیا تھا کہ ہمیں اس کے توسط سے علمی ادبی اور تفریحی پروگرامز سننے کو مل جاتے ہیں اور نیشنل لنک اَپ کے ذریعے قومی سرگرمیوں سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے، مبارکباد کے مستحق ہیں ریڈیو پاکستان سرگودہا کے کارپردازان اور ان کے اسٹیشن ڈائریکٹر خالد اقبال کہ جن کے پاس سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں پھر بھی وہ سرگودہا کے فن و ثقافت کی ترویج میں بھرپور حصہ ادا کر رہے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر بڑے شہر میں ایک طاقتور ٹرانسمیٹر نصب ہوتا کہ ریڈیو To be or not to be کی جانکاہ کیفیت سے نکل سکے۔ اگر وزارتِ اطلاعات کو ریڈیو کی بقاء منظور ہے تو اس کی بقاء کے لئے عملی قدم اٹھانے ہوں گے۔

میں نے اپنے اس وضعدار اور غمگسار ہم سفر کے ساتھ بڑا طویل سفر کیا ہے یہ کوئی 1951ء کی بات ہے کہ میرے والد چار بینڈ زوالا Philips کا ریڈیو خرید لائے جس کی قیمت اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھی اور اس کا حجم موجودہ دور کے ٹیلی ویژن جتنا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی چھ سال کی تھی مجھے یوں لگا کہ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ کیا عمدہ آواز ہوتی تھی، کیا عمدہ Reception کہ آج کے پی ٹی وی کی بھی ایسی Reception نہیں، کہتے ہیں یہ سب کیا دھرا برقی آلات کا ہے مگر یہ برقی آلات ہندوستان اور دیگر ممالک کے ریڈیو اسٹیشنز کی آواز کو ماند کیوں نہیں کرتے۔

بہر کیف کیا دن تھے وہ جب ریڈیو ایک پوری دنیا تھا اور جس سے میں نے اپنے علم کا آغاز کیا۔ بچوں کے پروگرامز سے وہ کچھ سیکھا جو سرمایۂ حیات بنا اور پھر آہستہ آہستہ ریڈیو میری زندگی کا حصہ ہی تو بن گیا تھا۔ پندرہ روزہ مشاعرے گویا علم و ادب کی دنیا ہوتے تھے، بڑے بڑے

قد آور اور ممتاز شعرا اپنا کلام پیش کرتے تھے اور ریڈیو سے منسلک تھے۔ کون سا بڑا شاعر تھا جس کی آواز ریڈیو سے سنائی نہیں دیتی تھی، کونسا بڑا ادیب تھا جو ریڈیو پر اپنی تخلیقات پیش نہیں کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ گھر بیٹھے علم و ادب کے ان دیو قامت ارباب علم و دانش سے معانقہ ہو جاتا تھا ان کے اشعار نے ان کے کلام نے مجھ میں شعر گوئی کی تحریک پیدا کی، شاعری سے بے پناہ محبت پیدا ہو گئی۔ ریڈیو پر جو ڈرامے پیش ہوتے تھے ان کا تو کہنا ہی کیا! وہ عجیب و غریب دنیاؤں کے در دلوں پر وا کر دیتے تھے، سالانہ جشنِ تمثیل خاصے کی چیز ہوتی تھی۔ دیہاتی بھائیوں کے لئے پروگرام خواتین کیلئے پروگرام، بچوں کی دنیا، ہندوستانی پاکستانی نغمے اور جانے کیا کیا تھا جو ریڈیو کے وسیلے سے ہم تک پہنچا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ٹی وی کی آمد سے کچھ محدود ہو گیا لیکن اس کے باوجود میرا اور پاکستان کے کروڑوں سامعین کا تعلق ریڈیو سے منقطع نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ ریڈیو پاکستان کا سال منانے کا خیال ہی مستحسن ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ادارے کی حالتِ زار پر نگاہِ کرم اٹھے اور عملی اقدام اٹھائے جائیں۔ ریڈیو پاکستان کے کارپردازان کی خستہ حالی پر رحم کیا جائے اور ان میں ایک ایسا جذبہ اور جوش پیدا ہو کہ وہ ریڈیو پاکستان کو ایک طاقتور میڈیم بنا کر دم لیں اور اس کی تیزی سے ختم ہونے والی ساکھ کو بحال کرنے کی ہر ممکن سعی کریں۔

ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر محترم مرتضیٰ سولنگی کی مساعی قابلِ تعریف ہیں انہوں نے بہت سے ایسے سلسلے شروع کئے ہیں جس سے قومی یکجہتی اور ہم آہنگی بڑھتی چلی جائے گی۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کے احیاء کی بھی بھرپور کوشش کی ہے اور ماضی کو حال سے متصل کر دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پورے ادارے کو مثالی ادارہ بنایا جائے۔ زیڈ اے بخاری جیسے براڈ کاسٹر کی خدمات کو کون نظر انداز کر سکتا ہے، وہ زبان و بیان کی ادائیگی اور پاکیزگی پر اس قدر زور دیتے تھے کہ ریڈیو سے سنا ہوا ہر لفظ اپنی ادائیگی کے اعتبار سے مستند سمجھا جاتا تھا ریڈیو پاکستان سے اپنے فرائض کو کچھ اس طرح سرانجام دیتے تھے جیسے اپنے کوئی مشنری جذبہ رکھنے والا فرد سرانجام دیتا ہے ان کے لئے ان کا کام پیشہ وارانہ تھا بلکہ ان کے دل و دماغ کی پوری صلاحیتیں اس میں

استعمال ہوتی تھیں آج ٹی وی کو جو کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں اس کی وجہ بھی ریڈیو پاکستان کے وہ فن کار اور کارکنان ہیں جنہوں نے ٹی وی کو موجودہ کامیابیاں عطا کی ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ اب بھی وطنِ عزیز میں ایسے گوشے موجود ہیں جہاں صرف اور صرف ریڈیو ہی سنا جاتا ہے کیونکہ وہاں بجلی ہے ہی نہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ جہاں بجلی دستیاب بھی ہے وہاں بھی نہ ہونے کے برابر ہے دیہات میں بھی اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے اور شہروں میں آٹھ دس گھنٹے روزانہ غائب رہتی ہے ایسے میں دنیا سے تعلق کا واحد ذریعہ ریڈیو ہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ بجلی کے بحران پر قابو پا لیا جائے گا اور ایسا انشاءاللہ ہوگا بھی لیکن اس کے باوجود ریڈیو کی اپنی اہمیت ہے۔ ریڈیو کی آمد نے اخبار کی ہر دلعزیزی کو کم نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر اخبارات اپنی پولیسیز میں آزاد ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اخبارات کی کامیابی کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ریڈیو پاکستان دنیا کے مشہور براڈ کاسٹنگ سنٹر کی طرح مشنری سپرٹ سے کام کرنے لگے اور یہ بات ذہن سے نکال دی جائے کہ ٹی وی کے ہوتے ہوئے ریڈیو کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ریڈیو پاکستان اپنی بقاء کی جنگ جیت سکتا ہے عوام الناس کو معلومات چاہئیں اور تفریحِ طبع بھی اگر یہ فرائض ریڈیو تن دہی سے سرانجام دینے لگے تو اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے اور چونکہ ٹی وی چینلز بڑے مراکز میں موجود ہیں چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ریڈیو کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ جیسے ریڈیو کو غیر اہم ادارہ تصور کر لیا گیا ہو۔ ریڈیو غیر اہم نہیں ہو سکتا کوئی مفید ادارہ مفید کام سرانجام دیتا رہے تو اس کی اہمیت کسی صورت کم نہیں ہو سکتی لیکن لگتا یوں ہے کہ وزارتِ اطلاعات و نشریات کو کہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ اب ریڈیو کون سنتا ہے۔ ہم نے واضح کیا ہے کہ صورت حال یوں نہیں ہے ریڈیو کے سامعین میں اگر کمی واقع ہوئی ہے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ اس کی Reception بڑی حد تک ناقص ہے اور ریڈیو کی انتظامیہ کے پاس وہ سہولتیں ہی موجود نہیں کہ وہ علاقائی ثقافت کی نمائندگی کر سکے اور اس کی ترویج کا اہتمام کرے۔ ریڈیو کے سال منانے کا مقصد تبھی پورا ہو سکتا ہے کہ

وزارتِ اطلاعات بلکہ حکومت یہ محسوس کرے کہ ریڈیو سب سے زیادہ ارزاں، آساں اور ہر دلعزیز وسیلۂ اطلاعات ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ریڈیو کا یہ سال ریڈیو کی تاریخ میں ایک اہم سال ہوگا اور ریڈیو کو وہ سہولتیں حاصل ہوں گی جو ترقی یافتہ ممالک میں دستیاب ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

فطرت کے شاہکار نابغۂ روزگار

یقیناً فطرت لالے کی حنا بندی بڑی حد تک خود کر لیتی ہے لیکن ہمارے ماحول میں کچھ ایسی کثافتیں اور رکاوٹیں لالے کی نمو میں یقیناً حائل ہو جاتی ہیں جنہیں نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں ہر شہر اور گاؤں میں تعلیمی اداروں کا ایک جال بچھا ہے، اساتذہ اور معلمین کا ایک لامتناہی سلسلہ موجود ہے لیکن اس امر سے بھی انکار محال ہے کہ کچھ اشخاص قدرت کی طرف سے ایسی صلاحیتیں لے کر آتے ہیں جو ان کے قرب و جوار کو ایک نئی جہت عطا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام کی تقدیر کو عوام نے نہیں بلکہ سر برآوردہ ممتاز اور یگانہ روزگار شخصیات نے بڑی حد تک رقم کیا ہے۔ یہ نابغائے روزگار عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ان قدرت کے شاہکاروں کو ہر قدم پر مزاحمتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ معاشرہ بندھے ٹکے اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔ اس کی اپنی اقدار اپنے رسوم و رواج اپنے عقائد، توہمات اور معتقدات ہوتے ہیں اور بعض اوقات اتنی شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ قدرت کے یہ شاہکار کبھی کبھی بلکہ اکثر اوقات اپنی جولانیٔ طبع دکھائے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، یہ ایسے پھول ہوتے ہیں جو بسا اوقات تو پوری طرح کھلتے ہی نہیں اور اگر کھلنے لگتے ہیں تو وقت کی بادِ سموم انہیں مرجھا کر رکھ دیتی ہے۔

دنیا کی مہذب اقوام کو کبھی کبھی خیال آیا ہے اور اب تو کچھ زیادہ ہی آنے لگا ہے کہ ایسے نابغۂ روزگار پھولوں اور کلیوں کو ایسی فضا مہیا کی جائے کہ ان کی لطافت، رنگ و بو اور دلکشی میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ اتنا اضافہ ہو کہ پورا ماحول رنگ و نور سے سرشار ہو جائے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس صورت حال کا احساس سب سے پہلے اہلِ یونان کو ہوا انہوں نے ایسے نونہالان کے لئے کچھ ایسے پروگرام ترتیب دیئے جن سے ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما ممکن ہو سکتی تھی اور اس طرح یہ ان کے ہونہار نونہالان فطرت کا شاہکار بن کر ہر لحظہ زندگی کو نیا حسن اور نئی جہت دیتے کے

لئے تیار ہو جاتے تھے لیکن اہلِ یونان کی تہذیب آہستہ آہستہ زوال وادبار کا شکار ہو گئی اور ان کے ادارے بھی نیست ونابود ہو گئے پھر صدیاں گہری نیند سو گئیں۔زمانوں کو تنگ نظری اور تعصب نے نگل لیا۔ریگزارِ عرب سے کچھ ٹھنڈی ہوائیں چلیں لیکن پھر وہی خشک سالی اور بنجر پن اقوام کی تقدیر بنا۔

انیسویں بیسویں صدیوں نے نت نئے خواب دیکھے اور ایک خواب یہ تھا کہ جن بچوں کو پسماندہ،معذور،بےکار،گناہوں کی سزا،آسیب زدہ اور مخرب حیات تصور کر کے رد کر دیا گیا ان کی تعلیم وتربیت کے لئے خصوصی اہتمام کیا جائے۔ان بچوں میں وہ بچے شامل تھے جنہیں دیکھنے اور سننے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔جو کسی جسمانی مشکل کا شکار تھے یا ذہنی عارضے سے دوچار تھے وطنِ عزیز میں خصوصی تعلیم کے کارپردازان عام طور پر معذوری کی انہی اقسام سے متعارف ہیں اور انہی بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے کہیں نہ کہیں،کسی نہ کسی صورت میں ادارے قائم ہیں، لیکن انہیں بہت سی دوسری معذوریوں کا یا تو علم ہی نہیں یا پھر ان کی توجہ اس طرف دلائی ہی نہ جا سکی۔ایسے بچوں میں وہ بچے بھی شامل ہیں جو آموزش کے عمل میں مشکلات محسوس کرتے ہیں۔ان بچوں کی ایک اور قسم ان بچوں پر مشتمل ہے جنہیں اظہار وبیان کی دقتیں لاحق ہیں،کچھ بچے ایسے ہیں جو جذباتی اور نفسیاتی مسائل سے دوچار ہیں اور اس طرح کی اور بہت سی اقسام کی جانب بڑے بلیغ اشارے ماہرین کی کتب میں درج ہیں لیکن بچوں کے جس خصوصی گروہ کا ذکر اس مضمون میں کرنا مقصود ہے وہ ہیں Gifted اور Talented Children۔یہ وہ بچے ہیں جن کی طرف توجہ کم سے کم دی گئی ہے اور یہی وہ بچے ہیں جن کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔بعض ناقدین کا خیال ہے کہ جتنی توجہ اوسط ذہانت والے بچوں کی جانب دی جارہی ہے اگر ذہین وفطین بچوں کی جانب اس سے آدھی توجہ بھی دی جانے لگے تو دنیا کی کایا پلٹ سکتی ہے

ہمارے تعلیمی اداروں میں مختلف کلاس رومز میں تدریسی کام سرانجام دیا جاتا ہے اور ہر کلاس روم میں پچاس،ساٹھ بلکہ کہیں کہیں تو سو سے بھی زیادہ طالب علم ہوتے ہیں جنہیں ایک ہی

طرح کا نصاب پڑھایا جاتا ہے۔بس کچھ پیمانے وضع کر لئے گئے ہیں جن سے ہر طالب علم کو ساپقہ پڑتا ہے وہ مجبور ہے کہ اپنی فکر کو،اپنی فطانت وذہانت کو بالائے طاق رکھ کر مروجہ تعلیمی نصاب ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے۔حالانکہ ان طلباء میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہیں قدرت نے بےپناہ نوازا ہوتا ہے،جن کی صلاحیتیں اور خصوصیات پابندیاں قبول نہیں کر سکتیں۔وہ بندھے ٹکے اصولوں اور ضوابط میں رہ کر پیش رفت نہیں کر سکتے،لیکن طوعاً وکرہاً وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جہاں سالانہ نتائج کے وقت اوسط ذہانت کے طلباء سو میں سے سو نمبر بھی لے جاتے ہیں،وہاں ایسے طلباء تینتیس فیصد نمبر بھی نہیں لے پاتے،کیونکہ مجوزہ نصاب ان کی صلاحیتوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا،چنانچہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طلباء تدریسی عمل سے بےنیاز ہو جاتے ہیں تعلیمی اداروں سے بھاگ جاتے ہیں،اتفاقاً ان میں سے کوئی بڑا ادیب بن جاتا ہے،کوئی بڑا شاعر،کوئی عظیم مصلح،لیکن ایسے طلبا کی بہت بڑی تعداد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتی اور دم توڑ دیتی ہے۔

خصوصی تعلیم کے کارپردازان نے گزشتہ صدی میں طلبا کے اس گروہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ان خصوصی بچوں کی تعلیم کا ذکر بڑی شدومد سے امریکی شعبۂ تعلیم نے 1958ء کے بعد کیا جب سویت یونین نے سپٹنک (Sputnik) سیارہ چھوڑا اور امریکیوں کو یہ احساس ہوا کہ اب ہمیں لائق اور فائق لوگوں کی ضرورت ہے اگرچہ 1916ء میں ذہنی آزمائش کے طریقے اختیار کر لئے گئے تھے اور طلباء کی ذہانت کا اندازہ ان ہی امتحانوں کے سکور پر لگایا جانے لگا تھا۔ایک سو تیس کے سکور والے طلبا کو ذہین وفطین تصور کر لیا جاتا تھا لیکن عملی طور پر اس شعبہ کے لئے کوئی قانون وضع نہیں ہوا تھا،یہاں تک کہ 1975ء کے پبلک لا ۱۴۲-۹۴ میں ذہین وفطین بچوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

قانونی صورت حال یقیناً آہستہ آہستہ ذہین وفطین بچوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگی لیکن ضروری یہ ہے کہ ذہین وفطین بچوں کی تعریف کرنے کی کوشش کی جائے۔Talented بچے وہ

تصور ہوتے ہیں جو خصوصی میدانوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں۔ مثلاً موسیقی، فنونِ لطیفہ کھیل کود اور اسی طرح کے دوسرے میدانوں میں اور Gifted طلباء میں وہ طلباء شامل ہیں جن میں ذہنی، تخلیقی اور قائدانہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں دراصل Talent، اور Giftedness میں حدِ فاصل قائم کرنا خاصا دشوار ہے ہماری رائے میں Talent سے مراد عملی ذہانت ہے اشیاء کو فی الفور جانچنے، پرکھنے اور نتائج مرتب کرنے میں Talent یعنی ذہانت اہم کردار ادا کرتی ہے اور Giftedness یعنی عطیہ خداوندی، فطری جوہر اور انفرادی گہرائی اور گیرائی کا تعلق جینک سے بھی ہے اور بنیادی انسانی ساخت سے بھی ایسے طلباء کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ان میں ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں جن سے اعلیٰ کارکردگی ممکن ہو سکتی ہے اور تدریسی اور ذہنی معرکے سر کیے جا سکتے ہیں اور ان کا تعلق اعلیٰ ادراکی اور تفہیمی میدانوں سے ہوتا ہے۔ بہر کیف دونوں صلاحیتیں عطیہ خداوندی ہیں فیضانِ حیات ہیں۔ جس میں سعی اور کاوش کا عمل دخل واجبی سا ہوتا ہے جیسے کسی نے کہا تھا Poets are born not made یعنی یہ کہ شاعر پیدائشی ہوتا ہے، تعلیم و تربیت سے شاعرگری ممکن نہیں۔ یہی بات نابغہ کے بارے میں کہی جاتی ہے اور نابغہ ہی ہر لحظہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کا طالب ہوتا ہے وہ تخلیق کار ہوتا ہے جو نت نئے زمین و آسمان تراشتا ہے اس کی ادائیں دلبرانہ ہوتی ہیں وہ معاشرے کی حدود و قیود سے کبھی سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ کبھی باغی کا روپ دھار لیتا ہے اور کبھی کسی انقلابی کا کبھی شاعر کا اور کبھی فنکار کا۔

شومیِ قسمت سے اس گروہ کی طرف توجہ کم سے کم دی گئی ہے اور وطنِ عزیز میں تو سرے سے اس کا تصور ہی نہیں بلکہ ایسے اشخاص کو بسا اوقات نفرت اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور گردن زدنی قرار دے دیا جاتا ہے، کمرہ جماعت میں معلم اسے فتنہ پرور تصور کرتا ہے اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ کلاس کے نظم و ضبط کو قائم کرنا ایسے بچوں کی وجہ سے ممکن نہیں ایسے بچے اساتذہ کے غیض و غضب کا نشانہ بنتے ہیں، والدین انہیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور پھر یہ ذہین بچے معاشرے میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے

روشن ستاروں اور شگفتہ پھولوں کو سازگار ماحول فراہم کیا جائے اور انہیں پنپنے کا موقع دیا جائے اور ان کے لئے علیحدہ منصوبے تیار کیے جائیں تاکہ ان کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ کیا جا سکے، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایسے درخشندہ اور تابندہ ستاروں کے لیے تازہ زمین و آسمان فراہم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔ ویسے تو اس طرف توجہ جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ ذہانتی امتحانات کے حوالے سے ہوئی اور پھر ذکاوت، فطانت اور ذہانت کا ذکر بڑے احترام سے کیا جانے لگا جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ 1958ء میں سپٹنک سیارے نے امریکہ کو حواس باختہ کر دیا۔ کسی نے کہا "روس تو بازی لئے جا رہا ہے" تو کسی نے جواب دیا "سب کمال ذہانت کا ہے" اور پھر یہ چہ میگوئیاں حکومتی ایوانوں تک بھی پہنچ گئیں اور اس ضمن میں پیش رفت ہونے لگی، اگرچہ پیش رفت سست رفتار رہی، 1972ء میں اور اقدام کیے گئے اور ذہانت و فطانت کی مزید توجیہات کی گئیں اور تصور کیا گیا کہ ایسے بچے اعلیٰ کارناموں کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور پھر ذہین بچوں کے لئے گوں ناگوں پروگرام ترتیب دیے جانے لگے۔ بچوں کی عام ذہنی صلاحیت پر توجہ دی جانے لگی، ان کے ذوق و شوق کو ملحوظِ خاطر رکھا جانے لگا، ان کی تخلیقی اور پیداواری صلاحیتوں پر توجہ دی جانے لگی اور محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو مزید ابھارا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بحث ضرور سر اٹھاتی تھی کہ قابلیت وہبی ہوتی ہے یا اکتسابی، بہر کیف خداداد صلاحیتوں کو اگر سازگار ماحول مل جائے تو خوب خوب پنپتی ہیں اس ضمن میں کوشش کی گئی کہ ایسے بچوں کو ایسا ماحول مہیا کیا جائے جو ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دے اور یہ کوشش بھی کی گئی کہ ان کے تعلیمی تجربات پر کوئی قدغن روا نہ رکھی جائے، بعض اوقات عام طلباء کے ساتھ ہی انہیں غیر معمولی سہولتیں دیے جانے کا اہتمام کیا گیا اور انہیں اپنی سرگرمیوں کے لئے اپنی مرضی کے میدان تفویض کیے گئے مثلاً Home Work کے طور پر یا Class Work کے حوالے سے ہی انہیں ایسے منصوبے دیے گئے جو ان کی صلاحیتوں کو ابھار سکتے تھے اور ایسا بھی ہوا کہ انہیں وقت سے پہلے ہی اعلیٰ جماعتوں میں شریک ہونے کی اجازت ہو گئی کبھی انہیں ڈبل

Promotion دی گئی تو کبھی انہیں کسی اچھے ادارے میں بھیج دیا گیا وہ معمول کے امتحانات اور درجہ بندی کے پابند نہ رہے، کبھی تو ان کا نصاب تعلیم ہی تبدیل کر دیا گیا اور ایسا بھی ہوا کہ ان کی جماعتیں ہی الگ تھلگ کر دی گئیں ذہین و فطین بچوں کے لئے امریکہ میں پہلا سکول ریاست میسی چوسٹس (Massachusetts) میں گو کہ 1901ء میں قائم ہو گیا تھا لیکن اصل توجہ بیسویں صدی کے نصف آخر ہی میں دی گئی۔

دیگر ممالک میں ایسے ادارے ضرور قائم کئے جاتے رہے ہیں جہاں نمبروں کے اعتبار سے زیادہ و لائق طلباء کو داخل کیا جاتا رہا ہے مثلاً بعض اداروں میں درجہ اول حاصل کرنے والوں ہی کو داخلہ دیا جاتا رہا ہے۔ Centres of Excellence یہی کچھ کرتے رہے ہیں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ امتحانی نمبر اصل ذہنی استعداد کے آئینہ دار ہو ہی نہیں سکتے۔ ہمارے امتحانات سوالات کے حوالے سے لاٹری کی طرح ہوتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی طالب علم نے صرف چند سوال رٹ لئے اور وہی امتحانی پرچہ میں شامل ہو گئے، بس پھر اس کے وارے نیارے ہیں ویسے بھی جوابات اس کے اپنے نہیں کسی اور کے تحریر کردہ ہیں یوں کسی کی قابلیت کسی اور کے ہاتھ لگ گئی، ہمارے یہاں پرچہ جات کی Assessment کا جو طریقہ رائج ہے اس سے کم از کم اساتذہ تو واقف ہیں ہی کہ وہ چند منٹوں میں گھنٹوں میں لکھا ہوا پرچہ کسی جادوئی قوت سے پڑھ لیتے ہیں اور یہ جادوئی انداز دراصل بعض اساتذہ کی طرزِ امتحان سے اکتاہٹ کا نتیجہ بھی ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ ہمارا طرزِ امتحان کسی طرح بھی قابلیت کو جانچنے کا ذریعہ نہیں، طلباء کو بنے بنائے نوٹس مل جاتے ہیں انہیں ان کے بہی خواہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ان نوٹس میں سے کون سے حصے امتحانی نقطۂ نظر سے اہم ہیں اور پھر طلباء حرف بہ حرف کمال دیانت کے ساتھ انہیں یاد کر لیتے ہیں اور پرچے میں لکھ آتے ہیں۔ ممتحن کو یہ اجازت نہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ تحریر شدہ جواب طالب علم کی اپنی کاوش ہے یا اس کے استاد یا پھر اس کے استاد کے استاد کی۔ اس انداز کا طرزِ امتحان تخلیقی صلاحیت کی موت ہے۔ باصلاحیت طلباء بہر طور اس انداز

کے امتحان میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں ہمارا معروضی نظام امتحان تو تخلیقی صلاحیتوں کا بہت بڑا قاتل ہے لیکن بدقسمتی سے اسی انداز کو سب سے بہتر انداز تصور کیا جا رہا ہے۔ ہماری رائے میں جماعتوں میں بندھے ٹکے نصاب کی موجودگی تخلیقی صلاحیتوں کے لئے سمِ قاتل ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ طلباء میں تخلیقی جوہر کو پنپنے کا موقع دیا جائے جیسا کہ A لیول اور O لیول کے طلباء کے حوالے سے کچھ احساس ہوتا ہے کہ یہاں انفرادیت کے اظہار کے کچھ مواقع موجود ہیں ہماری رائے میں کسی بھی درجے کے لئے نصاب کی موجودگی ہی تخلیقی ذہن کے لئے سب سے بڑی رُکاوٹ ہے اگر نصاب مقرر کرنا ہی ہو تو مخصوص کتابوں کے بجائے مخصوص استعدادی اہداف کا تعین کیا جانا چاہیے۔

بہر کیف اگر ہم نے مروجہ نظام ہی کو صدیوں کے تجربے کا نچوڑ سمجھ لیا ہے تو ہمیں کم از کم ذہین و فطین طلباء کے لئے کچھ راہیں ضرور نکالنی ہوں گی، ورنہ زندگی کا تخلیقی سفر کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ ہم اہلِ یونان سے راہنمائی لے سکتے ہیں جنہوں نے صدیوں پہلے جوہرِ قابل کی تلاش کو مطمعِ نظر بنایا لیکن ہمارا جمہوری نظام صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تلاش میں کوئی زیادہ ممد و معاون نہیں کیونکہ یہ وہ نظام ہے کہ بقول اقبال۔

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کاری شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانی نمے آید

آپ بندوں کو ضرور گنیں انہیں حقوق ضرور دیں ان کی زندگی کو خوش و خرم ضرور بنائیں مگر یہ بات یاد رکھیں کہ ہر شخص ہر کام کے لئے نہ بنتا ہے، نہ بنایا گیا ہے اور یہ کہ ذہین و فطین قدرت کے شاہکار اور نابغۂ روزگار کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کے لئے قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں جو اسلوب حیات تراشتے ہیں جن

سے بندیوں کے معیار قائم ہوتے ہیں جن کے تخیل نت نئے زمانے تراشتے ہیں جن کی آزادہ روی معاشرہ کے لئے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود بالآخر حیرت انگیز ارتقاء اور انقلاب کا باعث بنتی ہے۔ ہمارے عظیم شعراء، ادباء، موسیقار، فنکار اور قائدین اپنی ذاتی زندگیوں میں کئی حوالوں سے معاشرہ سے حکم لینا قبول نہیں کرتے رہے، معاشروں کے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت رہے لیکن انہی کے دم قدم سے حیات نت نئی صورتیں تراشتی رہی۔ سقراط نے زہر کا پیالہ نوش کر لیا مگر زندگی کے پاؤں کی کچھ بیڑیاں کاٹ دیں، شیکسپیئر، مارلو اور بیکن اپنے دور کے قابلِ فخر اشخاص نہیں تھے لیکن ان کی تحریروں نے برطانوی معاشرے کو نئی قوتیں دیں۔ غالبؔ اور میرؔ قابلِ رشک بود و باش رکھنے والے اشخاص تصور نہیں کئے جاتے تھے لیکن وقت نے انہی کو گلے لگایا بلکہ سر آنکھوں پہ بٹھایا، اس ضمن میں ہر قوم اور ہر معاشرے میں ایسے اشخاص مل جائیں گے جن کا گلا ماحول نے گھونٹنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن وہ بچ نکلے اور پھر انہی کو آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک تصور کیا جانے لگا۔ بات بہت دور نکل گئی، ہماری رائے میں خصوصی تعلیم کے کارپردازان کو ان خصوصی بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ فنڈز مختص کرنے چاہئیں، ادارے قائم کرنے چاہئیں اور ہر بچے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیے، کہ ایسے بچوں کو صرف سازگار ماحول مہیا کرنے سے ہی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے اور ایسے بچوں کی دریافت کسی گوہر آبدار سے کم نہیں، کسی جوئے شیر سے کم اہم نہیں یہ زیست گری کا عمل ہے، یہ کیمیائی ہنر ہے، ان کی تلاش سے ممکن ہے ہم اپنے آپ کو بھی تلاش کر لیں، کہ ہم جانے کہاں کھو گئے ہیں کہ اب کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ زندگی بے کیف، بے مقصد ہو کر رہ گئی ہے صرف اس لئے کہ اس کے اندھیروں کو تابناک کرنے والے مہ و انجم مصنوعی آلودگی کی لپیٹ میں ہیں وہ جنگل کے ان پھولوں کی طرح ہیں جو کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔

☆☆☆

خصوصی تعلیم کا حدود اربعہ

آپ خصوصی تعلیم کی بات کرتے ہیں! حضور یہاں تو شاید بہت کم احباب کو معلوم ہے کہ تعلیم کیا ہوتی ہے؟ ہمارے بہت ہی پڑھے لکھے احباب ڈگریوں کو تعلیم سے مماثل قرار دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وطنِ عزیز میں ڈگری یافتہ ان پڑھوں کی کوئی کمی نہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم سے مراد محض اشیاء کا علم لیا جاتا ہے اور یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ جس نے جتنی زیادہ کتابیں پڑھ لی ہیں، سرٹیفکیٹس اور ڈگریاں حاصل کر لی ہیں اسی قدر وہ زیادہ تعلیم یافتہ ہے، حالانکہ تعلیم ایک مجرد تصور نہیں بلکہ اسلوبِ حیات ہے بالکل جیسے مذہب رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ نظامِ زندگی ہے، یونانی مفکرین نے تو محسوس کیا تھا کہ حصول تعلیم ہر کس و ناکس کا کام نہیں بلکہ یہ تو صرف چند ایک اشخاص کے لئے ضروری ہے جن کا تعلق اونچے خاندان سے ہوتا ہے یا کسی اونچے خاندان سے ان کی کوئی نسبت ہوتی ہے ہمیں اہلِ یونا کے اس خیال سے تو اتفاق نہیں لیکن ہمیں ارسطو کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ تعلیم یافتہ اور ناخواندہ میں وہی فرق ہے جو کسی انسان اور جانور میں ہوتا ہے اور ہمیں Ruskin کی رائے سے بھی اتفاق ہے جس کے نزدیک تعلیم چند حقائق کو جان لینے کا نام نہیں بلکہ رویوں میں مثبت تبدیلی کا نام ہے۔ بہرکیف یہ بحث کسی اور وقت کے لئے اٹھائے رکھتے ہیں اور خصوصی تعلیم کی بات کر لیتے ہیں۔

ہماری رائے میں خصوصی تعلیم کی اصطلاح ہی درست نہیں یہ وہی تعلیم ہوتی ہے جو ہر کوئی حاصل کرتا ہے وہی مواد، وہی حقائق، وہی علم اور جان کاری اور رویوں میں اس طرح تبدیلی کرنے کی خواہش جسے ہم عام زندگی کے لئے ضروری گردانتے ہیں تو پھر آپ اس تعلیم کو جو جسمانی اور ذہنی مشکلات سے دوچار طلباء کو دیتے ہیں، خصوصی کیونکر کہیں گے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے ہم خصوصی تعلیم کہتے ہیں وہ دراصل مروجہ تعلیم سے کسی طور مختلف نہیں ہونی چاہیے اگر کچھ احباب خصوصی تعلیم کہنے پر بضد ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے ویسے بھی ہمارے پاس کوئی ایسی

اصطلاح فی الحال دستیاب نہیں جو اس اصطلاح کا متبادل ہو سکے، ہاں اگر کوئی ہاتھ لگ گئی تو کہیں عرض کر دیں گے یا تحریر کر دیں گے۔

جسے خصوصی تعلیم کہا جاتا ہے دراصل یہ ایک ایسا نظام تعلیم ہے جس میں جسمانی اور ذہنی طور پر مشکلات سے دوچار طلباء کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا ہے یہ ان سہولیات پر مشتمل ہے جو متذکرہ بالا طلباء کے لئے ضروری ہو جاتی ہے مثلاً بصارت نہ رکھنے والے طلباء کے لئے بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے کہ وہ عام کتابوں کو پڑھ سکیں اس لئے ضروری ہوا کہ کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جائے کہ بینائی نہ رکھنے والے طلباء اپنے عام ساتھیوں کی طرح پڑھ لکھ سکیں۔ چنانچہ کچھ یوں ہوا کہ یہ اعزاز ایک فرانسیسی نابینا طالب علم کو ہی حاصل ہوا کہ وہ ایسا طریقہ دریافت کرے جو عام کتابوں کا متبادل ہو سکے، نابیناؤں کا یہ ہیرو لوئی بریل تھا جو پانچ سال کی عمر میں بینائی سے محروم ہو گیا تھا اور پھر اس نے سالہا سال کی کوششوں سے بریل انداز تحریر ایجاد کیا۔ دراصل یہ تحریر نہیں ہوتی بلکہ ابھرے ہوئے Dots ہوتے ہیں جنہیں انگلیوں سے محسوس کیا جا سکتا ہے یہ Dots کل چھ ہوتے ہیں جن کی مختلف ترتیب سے 63 حروف بن سکتے ہیں اور پھر حروف لفظ بناتے ہیں اور لفظ جملے اور پھر کتابیں اور کتابیں ہی کتابیں۔ پڑھتے چلے جایئے نہ روشنی کی ضرورت ہے اور نہ میز اور کرسی کی۔ موسم سرما میں اپنے گرم لحاف میں بیٹھ جایئے اور کسی ناول کسی افسانے اور کسی نظم کا لطف اٹھایئے اپنے نصاب کی کتب پڑھیے اور اگر کوئی بات چھپ کر لکھنی ہو تو لکھتے اور پڑھتے چلے جایئے کسی کو کیا خبر کہ یہ محبت نامہ ہے یا اقرار نامہ۔ خیر چھوڑیئے اب تو بریل بینا احباب بھی سیکھنے لگ گئے ہیں یا کم از کم سیکھنے کا ڈھونگ رچانے لگے ہیں کیونکہ اس ڈھونگ کے بغیر خصوصی شعبہ میں ان کا داخلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں لیکن داخل ہونے والوں کو کون روک سکتا ہے کیونکہ وہی تو پالیسی ساز اور ہر معاملے میں مختار کل ہیں۔ وہ جو چاہیں کہہ دیں ان کے پاس حسن کرشمہ ساز جو ہوا اور حسن جو کرشمے سر انجام دیتا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی بقول شاعر

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

چلئے پھر جوانی سے قیامت کی طرف لوٹتے ہیں یہ بات کوئی بہت پرانی نہیں کہ ذہنی اور جسمانی طور پر مشکلات سے دوچار طلباء کو طلباء ہی نہیں سمجھا جاتا تھا وہ طلباء ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو قسمت کی ستم ظریفی کا شکار متصور ہوتے تھے، آسیب زدہ قرار دے دیئے جاتے تھے یا پھر اپنے بزرگوں کے کسی گناہ کی پاداش یا پھر ایسے معصوم جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں جن کا تعلق عرش والے سے ہوتا ہے اور جن کی جگہ خانقاہ، مندر، چرچ یا مسجد ہوتی ہے جن کے قبضے میں دس بیس نہ سہی ایک دو جن بھوت تو ہوتے ہی ہیں وہ کوہ قاف کی سیر کرا سکتے ہیں بچھڑوں کو ملا سکتے ہیں اور اجڑے ہوؤں کو بسا سکتے ہیں اور کبھی کبھی بسے ہوؤں کو اجاڑ بھی دیتے ہیں، ان کے غیض سے ڈر کر رہنا چاہیے لیکن دانشور یونانی اور اہلِ روما تو کچھ اور ہی سوچتے تھے انہیں مندرجہ بالا خیال نہیں سوجھے تھے وہ ایسے بچوں کو پہاڑوں پر چھوڑ آتے تھے یا دریائے Tiber کے حوالے کر دیتے تھے لیکن ازمنۂ وسطیٰ میں اتنا شعور ضرور آ گیا تھا کہ وہ ایسے بچوں اور بزرگوں کو حسب بالا تصورات کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دے دیتے تھے کیونکہ اس میں ان کی اپنی بھلائی تھی، جو گناہ وہ کریں گے، بخشوا دیں گے جب ان کا جن بھوتوں سے واسطہ پڑے گا تو یہ ان کی مدد کو پہنچ جائیں گے لیکن پھر یوں ہوا کہ سولہویں صدی میں شعور کا سورج طلوع ہوا اور اندھیروں کو زندہ درگور کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ علم و آگہی انسانی سوچ کو متاثر کرنے لگی۔

اگرچہ اسلامی طرز حیات میں ذہنی اور جسمانی مشکلات سے دوچار افراد کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن اُمِ مکتومؓ کو جو تکریم اور عزت ملی اس سے کون واقف نہیں وہ مدینہ کے گورنر بھی رہے لیکن پھر اسلام جیسی زندہ حقیقت افسانہ و افسوں بننے لگی تو معذورین کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا۔ وہ صرف اور صرف مسجدوں کے ہو کر رہ گئے بلکہ انہیں بعض اوقات اس منصب کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا اور ان کی جگہ دانا و بینا حضرات نے لے لی۔ کیونکہ ملازمتوں

کے دروازے ویسے ہی بند ہونے لگے تھے اس لئے جو ہاتھ لگا اسے ہی مقدر سمجھ لیا گیا۔ بہرکیف اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یورپ شعور و آگہی کے نئے دور میں داخل ہوا۔ شعور اور آگہی نے ان تعلیمی متبادلات کا سراغ لگا لیا جن کا جزوی ذکر نابینا افراد کے حوالے سے کیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ بریل نے ابھرے پرنٹ کی جگہ لے لی، تحریری مواد ابھرے ہوئے مواد میں منتقل ہونے لگا سماعت اور گویائی سے محروم بچوں کے لئے اشاروں کی زبان دریافت ہوئی۔ انگلیوں کے مختلف اشاروں سے زبان کی مختلف حرکات سے ایسے بچوں کو آپس میں گفتگو کرنے کا طریقہ سکھا دیا گیا اور ان میں لکھنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جانے لگی وہ عام تحریر کے قابل ہونے لگے اور یوں لکھ کر اپنے دیگر احباب سے گفتگو کرنے لگے۔ اسی طرح جسمانی طور پر مشکلات سے دوچار بچوں کے لئے وہیل چیئر کا استعمال ہونے لگا تاکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے پہنچ سکیں۔ پھر ہاتھ، بازو اور اس طرح کے دوسرے اعضاء کے متبادلات تلاش ہونے لگے گویا زندگی کے معمولات میں اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہونے لگی یا کوئی نقص واقع ہونے لگا تو کوئی نہ کوئی متبادل تلاش کرلیا گیا۔ یوں یہ بچے بے دست و پا اور بے سہارا ہونے سے بچ گئے جدید دور میں ذہنی طور پر معذور بچوں کے لئے بھی تدریسی طریقے دریافت کرلئے گئے ہیں۔ انہیں کھیل کھیل میں پڑھایا جانے لگا موسیقی کے ذریعے تربیت دی جانے لگی، سیر و سیاحت سے سکھایا جانے لگا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بچے جنہیں معذور و مجبور قرار دیا جاتا تھا جدید دور میں پر اعتماد زندگی گزارنے لگے ہیں، جسے ہم خصوصی تعلیم کہتے ہیں اس میں تعلیمی متبادل ذرائع کی دریافت تو اہم ہے ہی لیکن جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ ان کے اساتذہ کی تربیت ہے انہیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ ان کے طلبا میں صلاحیت ہیں ان میں بہت سی ایسی قوتیں ہیں جنہیں بیدار کیا جاسکتا ہے۔ ان میں اعتماد کی شمع روشن ہو سکتی ہے انہیں خود کفیل بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اساتذہ کے ذہن میں اس تصور کو جاگزیں کرانا خاصا دشوار کام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں جب تک معاشرے کی سوچ

میں تبدیلی واقع نہ ہو، اس کا انداز فکر نہ بدلے وہ ایسے بچوں کی صلاحیتوں کا قائل نہ ہو تو ان بچوں کے اساتذہ بھی کم مثبت سوچ کے حامل ہوں گے۔ اس کے لئے ضروری امر یہ بھی ہے کہ خود خصوصی افراد مجتمع ہوں، رول ماڈل کا کردار ادا کریں اپنی زندگیوں کو پر اعتماد بنائیں، اپنے اسلوب حیات کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالیں اور ثابت کریں کہ اگر انہیں ضروری سہولیات مہیا ہو جائیں یا کچھ بھی سہولیات دستیاب ہوں تو اپنے کسی ساتھی سے کسی طرح صلاحیتوں میں کم نہیں لیکن اس حوالے سے یہ امر انتہائی فکر انگیز ہے کہ معاشرہ اپنی گمراہ کن ہمدردی اور مہربانی کے باعث خصوصی افراد کو غیر ضروری سہولیات حاصل کرنے پر مجبور کر دیتا ہے مثلاً اگر آپ ان سے گاڑی میں سفر کرتے وقت ٹکٹ کے بارے میں دریافت نہیں کرتے تو وہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ہوٹل کا مالک انہیں بغیر بل ادا کئے کھانا کھلانے لگے تو آہستہ آہستہ وہ اسے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں، اگر کوئی دوکاندار انہیں رعایتی نرخوں پر اشیاء مہیا کرے تو وہ رعائتوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ غیر ضروری مراعات صلاحیتوں کے لئے سم قاتل ہیں۔ اگر کوئی نابینا طالب علم امتحان دے رہا ہو اور ممتحن اسے غیر قانونی اور غیر ضروری سہولتیں بہم پہنچانے لگے تو انہیں ڈگری تو مل سکتی ہے لیکن ان کی قابلیت اور صلاحیت کا گلا گھٹ جاتا ہے اس لئے خصوصی تعلیم کے نصاب میں اقدام آدمیت کا باب بھی بڑا اہم ہونا چاہیے یعنی یہ کہ مساوی بنیادوں پر زندگی کو استوار کرنے ہی سے خود اعتمادی جنم لیتی ہے۔ آپ ضروری سہولیات ضرور فراہم کریں اگر کسی نابینا کو سڑک عبور کرنے میں کوئی مشکل ہے تو اس کی مدد کریں اگر اس کے ہاتھ میں سفید چھڑی ہے تو اسے ملحوظِ نظر رکھیں اگر کسی نابینا طالب علم کو کتب پڑھ کر سنانی ہوں تو ایسا کرنے میں خوشی محسوس کریں۔ اگر کوئی سماعت سے محروم بچہ آپ سے کچھ لکھ کر پوچھ رہا ہو تو اسے بتائیں، اگر آپ اشاروں کی زبان سیکھ سکتے ہیں تو سیکھیں اگر کوئی ذہنی معذور کسی غلطی کا شکار ہو رہا ہو تو اس پر ہنسنے کے بجائے اسے پیار سے سمجھائیں۔

خصوصی تعلیم سے مراد ایک انداز فکر بھی ہے یعنی یہ انداز فکر کہ ایک صلاحیت چھن جانے

سے دوسری صلاحیتیں لازماً مفقود نہیں ہو جاتیں۔ یقیناً ایک معذوری انسان سے حوصلہ چھین سکتی ہے اور حوصلے کا فقدان تمام صلاحیتوں کو متاثر کر سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کسی دشواری سے دوچار فرد کو ضروری ذرائع مہیا کیئے جائیں اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی دیگر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے، خصوصی تعلیم کسی بند کمرے میں نہیں دی جا سکتی بلکہ خصوصی تعلیم ایک معاشرتی رویے کا نام ہے جس میں والدین، اساتذہ، ہم جماعت، محلے دار، ماہرین نفسیات، سماجی کارکن، مذہبی پیشوا اور مخیر حضرات سبھی شامل ہیں بلکہ ان کا اشتراک کار انتہائی ضروری ہے۔ معاشرے کے تمام افراد کو ایک متوازن رویہ اختیار کرنا ہوگا غیر ضروری مراعات صلاحیتوں کے لئے سم قاتل ہیں اور ضروری سہولیات کا فقدان خصوصی افراد کی شخصیت کو مزید مشکلات سے دوچار کر سکتا ہے یہ توازن بڑا مشکل عمل ہے یہ بہت ہی دشوار مرحلہ ہے زیادہ لاڈ پیار خصوصی بچوں کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ اور ان سے بے اعتنائی ان کی زندگیوں کو تباہ کر سکتی ہے۔

یاد رہے کہ خصوصی افراد کی تعداد وطن عزیز کی آبادی کا دس فیصد ہے یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے اگر یہ افراد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں تو یہ نوے فیصد افراد کے لئے تحریک کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم امتحان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا نابینا ہم جماعت بہت اچھے نمبر لے گیا ہے، اس نے بہت اچھی پوزیشن حاصل کی ہے تو وہ اس کے لئے تحریک کا باعث ہو سکتی ہے۔ ہم جب ہیلن کیلر کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنی سستی پر، اپنی کاہلی پر اور اپنی بے عملی پر رونا آتا ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین جو تین سال کی عمر میں نابینا ہو گئے تھے مصر کے وزیر تعلیم ہی نہیں رہے بلکہ بہت بڑے ادیب اور دانشور کی صورت میں ابھرے۔ ان کی شخصیت جانے کتنے بے حوصلہ لوگوں کے لئے مینارۂ نور ہے۔ اسی طرح کوئی بھی خصوصی فرد جب کوئی کامیابی حاصل کرتا ہے تو وہ معاشرے کے لئے ایک قندیل کا کام کر رہا ہوتا ہے اس لئے خصوصی افراد کی تعلیم و تربیت پورے معاشرے کے لئے پیام جد و جہد ہو سکتی ہے، منشور زندگی ہو سکتی ہے۔

خصوصی تعلیم دراصل ان ذرائع کی دریافت ہے جو زندگی کی رکاوٹوں کو دور کر دیں جو جسمانی مشکلات کو خاطر میں نہ لائیں مگر اس کے لئے اس یقین کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالی نے کسی کو بیکار پیدا نہیں کیا قدرت نے ہر ایک کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے اگر منزل پر پہنچنے کے لئے ایک راہ مسدود ہوتی ہے تو جانے کتنی راہیں کھل جاتی ہیں، اس تصور کو نصاب کا حصہ بنا دیا جانا چاہیے۔ اجتماعی زندگی کے لئے سنہری اصول تصور کیا جانا چاہیے۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کو اس تصور حیات کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے اور خصوصی افراد کی تنظیموں کو اس تصور کو فروغ دینا چاہیے۔ جب یہ سب کچھ ہونے لگے گا تو پھر خصوصی تعلیم کی روح سمجھ میں آنے لگے گی، خصوصی تعلیم کا مطلب واضح ہونے لگے گا اور خصوصی تعلیم کے در وا ہونے لگیں گے۔

☆☆☆☆

شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے "میکبتھ" پر سرسری نظر

ولیم شیکسپیئر نے ۳۷ ڈرامے اور دو منظوم ڈرامے لکھ کر اقلیم ادب میں وہ مقام حاصل کیا ہے جو اس کے کسی پیش رو یا بعد میں آنے والے کو نصیب نہیں ہو سکا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ انگلستان کی وہ سلطنت جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا انگریز قوم کو وہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت، شہرت اور عظمت نہ دے سکی جو سولہویں صدی میں طلوع ہونے والے اس آفتاب نے دی جس کی روشنی ابھی تک قائم ہے اور جانے کب تک قائم رہے گی۔ کوئی من چلا کہہ اُٹھا کہ خدا کے بعد اگر کوئی تخلیق کار ہو سکتا ہے تو وہ شیکسپیئر ہے، کسی نے کہا کہ ہم جس کے کلام پر چاہیں انگلی رکھ دیں لیکن شیکسپیئر کا کلام ہر عیب سے مبرا ہے اور دُور کیوں جایئے! ہمارے اپنے علامہ اقبالؒ نے اس نابغۂ روزگار کے تخیل کو جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ بانگِ درا کی زینت ہے۔ سب کچھ چھوڑ دیجئے کوئی ایک ڈراما اُٹھا لیجئے آپ کہہ اٹھیں گے کہ جو کچھ اس کی تعریف میں لکھا گیا ہے وہ کم ہے ابھی بہت کچھ کہا جانا چاہیے اس کا ہر کردار زندگی کا جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا اور روتا ہنستا ذی حیات دکھائی دیتا ہے جس کے کبھی ہم ساتھ ہوتے ہیں، کبھی دائیں کبھی بائیں، کبھی پیچھے اور کبھی آگے، جو حکمت اور دانائی، گہرائی فکر اور دقتِ نظر ان کرداروں کی گفتگو سے مترشح ہوتی ہے اس پر ذہن جھوم جھوم اٹھتا ہے۔

شیکسپیئر کے ایک المیہ ڈرامے Macbeth کو ہی لے لیجئے جو 1606ء میں مکمل ہوا اور اس کے مختصر ترین ڈراموں میں شامل ہے وہ اپنی متنوع اور بوقلموں خوبیوں کی وجہ سے شہرتِ دوام حاصل کر چکا ہے۔ کہانی بہت آسان سی ہے جو اس نے Holinshed کی Chronicles سے لی اور اس میں اپنے تخلیقی جوہر کچھ اس طرح دکھائے کہ Macbeth ایک زندہ و تابندہ تخلیق بن کر رہ گیا ہے، اگرچہ شیکسپیئر نے کوئی ڈراما بھی قارئین کے لئے نہیں پیش کیا تھا، اس کا تعلق تو اسٹیج سے تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ اس کے ڈرامے کو اسٹیج پر پیش

ہونا ہے۔ بایں ہمہ اس کے ڈرامے مدتوں سے یونیورسٹیز کے نصاب کا حصہ ہیں اور پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں اور پڑھتے وقت زندگی کا ایسا گہرا ادراک ہوتا ہے، مختلف جذبوں سے اتنی آگاہی ہوتی ہے کہ ہر قاری اس کے ہر ایک ڈرامے کو پڑھ کر تازہ دم محسوس کرتا ہے اور اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظِ نظر رکھا جانا چاہیے کہ شیکسپیئر کے دور میں تفریح کے کوئی زیادہ مواقع موجود نہ تھے، تھیٹر ہر عام و خاص کی توجہ کا مرکز تھا۔ وہاں ناخواندہ، گنوار اور انتہائی سیدھے سادے لوگ بھی آتے تھے اور بہت پڑھے لکھے بھی۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ہر ایک کے ذوق کی تسکین کرتے تھے۔

میکبتھ کی کہانی بہت سیدھی سادی ہے لیکن آغاز بڑے سنسنی خیز انداز سے ہوتا ہے۔ تین چڑیلیں ہیں جو آپس میں محوِ گفتگو ہیں اور بتاتی ہیں کہ ایک جنگ ہو رہی ہے جس کے اختتام پر وہ ایک جگہ اکٹھی ہوں گی اور Macbeth سے ملاقات کریں گی یوں آغاز ہی سے تجسس اور حیرت کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے اگلے منظر میں ہماری ملاقات سکاٹ لینڈ کے بادشاہ ڈنکن اور اس کے اہلِ دربار سے ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ سے ایک خون میں لتھڑا ہوا سپاہی بھی دربار میں موجود ہے جو بتاتا ہے کہ جنگ بڑی خوفناک صورتحال اختیار کر چکی ہے۔ یہ جنگ ایک نواب Macdonwald کے خلاف ہو رہی تھی جس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔ سارجنٹ اس جنگ میں Macbeth اور Banquo کی بہادری اور شجاعت کے واقعات زخمی ہونے کے باوجود بڑے مزے لے لے کر سناتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے ان دونوں Generals نے فقید المثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن Macbeth کی تو بات ہی کچھ اور ہے اس نے تو بہادری کے وہ جوہر دکھائے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سارجنٹ مزید بتاتا ہے کہ جب جنگ جاری تھی تو ناروے کا بادشاہ بھی اس میں کود پڑا مگر شجاعت کے دونوں پیکروں نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ سارجنٹ کے بعد ایک اور درباری Ross دربار میں حاضر ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ Cawdor کا نواب نازک صورتحال سے فائدہ

اٹھانے کے لئے بغاوت پر آمادہ ہو گیا لیکن اس کی بھی کچھ نہیں بن پڑی اور ناروے کے بادشاہ Sweno نے گھٹنے ٹیک دیئے اور ہمیں دس ہزار ڈالر تاوان دیا اور Cawdor کے Thane کی سازش بھی دبا دی گئی، یہ سنتے ہی بادشاہ نے Cawdor کی جاگیر Macbeth کے آنے سے پہلے ہی اس کے نام کر دی اور اسکی بہادری کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ادھر اس کی بہادری کے گن گائے جا رہے ہیں اور دوسری طرف جب وہ اپنی فقید المثال فتح کے ساتھ جانب دربار رواں دواں ہے تو تینوں چڑیلیں اس کی بے تابی سے منتظر ہیں کہ Macbeth اور Banquo نمودار ہوتے ہیں اور ان چڑیلوں کو دیکھ کر محوِ حیرت ہوتے ہیں وہ Macbeth کے جواب میں اسے خوش آمدید کہتی ہیں! "اے Glamis کے نواب خوش آمدید! اے Cawdor کے نواب خوش آمدید! اے وہ کہ جو بادشاہ بنے گا، خوش آمدید" ان حیرت انگیز خوشخبریوں کے بعد وہ Banquo کو بھی خوش خبری دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ خوش آمدید ! خوش آمدید! تو Macbeth سے کم ہے لیکن کہیں زیادہ بہتر ہے۔گو تو خوش قسمت نہیں لیکن بہت ہی خوش قسمت ہے۔تیری اولاد میں سے بادشاہ ہوں گے اور یوں وہ دونوں کو نویدِ مسرت دے کر غائب ہو جاتی ہیں اور Banquo اور Mecbeth ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہوتے ہیں کہ دو درباری Ross اور Angus نمودار ہوتے ہیں Ross میکبتھ کو خوش آمدید کہتا ہے وہ بتاتا ہے کہ اس کی حیرت انگیز دلیرانہ مہم نے بادشاہ کا دل جیت لیا ہے اور بتاتا ہے کہ دربار اس کے لئے مرحبا کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ Angus بھی اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ Ross اسے Thane of Cawdor یعنی Cawdor کے نواب کے اعزاز سے بھی نوازتا ہے یہ وہی اعزاز ہے جس کا ذکر چڑیلیں کر چکی ہیں۔Banquo حیران ہے اور میکبتھ کی حیرت تو اور بھی زیادہ ہے۔میکبتھ کچھ بھی سمجھ نہیں پاتا کیونکہ Cowdor کا Thane ابھی زندہ ہے۔میکبتھ مافوق الفطری پیشن گوئی پر یقین سا کرنے لگتا ہے اور اس کی پوشیدہ دلی خواہشیں اپنی جولانیاں دکھانے لگتی ہیں۔کہیں دل ہی دل میں

وہ بڑی عظمتوں کے خواب دیکھتا رہا ہے اور اب خوابوں کو تعبیر ملنے لگی ہے اور اس کی خواہش اخلاقی سرحدوں کو بھی عبور کرتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے اور وہ پراگندہ خیالی کا شکار ہو جاتا ہے اور جانے کیا کیا سوچنے لگتا ہے۔

ادھر بادشاہ اپنے دربار میں میکبتھ اور Banquo کا انتظار کر رہا ہوتا ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ Cawdor کو پھانسی دے دی گئی ہے اور اس نے اپنے گناہوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔عین اس وقت میکبتھ اور Banquo دربار میں آن پہنچتے ہیں اور بادشاہ ان کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا ہے دریں اثنا بادشاہ اپنے بیٹے Malcolm کو Cumberland کا شہزادہ مقرر کرتا ہے اور میکبتھ کے محل میں جانے کا اعلان کرتا ہے تا کہ اس کی بہادری اور دلیری کو خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔میکبتھ Malcolm کے اعزاز سے چونک اٹھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اعزاز اس کے جانشین ہونے کا پیش خیمہ ہے اور یوں وہ اس کی راہ کا پتھر بن سکتا ہے۔اس کے دل میں سفلی جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔

ادھر لیڈی میکبتھ اپنے محل میں وہ خط پڑھ رہی ہے جو میکبتھ نے اسے لکھا ہے اور مافوق الفطری پیش گوئیوں کا ذکر کیا ہے۔لیڈی میکبتھ اپنے شوہر کی نرم خوئی سے واقف ہے اور وہ جانتی ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے گا وہ اسے مہمیز کرنے کے لئے تیار ہو رہی ہے اسے میکبتھ کی آمد کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے اور سفلی جذبات اسے بھی گھیر لیتے ہیں اتنے میں میکبتھ داخل ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ آج رات Duncan ان کا مہمان ہو گا۔لیڈی میکبتھ اس کے قتل کا ارادہ کر لیتی ہے اور میکبتھ کو پر سکون رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔

ڈنکن اپنے مصاحبوں کے ہمراہ میکبتھ کے محل میں پہنچ جاتا ہے، میکبتھ اور لیڈی میکبتھ اسے خوش آمدید کہتے ہیں بادشاہ میکبتھ کی بہادری کے گن گاتا ہے۔جب یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے تو میکبتھ کے دل میں قاتلانہ جذبات ابھرتے ہیں لیکن وہ کشمکش و پیچ کا شکار ہے وہ جانتا ہے کہ

بادشاہ کا قتل ایک بہت بڑا جرم ہے۔اس کی بیوی اس کی کمزوری کو سمجھتی ہے اور بزدلی کا طعنہ دیتی ہے۔اس پر میکبتھ برانگیختہ ہوجاتا ہے اور قتل کے لئے سارا منصوبہ تیار کرلیا جاتا ہے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ الزام اس کے محافظوں پر لگادیا جائے۔ Banquo اور اس کا بیٹا Fleance رات کو جاگ رہے ہیں اور کسی سوچ میں غلطاں ہیں۔میکبتھ Banquo کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے لیکن Banquo ہچکچاتا ہے۔

قتل کے عمل سے پہلے میکبتھ ایک خنجر اپنی آنکھوں کے سامنے موجود پاتا ہے اور بڑا پریشان ہوتا ہے ادھر لیڈی میکبتھ پریشان ہے۔میکبتھ بادشاہ کو قتل کرچکا ہے اور قتل کے بعد اسے عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں لیڈی میکبتھ اسے سکون دلاتی ہے اور خود بادشاہ کے کمرے میں جا کر اس کے محافظوں کے ہاتھوں پر خون لگا دیتی پھر میکبتھ کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتی ہے اور اسے ہاتھ دھونے کا مشورہ دیتی ہے۔

صبح سویرے بادشاہ کے قتل کی خبر عام ہوجاتی ہے،بادشاہ کے دونوں بیٹے بھاگ جاتے ہیں اور اس طرح ان پر ہی الزام عائد کردیا جاتا ہے Macduff ایک اور درباری ہے جو صورتحال سے مطمئن نہیں وہ بھاگ جاتا ہے۔میکبتھ محافظوں کو قتل کردیتا ہے اور لیڈی میکبتھ بے ہوش ہوجاتی ہے۔بعدازاں میکبتھ شہنشاہ بن بیٹھتا ہے لیکن وہ مطمئن نہیں اسے Banquo کا دھڑکا لگا ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ اس نے Banquo کی اولاد کے لئے اپنی روح کا سودا کیا ہے Banquo کو بھی معلوم ہے کہ میکبتھ نے سب کچھ درست نہیں کیا ہے۔میکبتھ کے محل میں شام کو تاج پوشی کی ضیافت کا اہتمام ہے۔میکبتھ Banquo کو دعوت دیتا ہے لیکن Banquo کو کہیں جانا ہے مگر وہ رات کو لوٹنے کا وعدہ کرتا ہے مگر میکبتھ تو پہلے ہی قاتلوں کے ساتھ سازباز کرچکا ہے اور تین قاتل Banquo اور اس کے بیٹے Fleance پر حملہ آور ہوتے ہیں Banquo مارا جاتا ہے مگر Fleance بچ نکلتا ہے۔Fleance کا بچ نکلنا بھی میکبتھ کو گوارا نہیں رات کو ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے لیکن میکبتھ کو یوں لگتا ہے کہ Banquo کا بھوت

اس نشست پر آبیٹھا ہے جہاں Banquo کو براجمان ہونا تھا۔Macbeth کانپ اٹھتا ہے خوف کے مارے اس کی کیفیت جذباتی ہوجاتی ہے۔لیڈی میکبتھ صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے اور ضیافت برخاست کردیتی ہے مگر میکبتھ کو قرار کہاں۔وہ تین چڑیلوں کے پاس پہنچتا ہے جو پہلے ہی اسے گمراہ کرنے پر تلی ہیں۔ایک کہتی ہے کہ اسے اپنے درباری Macduff سے ہوشیار رہنا چاہیے،دوسری کہتی ہے کہ وہ جو چاہے کرے کوئی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا شخص اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔تیسری کہتی ہے کہ جب تک Birnam کا جنگل Dunsinane کی پہاڑی تک نہیں پہنچتا اسے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں یہ سب کچھ سننے کے باوجود بھی میکبتھ کو ایک پل قرار نہیں،اسے بتایا جاتا ہے کہ Macduff انگلینڈ بھاگ گیا ہے،اس کا فشارِ خون بڑھ جاتا ہے وہ اس کے محل پر قاتلوں کو بھیج دیتا ہے اور اس کی بیوی اور معصوم بچوں کو قتل کروا دیتا ہے۔

ادھر انگلستان میں Duncan کا بڑا بیٹا Malcolm پناہ گزین ہے۔ Macduff اس سے رابطہ کرتا ہے اور اسے انتقام کے لئے مجبور کرتا ہے بڑی ردوکد کے بعد Malcolm مان جاتا ہے۔اور وہ ایک فوج لے کر روانہ ہوتے ہیں،فوجی ہاتھ میں درختوں کی ٹہنیاں پکڑ لیتے ہیں تاکہ ان کی تعداد زیادہ نظر آئے،یوں گویا Birnum کا جنگل Dunsinane کی پہاڑی کی طرف گامزن دکھائی دیتا ہے۔جب میکبتھ کو یہ پتا چلتا ہے تو اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسکنے لگتی ہے۔اس کے تمام ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ میدانِ جنگ میں کود پڑتا ہے۔لیڈی میکبتھ خودکشی کرلیتی ہے،میکبتھ کا اضطراب دیدنی ہے Macduff اس کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا سر قلم کردیتا ہے۔یوں Malcolm اور Macduff اور خیر کی دوسری قوتیں فتحیاب ہوتی ہیں اور میکبتھ اپنے انجام کو پہنچتا ہے لیکن اس کا انجام جہاں بڑا عبرت انگیز ہے وہاں ہمیں اس کیلئے ہمدردی بھی ہونے لگتی ہے۔وہ آغاز ہی سے ایک ایسے جال میں پھنس جاتا ہے جس سے نکلنا اس کے لئے دشوار ہوتا ہے۔دل کا یہ اچھا انسان

، بہادر اور نڈر سپاہی، خوش خلق اور شاعرانہ مزاج کا حامل شخص کچھ ایسی صورتحال سے دوچار ہوتا ہے کہ اسے کوئی صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرتا ہے اور بالآخر اس کی غلطیاں جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔

یاد رہے کہ میکبتھ ایک سیدھا سادہ سا المیہ نہیں اس کے کئی پہلو اور کئی جہتیں ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ شیکسپیئر اپنی کردار نگاری کے کیا کیا ہنر دکھاتا ہے اور کس طرح دنیا کے ادب میں لافانی مقام حاصل کرتا ہے۔

جیسا کہ آغاز ہی میں کہا گیا ہے کہ میکبتھ کو صرف سٹیج پر پیش کئے جانے کے لئے تیار کیا گیا ہے اور سٹیج بھی ایسا سٹیج جس کے ناظرین آج کے ناظرین سے بڑی حد تک مختلف تھے ان کے مشاغل، معتقدات، خواہشات اور ترجیحات بڑی حد تک مختلف تھیں اس لئے شیکسپیئر کو ان کے ذوق کی تسکین کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ مافوق الفطری عناصر، خودکلامی، شاعرانہ اندازِ کشت و خون سے لبریز مناظر میکبتھ کا جزولاینفک ہیں۔ یہ بھی یاد رکھا جانا چاہیے کہ شیکسپیئر کے دور کا سٹیج اس قدر کلاسیکی سٹیج سے متاثر نہ تھا جس قدر کہ اپنی ملکی روایات سے۔ چنانچہ بڑی حد تک اس میں برطانیہ کی اپنی صورتحال کا زیادہ عمل دخل ہے اور ہمیں جگہ جگہ اس دور کے ناظرین کی خواہشات کی تکمیل کی کاوشیں نظر آتی ہیں۔ الزبتھ کے دور میں مناظر کی پیشکش کا جدید انتظام نہیں تھا اس لئے ناظرین کو کرداروں کے مکالموں سے اندازہ لگانا پڑتا تھا کہ ان کے سامنے جنگل کا منظر ہے یا کسی محل کا۔ بارش ہو رہی ہے یا جھلستی ہوئی دھوپ ہے، جنگ کا میدان ہے یا محفلِ یاراں ہے، چنانچہ ڈرامانگاروں کو کرداروں کی تخلیق میں اپنے عہد کے مزاج کا خاطر خواہ خیال رکھنا پڑتا تھا مناظر کی تبدیلی کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا اس لئے ناظرین کو اپنے تخیل کا بھرپور استعمال کرنا پڑتا تھا اور اس دور کے عوام الناس تخیل کی دولت سے مالا مال بھی تھے بالکل اس طرح جیسے کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے پاکستان میں ریڈیو کے صداکار کہ جو کچھ Actors کہتے تھے من وعن اسے قبول کر لیتے تھے اور لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔

میکبتھ کے پہلے منظر کو ہی لے لیجئے جو کہ ایک ویرانے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ بجلی کی چمک اور گرج ہے اور اس پراسرار ماحول میں تین چڑیلیں سٹیج پر ابھرتی ہیں۔ یہ بات ملحوظِ نظر رہنی چاہیے کہ الزبتھ کے دور میں عوام الناس مافوق الفطری واقعات کو عین فطری سمجھتے تھے اور انہیں اپنے معمولات کا حصہ سمجھتے تھے۔ یہ ان کے لئے کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی، اگرچہ مافوق الفطری عنصر ان کے دلوں میں بھی سنسنی پیدا کرتا تھا اور وہ خوف زدہ ہو جاتے تھے اس خوف میں خاص قسم کی دلکشی بھی تھی یہی وجہ ہے کہ میکبتھ کا پہلا سین اپنے ناظرین کے شوق کی تسکین کے لئے وقف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کمال یہ ہے کہ یہ منظر ڈرامے کا انتہائی اہم حصہ بھی ہے کہ یہاں سے ہمیں ڈرامے کے پورے ماحول کا اندازہ ہو جاتا ہے چڑیلوں کے منہ سے میکبتھ کا نام سن کر ہم میکبتھ کی شخصیت کے بارے میں متجسس ہو جاتے ہیں اور ہمیں یہ بھی احساس ہو جاتا ہے کہ ڈرامے میں کوئی جنگ برپا ہے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ میدانِ جنگ میں بھی ہے اور انسانی ذہن میں بھی۔ خاص طور پر میکبتھ کے ذہن میں جو اخلاقی اقدار اور بے لگام خواہشات کا شکار ہے۔

چڑیلوں کے مندرجہ ذیل الفاظ پورے ڈرامے کی صورتحال کی بھرپور تصویر کشی کرتے ہیں

"Fair is foul and foul is fair

Hover through the fog and filthy air"

(S-1, Act-1, Line 10-11(Page.999)

"یہاں درست غلط ہے اور غلط درست، آؤ ہم اس دھند زدہ اور گندی ہوا میں محوِ پرواز ہو جائیں"

اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے بھوت پریت کی داستان ہی کافی نہیں بلکہ شیکسپیئر ان کے لئے جنگ و جدل کے وہ مناظر بھی پیش کرتا ہے جس کے وہ متمنی ہیں اور پہلے ایکٹ کے دوسرے ہی منظر میں ہمیں جنگ کی صورتحال سے روشناس کرایا جاتا ہے اور جنگ سے آیا ہوا ایک خون آلود سپاہی جنگ کا نقشہ بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے وہ بتاتا ہے کہ میکبتھ نے اپنی

بہادری کے جوہر کس طرح دکھائے، یہ بیانیہ انتہائی سنسنی خیز اور دلچسپ ہے، شیکسپیئر اس کے بیان میں اپنی خطابت کے پورے جوہر دکھاتا ہے۔ ایک جانب تو اس سے ناظرین کے ذوق کی تسکین ہو رہی ہے اور دوسری جانب پلاٹ کو سمجھنے میں بھی مدد مل رہی ہے اور کہانی بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ شیکسپیئر اس پر اکتفا نہیں کرتا اپنے ناظرین کو ضیافتِ طبع کے لئے جام نہیں بلکہ مے خانے پیش کر دیتا ہے۔ چڑیلوں کے بعد جنگ اور جنگ کے بعد پھر چڑیلوں کے کارہائے نمایاں ایک طلسمی ماحول کی پیش کش ہیں۔ تینوں چڑیلیں میکبتھ کی پذیرائی کے لئے موجود ہیں اور اسے بھرپور انداز میں خوش آمدید کہتی ہیں ایک اسے Thane of Glamis کے نام سے خطاب کرتی ہے اور دوسری Thane of Cawdor کے نام سے۔ جب وہ اسے بادشاہ ہونے کی نوید دیتی ہیں وہ جو کہ دل ہی دل میں بادشاہ بننے کے خواب بُن رہا ہوتا ہے یہ نوید سن کر پھولا نہیں سماتا اور اس کا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے چڑیلیں دوسرے جرنیل Banquo کو بھی یہ نوید سناتی ہیں کہ اس کی اولاد میں بہت سے بادشاہ ہوں گے۔ یہاں شیکسپیئر نے Banquo اور Macbeth کے کرداروں کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کرداروں میں کس طرح انفرادی صفات بھر دیتا ہے ۔ Macbeth اور Banquo دونوں کے ردِ عمل سے ان کی شخصیات میں تفاوت کا اندازہ ہوتا ہے اور ہم پہلی بار یہ محسوس کرتے ہیں کہ کردار نگاری میں شیکسپیئر کو کس قدر یدِ طولیٰ حاصل ہے کہ ایک کردار دوسرے کردار سے کتنا مختلف ہوتا ہے بالکل ایسے کہ جیسے دو افراد ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ تمام منظر جنگ کی بازگشت ہے اور میکبتھ کے ذہن میں جنگ کا آغاز۔ اس طرح کی ذہنی جنگ کی تصویریں ہمیں ایک حد تک شیکسپیئر کے پیش رو Marlowe کے صرف ایک کردار Doctor Faustus میں بھی ملتی ہے۔ لیکن شیکسپیئر کے کرداروں میں تو ذہنی جنگ کی بھرمار ہے۔ ذہنی کشمکش کی پیش کش شیکسپیئر کا کمال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کردار نگاری محض سراپا نگاری نہیں ہوتی بلکہ اس میں کرداروں کی داخلی زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس منظر میں میکبتھ کی ذہنی حالت

دیدنی ہے۔ وہ موجود بھی ہے اور غیر موجود بھی۔ وہ خیالات میں کچھ اس طرح کھو گیا ہے کہ اپنے ماحول کو ہی نظر انداز کر دیتا ہے۔ "Aside" کی تکنیک کا بھرپور استعمال شیکسپیئر کے ہاں موجود ہے جو بیسویں صدی میں Steam of Consciousness کا روپ دھار لیتی ہے۔ شیکسپیئر کی عظمت اس امر سے ہوتی ہے کہ اس نے اپنے ڈراموں میں Aside کی تکنیک کا بہت خوبصورت استعمال کیا ہے یعنی یہ کہ جب ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص پاس کھڑے ہوں تو کردار اپنے خیالات کا بول کر اظہار کرتا ہے جسے ناظرین سن لیتے ہیں لیکن تصور یہ کیا جاتا ہے کہ قریب کھڑے ساتھی یہ سب کچھ نہیں سُن پاتے۔ شیکسپیئر کے دور میں یہ طریق کار ڈرامے کا حصہ تھا اور اس پر کوئی بھی معترض نہیں ہوتا تھا بالکل اسی طرح جس طرح مناظر کے نہ ہوتے ہوئے مناظر کی پیش کش کو قبول کر لینا۔ بہر حال زیرِ نظر منظر داخلی کشمکش کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے اور کردار نگاری میں اس کا سہرا شیکسپیئر کے سر جاتا ہے۔ کردار نگاری کا یہ وصف فرش نشینوں یعنی تمام لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں تھا وہاں دھینگا مشتی، چھینا جھپٹی، جنگ و جدل اور کشت و خون کے مناظر کا کوئی فقدان نہیں اور ڈرامے کے ہر ایکٹ میں خونی اور سنسنی خیز مناظر موجود ہوتے تھے اور میکبتھ میں اس قسم کے مناظر کا کوئی فقدان نہیں اور ڈرامے کے ہر ایکٹ میں خونی اور سنسنی خیز مناظر موجود ہیں لیکن شیکسپیئر کسی ایک طبقے کا نمائندہ نہیں تھا اور نہ ہی ایک زمانے کی رسوم و قیود کا پابند تھا یہی وجہ ہے کہ میکبتھ کی ذہنی کش مکش بڑی عمدگی سے پیش کی گئی ہے جو خواندہ اور اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کے لئے خاصے کی چیز ہے۔ جس طرح میکبتھ اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار کر رہا ہوتا ہے وہ شیکسپیئر کی کردار نگاری کا طرۂ امتیاز ہے۔ میکبتھ Ross کی اس خوش خبری سے کہ وہ Thane of Cawdor ہے اور بڑا حیران ہوتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے

"Glamis, and Thane of Cawdor!

The greatest is behind"

(Act.1,S. III, line 116)

تم Thane of Glamisاور Cowdorہو لیکن سب سے بڑی بات ابھی ہونا باقی ہے۔کبھی وہ Rossسے بات کرتا ہے،کبھی Banquo سے کبھی اپنے آپ سے کبھی چڑیلوں سے۔خیالات میں گم خواہشات سے چُور،عظمتوں میں مخمور،خوابوں میں کھویا ہوا اور ان سب کے ساتھ ساتھ خوف زدہ میکبتھ ایک عجیب وغریب تصویر پیش کرتا ہے اور وہ حیران ہے کہ جن بھوت سچ بول سکتے ہیں لیکن اگر وہ سچ بولتے ہیں تو پھر اس کے دل میں قاتلانہ جذبات کیوں ابھر رہے ہیں جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا لیکن وہ یہ سب کچھ ہوتا ہوا بہت جلد دیکھنا چاہتا ہے۔

I'm thane of Cawdor
If good, why do I yield to that suggestion
Whose horried image doth unfix my hair
And make my seated heart knock at my ribs,
Against the use of nature?
Present fears
Are less than horrible imaginings.
My thought whose murder yet is but fantastical
Shakes so my single state of man
That function is smother'd in surmise ,
And nothing is but what is not.(A.1, S .III Line 132-140)

اگر بھوت پریت کی خبر درست ہے تو میں وہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں جس کے تصور کے خوف سے میرے بال پریشان ہیں اور میرا دل غیر معمولی طور پر زور زور سے دھڑک رہا ہے میں ان خطرات سے زیادہ پریشان ہوں جو ابھی وقوع پذیر ہونے ہیں وہ قتل جو ابھی میرے ذہن میں ہے گو خیالی ہے لیکن مجھ پر لرزہ طاری کئے ہے اور میری قوتِ عمل کو مجھ سے چھین رہا ہے حالانکہ

بات کچھ بھی نہیں"۔

میکبتھ کے خیالات اس کے شدید ذہنی اضطراب کا پتا دیتے ہیں اور اس طرح کے داخلی خلفشار کی تصویر کشی پڑھے لکھے اعلیٰ طبقے کو بڑی مرغوب تھی جو تھیٹر میں سرخرو ہوتا تھا اور شیکسپیئر اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھا۔

ادھر Duncan کی سادہ لوحی اور اور فیاضانہ فطرت میکبتھ کی ہوس کے بالکل متضاد ہے وہ میکبتھ کو نوازنا چاہتا ہے، ڈنکن کے سامنے میکبتھ کا رویہ کتنا مکارانہ ہے اس طرح کی مکاری اور عیاری الزبتھ کے دور کا طرۂ امتیاز تھی۔الزبتھ کا دربار سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔شیکسپیئر نے اپنے کم وبیش ہر ڈرامے میں اس سازش کی تصویر کشی کی ہے۔

"As You Like It"، The Tempest,جولیس سیزر، ہیملٹ ، اوتھیلو، بلکہ ہر ڈرامے میں سازشیں ہی سازشیں ہیں, سازشوں کی تصویر کشی عوام الناس کو بڑی پسند تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ شیکسپیئر کی حقیقت نگاری کا حصہ بھی تھی۔

ڈنکن، Banquoاور میکبتھ کو نواز رہا ہے اور اس کی نوازش کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ میکبتھ کے محل میں ذاتی طور پر جا کر اپنی عزت نوازی کا مظاہرہ کرے یہ تو گویا بلی کے ہاتھوں چھینکا ٹوٹنے والی بات ہوئی، میکبتھ تو اپنے دل کے نہاں خانے میں پہلے ہی خون خوار قاتل بنا بیٹھا ہے اس پر مستزاد بادشاہ کا خود اس کے گھر آجانا جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے۔یہی نہیں بلکہ میکبتھ کی رفیقۂ حیات لیڈی میکبتھ، Macbeth سے بھی کہیں زیادہ جرم جُو ہے، اس کے ہاں اخلاقیات جیسی کوئی قدر موجود ہی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے اسے چوتھی چڑیل کہا ہے وہ اپنے محل میں براجمان ہے اور میدانِ جنگ سے واپسی کے سفر میں اپنے نام Macbeth کا خط پڑھ رہی ہے جس میں وہ اسے بتاتا ہے کہ اسے تین چڑیلیں عین اس وقت ملیں جب وہ کامیابی کے تجربے سے گزر رہا تھا۔وہ کہتا ہے کہ ان کے پاس مکمل علم ہوتا ہے اور یہ انسانی علم سے زیادہ علم رکھتی ہیں۔وہ بتاتا ہے کہ ابھی اسے خوش خبریاں ملی ہی تھیں کہ بادشاہ کے نمائندوں نے اس کی جزوی تصدیق کر

دی۔وہ لکھتا ہے کہ تم اس کامیابی میں شریک ہو اس لئے تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔خط پڑھتے ہی کمال اعتماد اور تیقن کے ساتھ لیڈی میکبتھ کہتی ہے کہ اس کا شوہر Glamis اور Cadowr کا Thane بھی ہے اور وہ سب کچھ بنے گا جس کی اسے نوید دی گئی ہے لیکن اسے یہ خیال بھی ہے کہ میکبتھ کے کچھ ذہنی مسائل ہیں

" Yet do I fear thy nature؛

It is too full o' th' milk of human kindness

To catch the nearest way. Thou wouldst be great;

Art not without ambition, but without

The illness should attend it.(Act.1, S.iv, line -13-17)

مجھے تمہاری طبیعت سے ڈر لگتا ہے اس میں بلا کی نرمی ہے اتنی نرمی کہ وہ آسان طریقہ استعمال نہیں کرنے دے گی۔تم عظیم بنو گے خواہش بھی رکھتے ہو لیکن یہ نہیں چاہتے کہ کوئی خرابی واقع ہو"لیڈی میکبتھ کی اپنے شوہر کے بارے میں رائے زیادہ صائب معلوم نہیں ہوتی،میکبتھ نے ڈرامے میں کہیں بھی زم خوئی کا اظہار نہیں کیا ڈنکن کو سوتے ہوئے قتل کر دیا،اس کے محافظوں کو مروادیا،ڈنکن اور Fleance دونوں کو قتل کروانا چاہا خوش قسمتی سے Fleance بچ گیا پھر Macduff کو مروانا چاہا جو انگلینڈ بھاگ گیا اور پھر طیش میں آ کر اس کے بچوں اور بیوی کا بہیمانہ قتل کروایا،ہاں اتنا ضرور ہے کہ اسے ضمیر کے کچوکے ضرور محسوس ہوتے ہیں۔وہ جب بادشاہ کو قتل کر رہا ہوتا ہے تو اسے مختلف ڈراؤنی آوازیں آتی ہیں پھر اسے یہ احساس بھی ہے کہ اسے قتل کر کے کچھ نہیں ملا سوائے بے کیف تاج کے وہ Banquo کے قتل کے بعد بھی اس کے آسیب سے کانپ کانپ جاتا ہے اور آخر میں اپنی شریک حیات کی خودکشی کی خبر سن کر اس کا زندگی پر سے اعتماد ہی اٹھ جاتا ہے اس لئے اسے مکمل طور پر برا انسان نہیں کہا جا سکتا۔لیکن جو کچھ لیڈی میکبتھ کہہ رہی ہے وہ بھی درست نہیں۔لیڈی میکبتھ کو بتایا جاتا ہے کہ شہنشاہ آنے والا ہے وہ خبر سنتے ہی اس کے

قتل کا ارادہ کر لیتی ہے وہ ایک جگہ یہ انکشاف بھی کرتی ہے کہ وہ اور اس کا شوہر پہلے بھی بادشاہ کے قتل کی سازشیں کرتے رہے ہیں اور اب تو وہ تلی ہوئی ہے کہ وہ اسے قتل کر کے ہی رہے گی اس کا مندرجہ ذیل بیان اس کے کردار کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔

Come, you spirits

That tend on mortal thoughts, unsex   me here;

And fill me from the crown to the toe, top-full

Of direst cruelty! Make thick my blood,

Stop up th' access and passage to remorse

That no compunctious visitings of nature shake my fell purpose, nor keep peace between

Th' effect and it.

Come to my woman's breasts,

And take my milk for gall, you murd'ring ministers,

Wherever in your sightless stances

You wait on natur's mischief.

Come, thick night,

And pall thee in the dunnest smoke of hell,

That my keen knife see not the wound it makes

Nor heaven peep through the blanket of the dark,

To cry,"Hold, Hold!"(A-1,S iv, Line 37 to 50 page 1003)

"اے دیوتاؤ! جو انسانی خیالات پر حکمران ہو میری نسوانیت مجھ سے چھین لو اور سر سے

پاؤں تک مجھ میں ظلم ہی ظلم بھر دو، میرے خون کو منجمد کر دو تا کہ رحم کی کوئی صورت باقی نہ رہے نہ کوئی ضمیر کی خلش ستائے کہ کہیں میں اپنا ظالمانہ ارادہ نہ بدل لوں اور میرے عمل اور اس کے نتیجے میں کوئی خلا پیدا ہو جائے۔ میری نسوانی چھاتیوں میں دودھ کی بجائے زہر بھر دو ۔اے قتل کی دیو یا جو کہ بد ے اور خفیہ کاموں کی نگران ہو آ ؤ رات کو گہرا کر دو اس پر تاریکی کی چادر تان دو کہ میرا تیز چاقو میرے لگائے ہوئے زخم کو دیکھ نہ پائے اور نہ ہی آسمان اس تاریکی میں دیکھ سکے اور مجھے کہہ سکے ٹھہرو، ٹھہرو"

لیڈی میکبتھ کی اس خودکلامی سے اس کی شخصیت کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ وہ کتنی صاحب عمل ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ شیکسپیئر نے سولہویں اور سترہویں صدی میں خواتین کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ مارلو کے ڈراموں میں خواتین محض ایک تصور ہے۔ ان کا کردار بڑا غیر اہم ہے لیکن شیکسپیئر نے بالخصوص اپنے طربیہ ڈراموں میں خواتین کو میر کارواں اور میر محفل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مرداُن کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے۔ وہ عمل، ذہانت، مستعدی اور محبت کا پیکر ہیں Hazlitt نے کہا تھا کہ شیکسپیئر کے ہاں ہیروئنز ہیں ہیروز نہیں یہ بات اسکے طربیہ ڈراموں کے بارے میں بالکل سچ ہے۔ Viola، Rosalind اور Beatriece جیسے بیسیوں کردار اس کے طربیہ ڈراموں کی روحِ رواں ہیں لیکن المیہ ڈراموں میں سوائے کنگ لیئر اور میکبتھ میں ان کا کردار اہم نہیں اور اگر وہ کچھ کرتی نظر آتی ہے تو وہ منفی عمل ہے کنگ لیئر میں ریگن اور گونرل شر کا پیکر ہیں البتہ کارڈیلیا کا کردار انتہائی دل کش ہے زیرِ نظر ڈراما میں لیڈی میکبتھ صرف آغاز میں مستعد اور باعمل نظر آتی ہے بعد میں وہ پسِ منظر میں چلی جاتی ہے اور خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے تاہم یہاں وہ انتہائی تیز اور طرار دکھائی دیتی ہے اور وہ ابھی خط مکمل ہی کرتی ہے کہ میکبتھ آن پہنچتا ہے اور وہ اسے ان تمام القابات سے خوش آمدید کہتی ہے جن سے چڑیلیں اسے خوش آمدید کہہ چکی ہیں یہاں دونوں کی گفتگو بڑی مختصر اور اجمالی ہے شاید دونوں ذہنی طور پر شدید

کشمکش کا شکار ہیں اور ضرورت سے زیادہ کوئی بات نہیں کرتے وہ میکبتھ کو پرسکون رہنے کی تلقین کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اسکے چہرے سے کوئی پریشانی نمایاں نہیں ہونی چاہیے۔

" To Beguile the time,
Look like the time;
Bear welcome in your eye,
your hand your tongue:
Look like the innocent flower
But be the serpent under't
(Act.1, scene ,iv, Line 60-63 page 1003)

وقت سے نظر بچانے کے لئے وقت جیسے ہو جاؤ اپنی آنکھوں، ہاتھوں اور زبان میں مٹھاس بھر لو ایک معصوم پھول جیسے نظر آؤ لیکن اصل میں سانپ بنے رہو، اگلے ہی منظر میں بادشاہ میکبتھ کے محل میں پہنچ جاتا ہے اور محل کی دل کھول کر تعریف کرتا ہے اور اس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ یہ محل تو اس کا قبرستان بننے والا ہے۔ میکبتھ اور لیڈی میکبتھ بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور اسے ایک کمرے میں لے جاتے ہیں اگلے منظر کا آغاز میکبتھ کی خودکلامی سے ہوتا ہے بادشاہ اس کے ایوان میں موجود ہے اور وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اسے کیسے قتل کیا جائے اور اس کے نتائج سے کیسے بچا جائے اور آرام سے تخت پر قبضہ کر لیا جائے۔

" If it were done, when 'tis done then 'twere well
If were done quickly. If th' assassination
I could trammel up the consequence, and catch,
With his surcease success; that but this blow
Might be the be-all and the end all- here,..... but here

upon this bank and shoal of time.......we'd jump the life to come.

(Scene vii, Act 1, Line, 1-7,page-1004)

اگر بادشاہ قتل ہو جائے تو کتنا اچھا ہو اور پھر یہ کام جتنی جلدی ممکن ہو بہتر ہے اور اس کے قتل کے حتمی نتائج سے بچ سکیں اور کامیاب ہو جائیں تو یہ سب کھیل یہیں ختم ہو جائے گا اگلی زندگی کے نتائج ہم دیکھ لیں گے"

مگر میکبتھ یہ بھی سوچتا ہے کہ اس طرح تو ہم دوسروں کو بھی قتل کی ترغیب دے رہے ہوتے ہیں اور پھر ہماری اپنی باری بھی آسکتی ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ بادشاہ کا کوئی قصور بھی نہیں۔ وہ نیک دل ہے اور پھر اسے قتل کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں سوائے بے لگام خواہش کے جو اس کے دل میں مچل رہی ہے وہ صراطِ مستقیم کی طرف آہی رہا ہوتا ہے کہ لیڈی میکبتھ Dr. Fastus کے Evil Angel کی طرح نمودار ہوتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ بادشاہ نے کھانا کھالیا ہے۔ میکبتھ اسے کہتا ہے کہ بادشاہ تو اس کے ساتھ بڑا مہربان رہ چکا ہے وہ اسے قتل کیسے کرے لیڈی میکبتھ کبھی طنز کے تیروں سے اور کبھی طعنوں سے اس کا سینہ چھلنی چھلنی کر دیتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے جب بادشاہ سو رہا ہوگا اور اس کے محافظ نشے میں چُور ہوں گے تو ہم قتل کر دیں گے اور الزام اس کے محافظوں پر دھر دیں گے، یہ دلائل اور گفتگو سن کر میکبتھ پھولا نہیں سماتا اور تیار ہو جاتا ہے۔

"Bring forth men_children only;

For thy understanded mettle should compose

Nothing but males .

(Act 1, Scene vii, line 70, page-1005)

لڑکے ہی لڑکے جنو، تیری جرأت صرف بیٹے ہی پیدا کر سکتی ہے، یوں لیڈی میکبتھ

ہچکچاتے ڈانواں ڈول اور پس و پیش زدہ میکبتھ کو بادشاہ کے قتل پر تیار کر لیتی ہے۔

وہ رات، بھیانک رات آجاتی ہے جبکہ قتل کا گھناؤنا عمل سرزد ہونا ہے رات کے کوئی بارہ بجے ہیں آج رات Banquo اور Fleance کو بھی نیند نہیں آئی ۔ Banquo اپنی تلوار اپنے بیٹے کو دے دیتا ہے ناقدین کا خیال ہے کہ Banquo بھی کوئی ایسا ہی کام سرانجام دینا چاہتا تھا جیسا کہ میکبتھ سرانجام دینا چاہ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے۔

"Merciful powers

" Restrain in me the cursed thought that nature

Gives way to in repose!"

(Act ii, Scene 1, Line, 7, page 1005)

اے مہربان طاقتو، میرے دل میں ملعون خیالات کو نہ پیدا ہونے دو جو کہ سکون میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ عین اسی وقت میکبتھ داخل ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں بھی تلوار ہے وہ پہچان لیتا ہے کہ دوسرا آدمی Banquo ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں وہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے تمہاری بڑی تعریفیں کی ہیں اور تمہاری اہلیہ کو ایک ہیرا دیا ہے میکبتھ کہتا ہے کہ ہم بادشاہ کے شایانِ شان استقبال نہیں کر سکے۔ Banquo بتاتا ہے کہ گزشتہ رات اس نے تین چڑیلوں کو خواب میں دیکھا ان کی پیشین گوئی تمہارے بارے میں تو کچھ سچی ثابت ہو گئی ہے میکبتھ کہتا ہے کہ میں نے ان کے بارے میں کبھی نہیں سوچا Fleance چلے جاتے ہیں اور میکبتھ اکیلا رہ جاتا ہے اور اپنی بیوی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے خنجر ظاہر ہوتا ہے اور وہ اس سے محوِ گفتگو ہو جاتا ہے یہ خنجر اس کے اپنے خیالات کی پیداوار ہے کیونکہ اس کے دماغ میں خنجر ہی خنجر ہیں یوں شیکسپیئر نے میکبتھ کا انتہائی نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے اس طرح کے نفسیاتی تجزیے اور اس طرح کی کردار نگاری الزبتھین دور کے تعلیم یافتہ اور بالا طبقے کو بہت پسند تھی۔ اس منظر میں وہ سنسنی خیز صورتِ حال سے بھی جسے فرش نشین پسند کرتے تھے اور وہ شاعری بھی جو بالا نشین طبقے کو

پسند تھی۔ اسی ایکٹ کے دوسرے سین میں لیڈی میکبھ نمودار ہوتی ہے جبکہ میکبھ بادشاہ کے قتل میں مصروف ہے لیڈی میکبھ کو ایک الو کی آواز سنائی دیتی ہے وہ بتاتی ہے کہ بادشاہ کے دربان گہری نیند سوئے ہوئے ہیں جیسے مر گئے ہوں دور سے میکبھ کی آواز آتی ہے۔ لیڈی میکبھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے کہ کہیں بادشاہ کے دربان جاگ نہ گئے ہوں، وہ کہتی ہے کہ میں نے ان کے پاس ہی خنجر رکھ دیئے تھے اور اگر ڈنکن کی سوتے وقت میرے باپ سے مشابہت نہ ہوتی تو قتل تو میں خود ہی کر دیتی۔ یہاں کہیں لیڈی میکبھ میں ایک نرم گوشہ دکھائی دیتا ہے اور اتنے میں میکبھ دکھائی دیتا ہے وہ بادشاہ کو قتل کر آیا ہے اور بہت خوف زدہ ہے یہ سین انتہائی ڈرامائی ہے اور سنسنی خیز بھی۔ اس کے ہاتھ خون سے لتھڑے ہوئے ہیں وہ کہتا ہے کہ جب وہ قتل کر رہا تھا تو اسے لگا کہ کوئی نیند میں ہنسا ہے اور کسی نے کہا ہے "قتل" جیسے کہ وہ ایک دوسرے کو جگا رہے ہوں اور پھر وہ سو گئے ہیں۔ میکبھ کہتا ہے کہ ایک نے کہا کہ خدا ہمیں امان میں رکھے اور دوسرے نے آمین کہا۔ لیڈی میکبھ اسے نارمل ہونے کیلئے کہتی ہے میکبھ بہت پریشان ہے وہ کہتا ہے کہ قتل کرتے وقت آواز آئی تھی "میکبھ نے نیند کو قتل کر دیا ہے اور کڈور اب کبھی نہیں سوئے گا میکبھ کبھی نہیں سوئے گا" لیکن لیڈی میکبھ پریشان نظر نہیں آتی میکبھ پروگرام کے مطابق محافظوں کے ہاتھوں کو خون آلود کر کے بھی نہیں آیا اور اب لیڈی میکبھ خنجر لے کر خود کمرے میں داخل ہوتی ہے یہ منظر انتہائی جذباتی خوفناک اور سنسنی خیز ہے۔ لیڈی میکبھ واپس آ چکی ہے اور اپنے ہاتھوں کو دھو لیتی ہے اور عین اسی وقت ایک Porter (دربان) سٹیج پر نظر آتا ہے۔ جو کچھ سویا ہوا اور کچھ جاگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو جہنم کا داروغہ سمجھتا ہے، یہ منظر المیے کی شدت کو متوازن کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے کیونکہ صورتحال بہت ہی دل دوز اور المناک ہو چکی ہے۔ شیکسپیئر ارسطو کی ہدایت کے برعکس اپنے المیہ ڈراموں میں قدرے مزاحیہ مناظر پیش ضرور کرتا ہے، جیسے کنگ لیئر میں مسخرے کی گفتگو، ہیملٹ میں گورکنوں کی باتیں اور اوتھیلو میں کلاؤن کی بات چیت۔ اس کے بعد Macduff اور Lennox داخل ہوتے ہیں اور انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کو قتل کر دیا گیا ہے لیڈی میکبھ بے ہوش ہو جاتی ہے

کہ اس کے محل میں ایسا گھناؤنا واقعہ رونما ہوا ہے۔ صورتحال انتہائی گھمبیر ہے۔ میکبھ بتاتا ہے کہ اس نے دربانوں کو بھی قتل کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے بھلا کون برداشت کر سکتا تھا کہ بادشاہ کے قاتل زندہ رہیں۔ صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بادشاہ کا بیٹا Donalbain، Ireland اور دوسرا بیٹا Malcolm انگلستان بھاگ جاتا ہے اور یوں بڑی آسانی سے ان پر الزام لگا دیا جاتا ہے۔

Act II کے سین IV میں Ross اور ایک بوڑھے آدمی کی گفتگو بڑی فکر انگیز ہے بوڑھا آدمی کہتا ہے کہ وہ اسی (۸۰) سال کا ہو گیا ہے۔ اس نے آج تک ایسی خوفناک رات نہیں دیکھی Ross بھی ایسی بہت سی مافوق الفطری اور محیر العقول باتوں کا ذکر کرتا ہے کیونکہ بادشاہ کا قتل بذاتِ خود ایک غیر معمولی بات ہے ایسا اس لئے ہوا کہ ایک انتہائی گھناؤنا جرم سرزد ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح کی کیفیت جولیس سیزر میں سیزر کے قتل کی رات کو ہوتی ہے۔

Macduff بڑی حد تک جانتا ہے کہ کیا ہوا ہے اس لئے وہ تاج پوشی کی تقریب میں شرکت نہیں کرتا ادھر Banquo بھی بخوبی واقف ہے کہ بادشاہ کا قتل ہوا ہے لیکن وہ Macduff کے برعکس مصلحت پسند ہے وہ ایک خود کلامی میں کہتا ہے۔

Thou hast it now King, Cowdor, Glamis, all
As the weird women promis'd, and I fear
Thou play'dst most foully for't";
(Act.III, Scene.I, Line,1. page-1010)

اب تمہیں سب کچھ مل گیا ہے تم بادشاہ بھی ہو، کڈور اور گلیمس کے جاگیردار بھی جیسا کہ جادوگر خواتین نے پیشین گوئی کی تھی مجھے ڈر ہے کہ تو نے یہ سب کچھ حاصل کرنے میں غلط رستہ اختیار کیا ہے۔ Banquo کو دراصل اب اپنی پڑی ہے کہ اس کے بچوں کو بادشاہت کیسے ملے گی جیسے کہ جادوگر خواتین نے پیش گوئی کی تھی لیکن اسے یہ شک نہیں کہ میکبھ اسے اور اس کے

بیٹے کو قتل کروانے کی سازشیں کر رہا ہے میکبتھ اور لیڈی میکبتھ اسے شام کو ہونے والی تخت پوشی کی ضیافت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور وہ شرکت کا وعدہ کر لیتا ہے۔ ادھر میکبتھ قاتلوں کو تیار کر رہا ہے اور انہیں کہتا ہے کہ Banquo ان کا بھی دشمن ہے اور اسے قتل کر دیا جانا چاہیے۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ اس کا بیٹا بچ جاتا ہے۔ تخت پوشی کی دعوت جاری ہے۔ Banquo کا بھوت اسی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے جو Banquo کے لیے مخصوص تھی یہ سین عوام الناس کی دلچسپی کا باعث بھی ہے اور میکبتھ کی بھرپور ذہنی تصویر بھی پیش کرتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لیڈی میکبتھ کتنی باصلاحیت ہے اور کس طرح سے صورتحال کو سنبھالتی ہے اور تقریب کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن میکبتھ کی پریشانی کم نہیں ہوتی اور وہ چڑیلوں سے مشاورت کا فیصلہ کرتا ہے جو پہلے ہی اس کو گمراہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ وہ اسے کیسے گمراہ کرتی ہیں۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ وہ ان کی تسلیوں پر کان نہیں دھرتا اور Macduff کو قتل کرنے کی سوچتا ہے جو پہلے ہی فرار ہو چکا ہے اور میکبتھ اپنے خونی جنون میں Macduff کی بیوی اور بچوں کو قتل کروا دیتا ہے۔ اب میکبتھ صورتحال سے بہت گھبرا چکا ہوتا ہے۔ سب دوست اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں ادھر انگلستان میں Malcolm اور Macduff فوج لے کر سکاٹ لینڈ پہنچ رہے ہیں اور راستے میں درختوں کی شاخیں ہاتھوں میں تھام لیتے ہیں۔ میکبتھ کی رہی سہی امید جاتی رہتی ہے کہ اب تو جنگل بھی اس کے محل کی طرف رواں دواں ہے Macbeth ذہنی طور پر بہت ہی پریشان ہو چکا ہے اور ہر ایک کی سرزنش کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اب مجھ تک کوئی اطلاع نہ پہنچائی جائے جو بھاگ رہے ہیں انہیں بھاگ جانے دیں۔ Birnam Wood کو Dunsinane کی طرف بڑھنے دو بس اسے یہ وہم ہے کہ Malcolm نے عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے اور کوئی عورت زادہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا جیسا کہ جادوگر خواتین نے اسے بتایا تھا کہ اس کی یہ خام خیالی ہے بلکہ شاید وہ خود بھی اس پر یقین نہیں رکھتا، بس دل کے بہلانے کو اسے یہ خیال اچھا لگتا ہے وہ بوکھلا جاتا ہے اور بڑا

آزردہ خاطر ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بہت جی لیا ہے اب تو وہ ایک زرد پتے کی طرح ہے وہ کبھی بھی گر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آخری دم تک لڑنے کے لئے تیار رہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس وقت تک لڑے گا جب تک اس کی ہڈیوں پر گوشت ہے۔ ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ اس کی شریک حیات ذہنی عارضے کا شکار ہو گئی ہے وہ اسے بھی ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنی دوائیوں کو اٹھا کر پھینک دو اگر وہ بے مصرف ہیں۔

لیڈی میکبتھ اپنے ہاتھ ملتی ہے اور کہتی ہے۔

" Out Damned Spot! out,

I say! One, two; why then 'tis time to do't.

Hell is murky fie, my lord , fie! a soildier and afeard?

(Act, VI, Secene,I. Line, 32)

اے (ہاتھ) کے داغ دور ہو، میں کہتی ہوں کہ دور ہو ایک دو (قتل) کرنے کا وقت آ گیا ہے۔۔۔ جہنم میں بڑا اندھیرا ہے۔۔۔۔ میرے آقا شرم کی بات ہے! سپاہی ہوتے ہوئے ڈرتے ہو، ہمیں ڈرنے کی ضرورت بھی کیا ہے کسی کو کیا خبر" اسے سب کچھ یاد آ رہا ہے وہ چیختی ہے اور جو جی میں آتا ہے کہتی چلی جاتی ہے وہ ڈیپریشن کا شکار ہو گئی ہے۔ ڈنکن کے خون میں لت پت ہاتھ ذرا سے پانی سے دُھل گئے تھے لیکن فی الحقیقت وہ خون اس کے ذہن میں جمع ہو گیا تھا۔ اس نے ایسا کام سرانجام دیا تھا جو نسوانی طاقت سے زیادہ تھا اس کام کے بوجھ میں وہ دب گئی ہے۔ مر گئی ہے پھر اسے اور باتیں یاد آتی ہیں اور اس کا ذہنی عارضہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ تاج پوشی کی دعوت میں اس نے اپنے شوہر کو کیسے تسلیاں دی تھیں، وہ چیخ اٹھتی ہے۔

"Here's the smell of the blood still.All the perfumes of Arabia will not sweeten this little hand oh,oh,oh"!

(Act,V, Scene.I, Line 49-51, page.1022)

میرے (ہاتھوں) میں ابھی خون کی بو ہے۔عرب سے آئی ہوئی عطریات بھی اس بو کو مٹا نہیں سکیں گی ۔ہائے ہائے ہائے ۔ڈاکٹر اعتراف کرتا ہے کہ اس کی بیماری کا وہ علاج نہیں کر پائے گا شاید یہ وہ زمانہ تھا جب سائیکاٹرسٹ موجود نہیں تھے لیکن شیکسپیئر نے جس خوبصورت انداز سے لیڈی میکبتھ کی ذہنی کیفیت کو پیش کیا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا ماہر نفسیات تھا ڈاکٹر میکبتھ سے کہتا ہے۔

Un- natural deeds

Do bread un natural troubles,

"(Act v, Scene, 1, L-68, Page,1022)

غیر فطری اعمال کے نتائج بھی غیر فطری ہوتے ہیں، یوں یہاں ڈاکٹر نے ایک بڑی اخلاقی بات کی ہے اور ثابت ہو گیا ہے کہ برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے اور اس طرح ڈاکٹر جانسن کا یہ اعتراض بے معنی ہو جاتا ہے کہ شیکسپیئر نے اخلاقیات کا گلا دبا دیا ہے۔شیکسپیئر کے ڈراموں میں برائی ہمیشہ شکست کھاتی ہے ہاں نیکی کو اس کا اجر ملنا ضروری نہیں۔ہماری رائے میں شیکسپیئر کے ڈراموں کا یہ تاثر کہ بدی مٹ کر رہے گی مبنی بر حقیقت نہیں تاہم شیکسپیئر کے ڈراموں کو پڑھ کر یہی تاثر ملتا ہے میکبتھ خوف زدہ ہو جاتا ہے اور اس عالم میں اسے یہ جانکاہ خبر ملتی ہے کہ ملکہ دم توڑ چکی ہے اور اس موقع پر جو کچھ میکبتھ کہتا ہے اس سے اس کی دانشوری کا پتا چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کتنی بے معنی شے ہے۔

"She should have died hereafter;

There would have been a time for such a word.

To-morrow, and to-morrow, and to-morrow.

Creeps in this petty pace from day to day

To the last syllable of recorded time.

And all our yesterdays have lighted fools

The way to dusty death

Out, out , brief candle!

Life, but a walking shadow , a poor player

That struts and frets his hour upon the stage

And then is heard no more,it is a tale

Told by an idiot' full of sound and fury

Signifying nothing

"(Act v, scene 5, line-15-28, Page. 1024)

"وہ ذرا دیر میں مرتی پھر شاید اس کے لئے کچھ الفاظ کہنے کا وقت ہوتا ـــــــ کل کل کل کرتے وقت گزر جاتا ہے، وہ وقت جو ہمارے لئے مقرر ہے ماضی میں اس طرح کتنے احمق خاک میں مل گئے، اے مختصر سی شمع خاموش ہو جا، زندگی ایک چلتے پھرتے سائے کے سوا ہے کیا۔ ایک حقیر سا اداکار زندگی کے سٹیج پر آتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتا ہے، زندگی ایک دیوانے کی کہانی کے سوا ہے کیا، جس میں مشکلات ہی مشکلات ہیں اور جس کا کچھ مطلب بھی نہیں" میکبتھ کا یہ اندازِ فکر ظاہر کرتا ہے کہ وہ اندر سے کتنا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور اس کے باوجود زندگی پر اس کی گہری نظر ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ زندگی ایک حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں زندگی کی بے بساطی کا احساس تو اسے اس وقت سے ہونے لگا تھا جب اس نے اپنے محسن بادشاہ کو قتل کر دیا تھا اور اسے یوں لگا تھا کہ جیسے اس نے اپنے آج کو قتل کر دیا ہو، سچ تو یہ ہے کہ وہ اخلاقی طور پر اپنا خون بہا چکا تھا اس کا یہ اندازِ فکر قارئین کے دلوں میں اس کیلئے کچھ نہ کچھ ہمدردی ضرور پیدا کرتا ہے اور شاید اس لئے وہ ہماری نظروں میں مکمل طور پر نہیں گرتا اور اگر گرتا ہے تو وہ ارسطو کے المیہ کے تصور

کے مطابق ایک ہیرو نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایسے ہیرو سے جو سراپا برائی ہو ہمارے دل میں کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوسکتی جو المیے کا جزولاینفک ہے اور جس کے باعث کیتھارسس یعنی جذباتی تسکین حاصل نہیں ہوسکتی بہر کیف بعض ناقدین کے نزدیک میکبتھ ایک برا کردار ہے لیکن بعض ناقدین اس کی شاعرانہ فکر، ذہنی افسردگی اور غیر معمولی الجھنوں کے باعث اس کیلئے کچھ لطیف گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں میکبتھ شروع ہی سے قتل کے گھناؤنے جرم سے کچھ نہ کچھ گریزاں دکھائی دیتا ہے لیکن چڑیلوں کے اکسانے اور اپنی بیوی کے لعن طعن کی وجہ سے وہ پہلا قتل کرنے پر مجبور سا ہو جاتا ہے اور پھر ایک قتل کو چھپانے کے لئے اسے بہت سے قتل کرنے پڑتے ہیں وہ کھوکھلا سا جاتا ہے اور پھر ساری صورتِ حال اسے آخری المیے کی جانب کھینچی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب اسے بتایا جاتا ہے کہ Birnam کا جنگل Dunsinane کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس کے پاؤں تلے کی زمین مکمل طور پر نکل جاتی ہے لیکن پھر وہ بزدلوں کی طرح ہتھیار نہیں ڈالتا اور میدانِ جنگ میں کود پڑتا ہے اور میکڈف کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جو اس کے سامنے آکر اسے بتاتا ہے کہ وہ وقتِ معینہ سے پہلے پیدا ہو گیا تھا اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی عورت نے اسے روایتی مدت میں جنم نہیں دیا تھا لیکن یہ محض لفظی بازی گری ہے۔ دراصل چڑیلوں نے اسے گمراہ کیا تھا ما کہ وہ گمراہ ہونے والا نہیں تھا لیکن حالات نے اسے جہاں پہنچا دیا تھا وہاں اسے کوئی سیدھا راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور یوں آہستہ آہستہ میکبتھ اپنے انجام کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سچ کی فتح ہوتی ہے لیکن اس فتح کے لیے بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے کتنے قتل ہوتے ہیں کتنی تباہی آتی ہے سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے لیکن زندگی کی کوئی تباہی مکمل تباہی نہیں ہوتی شیکسپیئر کو اس حقیقت سے پوری طرح واقفیت ہے۔ زندگی کی ندی بہر صورت بہتی چلی جاتی ہے، ایک شہنشاہ قتل ہوتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اب ڈنکن کا بیٹا Malcolm اور Macduff سلطنت کے مالک ہیں وہ سلطنت جو خون میں لتھڑی ہوئی ہے سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا ہے مگر ہر تخریب کے بعد تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہی کچھ شیکسپیئر کے ہر المیے میں ہوتا ہے۔

یوں میکبتھ ایک ایسا ڈراما ہے جو ذہن پر انمٹ نقوش مرتسم کرتا ہے زندگی کی تلخیاں اپنی پوری شدت سے ظاہر ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی دل کشی بھی ہے اس میں اچھے لوگ بھی ہیں اور اچھے افکار بھی۔ بُرائی اچھائی پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ایسا مکمل طور پر نہیں کر سکتی بس یہی وہ زندگی کا راز ہے جو شیکسپیئر جانتا ہے اور جو وہ ہمیں بتانا چاہتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ میکبتھ کے ذریعے ہم زندگی کی تلخیوں اور ناہمواریوں کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور زندگی کا ہر پہلو ہم پر منکشف ہوتا ہے شیکسپیئر کوئی ناصح اور مبلغ نہیں وہ تو زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے جیسی زندگی ہے ویسی ہی وہ ہمارے سامنے نمودار ہوتی ہے بلکہ نمودار ہوتے رہنے کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں اور زندگی دھیرے دھیرے ہم پہ منکشف ہوتی رہتی ہے بلکہ ایک ایسی کیفیت جنم لیتی ہے جو ایک وجدانی سرمستی کے ذریعے ہمیں اشیاء کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت عطا کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شاعری جو کچھ کہتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس سے مطالب اخذ کئے جا سکتے ہیں اور یہی بات ہر اچھی تخلیق کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

بظاہر میکبتھ میں ایک عام سی کہانی بیان کی گئی ہے، ایک عام قصہ بیان کیا گیا ہے لیکن پیش کش کتنی فکر انگیز ہے اس کا انحصار اس پر ہے کہ خود ہم میں ادراکِ حقیقت کی کتنی قوت ہے۔ میکبتھ کا کردار زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کا ہر قول اور ہر عمل آفاقی اہمیت کا حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ چار صدیاں گزر جانے کے بعد بھی میکبتھ کی ادبی اور جامعی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ زبان و بیان کے انداز بدل سکتے ہیں سٹیج کے تقاضے تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن بین السطور جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا دکھائی نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ میکبتھ کو شیکسپیئر کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

کنگ لیئر .....ایک مطالعہ

شیکسپیئر کی ڈرامائی اور شاعرانہ عظمت کو دنیائے ادب ہمیشہ سلام پیش کرتی رہی ہے، انگلستان اس سے قبل یا اس کے بعد کوئی اتنا عظیم فنکار پیدا نہیں کر سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ شیکسپیئر کے ۳۷ ڈرامے اور ڈرامائی نظمیں انگریزی ادب میں لافانی مقام رکھتی ہیں بالخصوص اس کے چار المیہ ڈرامے ہیملٹ، کنگ لیئر، اوتھیلو اور میکبتھ نے تو وہ شہرت پائی ہے جو کسی اور انگریزی ڈرامے کو شاید حاصل نہیں ہو سکی۔ شیکسپیئر کا کمال یہ ہے کہ وہ طربیہ اور المیہ دونوں طرح کے ڈرامے نہایت کامیابی سے پیش کرتا ہے اور یہ بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت کم ڈراما نگاروں کو حاصل ہوتی ہے بے شک بہت سے ڈرامہ نگار ہوتے ہیں جنہوں نے طربیہ اور المیہ دونوں قسم کے ڈرامے تحریر کئے لیکن ان کی مقبولیت کا گراف بہت کم رہا ہے پھر شیکسپیئر کا اپنے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اپنی مثال آپ ہے اس کے کردار اتنے جیتے جاگتے ہیں کہ ان پر ڈرامائی کردار ہونے کا شبہ تک نہیں کیا جا سکتا گوشت پوست کے یہ مرد وزن نہ صرف ہمارے ذہنی سٹیج پر ہمیشہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں بلکہ عام زندگی میں بھی ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اپنے ڈراموں میں شیکسپیئر نے جو شاعرانہ محاسن ملحوظِ نظر رکھے ہیں وہ اس کا ایک اور طرۂ امتیاز ہے۔

بہر کیف شیکسپیئر کا ڈراما کنگ لیئر اس کے باقی المیہ ڈراموں کی طرح شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ ہماری رائے میں یہ ڈراما شیکسپیئر کی معرکۃ الآرا پیشکش ہے جسے 1605ء میں سٹیج کیا گیا اور آج تک سٹیج کیا جا رہا ہے۔ کنگ لیئر زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو پیش کرتا ہے جن کی نوعیت آفاقی اور ہمہ گیر ہے بالخصوص عصرِ حاضر میں کنگ لیئر میں پیش کردہ ناسپاسی کا مشاہدہ کم وبیش ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ ناسپاسی ایک ایسا مرض ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ شیکسپیئر نے Timon of Athens میں اس انسانی کمزوری کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور بعد میں ۱۸ ویں صدی کے نثر نگار Jonathan Swift نے اپنے خیالی سفر ناموں

Gulliver Travels میں اسے بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "بے شک انسان ناشکرا ہے" ناشکرا پن انسان کی سب سے قبیح کمزوری ہے، جس پر ہم جان چھڑکتے ہوں، جس کے لئے ہم جیتے مرتے ہوں، اگر وہی دشمنِ جاں ہو جائے تو جس قدر تکلیف ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔

کنگ لیئر کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں بڑی خوبصورتی سے یہ آفاقی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ابتلاء و آزمائش انسانی زندگی کی جزوِ لاینفک ہے مشکلیں زندگی میں آتا ہی ہوتی ہیں ان کے سامنے سپر انداز نہیں ہونا چاہیے بلکہ آخری دم تک ان سے نبرد آزما ہوتے رہنا چاہیے عام طور پر مشکل میں گھرا ہوا فرد اپنے آپ کو سب سے زیادہ مظلوم سمجھتا ہے اور خود رحمی کا شکار ہو جاتا ہے لیکن کنگ لیئر کو دیکھ کر اس حقیقت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ہم ہی نہیں بلکہ ہم سے بھی کہیں زیادہ مشکلیں انسانوں کو لاحق ہو سکتی ہیں اس لئے ہمیں ہمت جواں رکھنی چاہیے اور مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ کنگ لیئر کا مطالعہ دراصل ایک نوع کی رجائیت کا مطالعہ ہے یہ ایک ایسا ٹانک (Tonic) ہے جو مایوسی اور افسردگی کے خلاف مدافعت پیدا کرتا ہے اور ہم انتہائی ہمت آزما لمحات میں بھی علمِ زندگی بلند رکھتے ہیں۔

کنگ لیئر کے مطالعے یا اسے stage پر دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں دنیا میں انتہائی خودغرض اور بے رحم افراد ہوتے ہیں وہاں دوسروں کا دکھ بانٹنے والے اور دوسروں کے کام آنے والے افراد کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بلاشبہ کنگ لیئر کا تعلق زمانہ قدیم کی تہذیب سے ہے جس میں کشت وخون، خودکشی اور اس طرح کے انسانی مظالم عام دکھائی دیتے ہیں لیکن اس دنیا میں ایسے افراد بھی مل جاتے ہیں جو صبر اور قناعت کا پیکر ہوتے ہیں اور دوسروں میں خوشیاں بانٹتے ہیں۔

زبان وبیان کے اعتبار سے کنگ لیئر انتہائی دل آویز ڈراما ہے جس میں فطرت کا غیض وغضب کمال ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے اور انسانی کمزوریوں کو بھی نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا

ہے۔جیسا کہ شیکسپیئر کے قارئین بخوبی واقف ہیں کہ شیکسپیئر نے اپنی کہانیوں کے لئے مواد بہت سے ذرائع سے حاصل کیا ہوتا ہے۔کنگ لیئر کے حوالے سے اس کے چند اہم ماخذ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ Nennius کی تصنیف Historia Brittonum

۲۔ Holinshed کی Chorincles of England سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ

۳۔ Spencer کی Fairy Queen

۴۔ ایک اور گمنام ڈراما نگار ڈراما، The True Chronicle History of King Lear and his three daughters

۵۔ Sydney کی Arcadia

۶۔ Mirror of Magistrates

کئی اور ماخذوں کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے لیکن شیکسپیئر کی ذہنی کشمکش کی پیشکش نے کنگ لیئر کو اس کی طبع زاد تخلیق بنا دیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کہانیاں ہر دور کی ایک جیسی ہی ہوتی ہے واقعات بڑے تسلسل کے ساتھ اپنے آپ کو دوہراتے رہتے ہیں لیکن بات پیش کش کی ہوتی ہے ایک فرد کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہو سکتے ہیں جو دوسرے بہت سے افراد کی زندگیوں میں موجود ہوں لیکن ہر فرد کا دکھ اور خوشی انفرادی ہوتی ہے اسلئے کسی تخلیقی پیش کش کے ماخذوں کی تلاش دلچسپی کا باعث تو ہو سکتی ہے لیکن فطری طور پر اہم نہیں ہوتی۔کنگ لیئر شیکسپیئر کے دوسرے المیہ ڈراموں کے برعکس آغاز ہی میں دل خراش واقعات سے لبریز دکھائی دیتا ہے اور المیے کا آغاز پہلے منظر ہی سے ہو جاتا ہے۔اس میں کلام نہیں کہ شیکسپیئر کے المیہ ڈرامے آغاز ہی سے ایک تناؤ کا شکار ہوتے ہیں لیکن کنگ لیئر میں یہ تناؤ اپنی انتہائی خوف ناک صورت میں پہلے ہی منظر میں نظر آنے لگتا ہے۔

کنگ لیئر کی کہانی بظاہر ایک عام کہانی ہے۔کنگ لیئر برطانیہ کا شہنشاہ ہے جس کی

صرف تین بیٹیاں ہیں کوئی بیٹا نہیں اس کی عمر اسی سال ہو چلی ہے۔لیکن وہ ایک بھرپور زندگی گزار رہا ہے تاہم وہ فیصلہ کرتا ہے کہ سلطنت کو تینوں بیٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ وہ نظم ونسق چلا سکیں اور وہ خود سکون کی زندگی گزارے۔وہ دربار میں موجود ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے ایسا کر لیا ہے لیکن ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں انگڑائی لیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹیاں اسے بتائیں کہ وہ اسے کتنا پیار کرتی ہیں تا کہ اس کے پاس اس کے فیصلے کا کوئی جواز ہو۔پہلے وہ اپنی سب سے بڑی بیٹی گانرل Goneril سے سوال کرتا ہے کہ اسے اس سے کتنا پیار ہے۔بیٹی تعریفوں کے پل باندھ دیتی ہے۔یہی کچھ دوسری بیٹی ریگن کرتی ہے یاد رہے کہ یہ دونوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں جب وہ اپنی تیسری بیٹی کورڈیلیا سے یہ سوال پوچھتا ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور جس سے شادی کیلئے فرانس کا بادشاہ اور برگنڈی کا نواب تیار ہے تو کارڈیلیا حیران ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس سلسلے میں اسے کچھ بھی نہیں کہنا بس اتنا کہنا ہے کہ اس سے وہ اتنا ہی پیار کرتی ہے جس کا جتنا اس کا فرض ہے۔جب اس کی شادی ہو جائے گی تو اس کا آدھا پیار شوہر کے لئے وقف ہو جائے گا یہ سننا تھا کہ لیئر سیخ پا ہو جاتا ہے اور اس کے غیض وغضب کی کوئی انتہا نہیں رہتی، وہ بیک جنبش زباں اسے اس کے حصے سے محروم کر دیتا ہے حالانکہ وہ اسے دونوں بیٹیوں سے زیادہ نوازنا چاہتا تھا اور اپنی باقی زندگی اسی کے ساتھ گزار دینا چاہتا تھا صورت حال کی نزاکت کو دیکھ کر ایک درباری Earl of Kent مزاحم ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی تیسری بیٹی سچی ہے اور باقی دونوں بیٹیاں محض فریب دے رہی ہیں۔

اس بے باکی بلکہ گستاخی پر لیئر کینٹ کو بھی جلاوطن کر دیتا ہے پھر وہ کارڈیلیا کی محبت کے دونوں دعوے داروں کو طلب کرتا ہے اور انہیں تبدیل شدہ صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے۔ڈیوک آف برگنڈی کارڈیلیا کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے مگر فرانس کا بادشاہ اپنی محبت پر قائم رہتا ہے اور اسے ساتھ لے کر رخصت ہوتا ہے ابھی یہ منظر ختم نہیں ہوتا کہ گانرل اور ریگن دونوں آپس میں اپنے باپ کے خلاف سازشیں کرنے لگتی ہیں کیونکہ بادشاہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک

ماہ ایک بیٹی کے ساتھ قیام کرے گا اور ایک ماہ دوسری بیٹی کے ساتھ اور وہ اپنے تصرف میں سو درباری اپنے پاس رکھے گا لیئر صرف گانرل کے پاس ۱۵ دن ہی گزارتا ہے کہ گانرل ناک بھوں چڑھانا شروع کر دیتی ہے لیئر صبر سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے لیکن گانرل اس کے پچاس مصاحبوں سے اسے محروم کر دیتی ہے یہ صورت حال لیئر کو قبول نہیں لیکن اس وقت اس کی بیٹی ریگن بھی وہاں آن پہنچتی ہے وہ اپنی بڑی بہن سے دو قدم اور بھی آگے ہے وہ کہتی ہے کہ اسے ایک مصاحب کی بھی کیا ضرورت ہے لیئر چیختا چلاتا ہے انہیں بد دعائیں دیتا ہے فطرت کو بُرا بھلا کہتا ہے دیوتاؤں کو صدا دیتا ہے محل سے باہر نکل جاتا ہے کوئی اسے روکنے کی کوشش نہیں کرتا اس کے ساتھ اس کا ایک مسخرہ اور ایک دو مصاحب ہوتے ہیں۔

محل سے باہر قیامت کا طوفان ہے ایسا لگتا ہے کہ آج سب کچھ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا زمین شق ہو جائے گی اور آسمان ٹوٹ جائے گا درخت جڑوں سے اکھڑ جائیں گے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا لیکن لیئر ننگے سر اس طوفان کا مقابلہ کر رہا ہے اس کی حالت دیدنی ہے وہ ہمت نہیں ہارتا اس میں غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ قوت طوفانِ باد و باراں کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ اب لیئر میں انسانیت جاگنے لگتی ہے اس کا خمار اتر جاتا ہے اسے اپنے مسخرے کے ساتھ بھی ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اتنے میں ایک درباری اسے ایک جھونپڑی میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور کینٹ لباس بدل کر اس کا ملازم بن چکا ہوتا ہے اور اپنی باتوں سے لیئر کی بیٹیوں کو بھی ناراض کر چکا ہوتا ہے گلوسٹر اس کا ایک اور درباری ہے جو اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

جب یہ اطلاع ریگن کو ملتی ہے تو وہ اپنے شوہر کو بتا دیتی ہے اور اس کا شوہر کارن وال، گلوسٹر کی دونوں آنکھیں نکال دیتا ہے اور اسے گھر سے باہر نکال دیتا ہے ادھر اس کا بیٹا ایڈگر جسے وہ اپنے ناجائز بیٹے اور ایڈمنڈ کی سازش کا شکار ہو کر ناراض کر چکا ہے اور اس کی گرفتاری کا حکم دے چکا ہے، ایک بھکاری کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور اپنے بوڑھے اور نابینا باپ کا سہارا بنتا ہے اسے خودکشی سے بچا لیتا ہے گانرل کا ایک ملازم oswald نمودار ہوتا ہے اور ایڈگر کے ساتھ جھگڑ

پڑتا ہے، ایڈگر اسے قتل کر دیتا ہے اور اس کی جیب سے ایک خط ملتا ہے جس کے مطابق گانرل ایڈمنڈ یعنی گلوسٹر کے ناجائز بیٹے کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے شوہر Albany کو قتل کروا دینا چاہتی ہے جبکہ ریگن جس کے شوہر کو اس کے ملازم نے گلوسٹر کی آنکھیں نکالتے وقت زخمی کر دیا تھا مر چکا ہوتا ہے اور ریگن اپنی نگاہیں ایڈمنڈ پر جما لیتی ہے دونوں کے ساتھ مخلص نہیں جب ایلبنی کو سازش کا پتا چلتا ہے تو صورت حال ہی بدل جاتی ہے گونرل ریگن کو زہر دے دیتی ہے اور خودکشی کر لیتی ہے ادھر بدقسمتی سے کارڈیلیا جب اپنے باپ کو ایک فوج کے ساتھ بچانے کے لئے آتی ہے ایڈمنڈ کے ہاتھوں شکست کھا جاتی ہے ایڈمنڈ اسے پھانسی چڑھا دیتا ہے دریں اثنا ایلبنی کھل کر میدان میں آتا ہے اور ایڈمنڈ بری طرح زخمی ہو جاتا ہے اور بعد میں مر جاتا ہے لیئر کارڈیلیا کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی مر جاتا ہے ایلبنی اور ایڈگر زمامِ حکومت سنبھال لیتے ہیں اور یہ ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔

اس مختصر سی روداد میں سب کچھ بیان کرنا مشکل سہی لیکن ایک حد تک واضح ہو جاتا ہے کہ کنگ لیئر کی پلاٹ کی کنسٹرکشن کیا ہے لیکن یہ ڈراما جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ایک جہانِ رنگا رنگ ہے ایک عالم ہے جس میں ہر رنگ اور ہر روپ موجود ہے ہم دیکھیں گے کہ اس بظاہر سیدھی سادی کہانی کو شیکسپیئر نے لافانی کیسے بنا دیا اور اس میں زندگی کے ہر رنگ اور ہر روپ کو منعکس کیسے کیا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ شیکسپیئر کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے معمولی اور روزمرہ واقعات کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ عالمگیر حقیقتیں بن گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسانی طبیعت کے بارے میں کوئی پیشین گوئی ممکن نہیں، پل میں تولہ پل میں ماشہ، کبھی محبت سے سرشار اور کبھی مجسمہ نفرت۔ نفرت ایسی کہ سب کچھ مٹا دے، مکاری ایسی کہ بے پناہ خلوص و محبت کا سرچشمہ نظر آئے اور سادہ لوحی ایسی کہ جو دل میں ہو زبان پر آئے۔ نتائج چاہے کچھ بھی ہوں ایک طرف خودغرضی ہے تو دوسری طرف ایثار و قربانی ایک طرف بھولا پن ہے تو دوسری طرف بلا کی سازشیں۔ اس طرح پورے ڈرامے میں زندگی جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کیا ہے کتنی بڑی پہیلی

ہے کتنا مشکل معمہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عیاری اور مکاری کے فن پر کس طرح کامیابیوں کے در وا ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکاری سر کے بل گرتی ہے اور پھر سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

ڈرامے کے اختتام پر ہم تہی داماں نہیں ہوتے ہیں ہماری جھولی تجربات سے لبریز ہوتی ہے۔ روح کو کشادگی اور دل کو طمانیت ملتی ہے۔ کبھی کبھی پڑھنے والا دل برداشتہ ضرور ہوتا ہے لیکن پھر جب وہ عزم اور حوصلے کے پہاڑوں کے روبرو ہوتا ہے تو اس کی افسردگی توانائی میں بدل جاتی ہے اور اس کے اپنے چھوٹے چھوٹے غم اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ انگریزی شاعر شیلی نے کہا تھا کہ ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جن میں اداسیاں بھری ہوتی ہیں چونکہ اداسی زندگی کی لازوال حقیقت ہے لیکن یہ اداسی قوت اور توانائی عطا کرتی ہے اضمحلال اور کمزوری پیدا نہیں کرتی ہمیں زندگی سے نبرد آزما ہونا سکھاتی ہے اور ہمارے افسردہ دل، سکون اور اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ کنگ لیئر کے اختتام پر بڑی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں لیکن یہ سب کچھ ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔

اگر ہم کنگ لیئر پر قدرے تفصیلی نگاہ ڈالیں تو ڈرامے کی ہر لائن میں زندگی کا خون دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہر کردار زندگی کا علم بلند کئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ ڈرامے کا پہلا منظر خصوصی اہمیت کا حامل ہے آغاز تو بڑا خوش آئند لگتا ہے۔ جو کردار اسٹیج پر نمودار ہوئے ہیں بڑے ہنستے کھیلتے اور خوش باش دکھائی دیتے ہیں۔ کینٹ اور گلوسسٹر دونوں درباری ہیں اور ایڈمنڈ گلوسسٹر کا ناجائز بیٹا ہے، اپنے بیٹے کا تعارف کرواتے ہوئے گلوسسٹر جس بے باکی کا ثبوت دیتا ہے اس سے اس معاشرے کا کچھ اندازہ ہوتا ہے رؤسا کا یہ معاشرہ بعض گھناؤنی اخلاقی گراوٹوں کو اہمیت ہی نہیں دیتا گلوسسٹر کینٹ کو اپنے بیٹے کی پیدائش کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتا ہے

"Sir this young fellow's mother could; whereupon she grew round-womb'd, and had indeed

sir, a son for her cradle ere she had a husband for her bed-----This knave came something saucily to the world before he was sent for, yet was his mother fair; there was good sport at his making"(S-1, A-1-L-12-22)

عالی جناب! اس نوجوان کی ماں شادی سے پہلے حاملہ ہو گئی اور ایک بچے کو جنم دے دیا یہ لونڈا بڑی دلیری سے دنیا میں وارد ہوا پر اس کی ماں تھی بڑی خوبصورت اور اس عمل میں اسے لطف بھی بڑا آیا؟

ناقدین کا خیال ہے کہ گلوسسٹر کا یہ جسمانی جرم اس کی جسمانی اذیت کا سبب بنتا ہے اور یہی بیٹا ایک سازش کے ذریعے اس کی آنکھیں نکلوا دیتا ہے بہر کیف جب یہ خوش گپیاں جاری ہیں تو وہ شہنشاہ اعظم لیئر اپنے دامادوں کارن وال، ایلبنی اور اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتا ہے اور وہ اپنے فیصلے کا اعلان کرتا ہے۔ جس کے تحت اس نے اپنی سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے اور نوجوانوں کو اپنی یہ ذمہ داریاں سونپ دے۔ ناقدین کی رائے میں شہنشاہ کو اخلاقی طور پر یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں دوسروں کو سونپ دے جبکہ ابھی اس میں فرائض ادا کرنے کی توانائی باقی ہے۔ بہر کیف لیئر فیصلہ کر چکا ہے مگر جانے کہاں سے اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں سے یہ جانے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہیں؟ تاکہ اسے تسلی ہو کہ اس کا فیصلہ درست ہے، اسے لیئر کی سادہ لوحی بھی کہا جا سکتا ہے اور پدرانہ چونچلہ پن بھی جو اسے مہنگا پڑا۔ پھر کیا تھا گونرل اور ریگن نے اس کی بے پناہ تعریفیں کیں۔ مگر تیسری بیٹی کارڈیلیا ایسا نہیں کر پائی، شاید وہ سمجھتی ہے کہ سچی محبت بے آواز ہوتی ہے وہ اپنے ہونے کا نقارہ نہیں بجاتی اور پھر شاید وہ سوچتی ہے کہ محبت کا اس طرح برملا اظہار کرنے والے اور محبت کئے جانے والے کی توہین ہے لیکن اسے کیا خبر کہ اس کا باپ شہنشاہ بھی ہے اور جس نے کبھی کسی معاملے میں انکار سنا ہی نہیں اور اس کے درباری اس کی ہاں میں ہاں

ملاتے۔ کارڈیلیا کہہ دیتی ہے کہ میرے آقا کچھ بھی نہیں یعنی یہ کہ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ اس کچھ بھی نہیں سے لیئر کی انا پر بجلی ٹوٹ پڑتی ہے۔ وہ سیخ پا ہو جاتا ہے پدرانہ شفقت غائب کیونکہ بادشاہ باپ کم اور شہنشاہ زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ کارڈیلیا اپنی بات پر اڑی ہے اور دو بدو جواب دیتی ہے جب لیئر کہتا ہے

So young and so untender? (page,L,105)

تو وہ کہہ اٹھتی ہے

"So young, my lord, and true"

"اتنی جواں سال اور اتنی سر دمہر
کارڈیلیا اتنی چھوٹی میرے آقا اور اتنی سچی"

اس مکالمے سے ماحول انتہائی سنجیدہ ہو جاتا ہے اور لیئر غیض وغضب میں جانے کیا کیا کچھ کہہ اٹھتا ہے اور اپنی سب سے زیادہ لاڈلی بیٹی کو جائیداد سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس کا یہ غیض وغضب اسے کہاں لے جائے گا اور شاید کوئی بھی مطلق العنان بادشاہ کچھ کہتے اور کرتے وقت کبھی نہیں سوچتا۔

لیئر کا یہ غیض وغضب زمین وآسماں کو لرزا دینے والا ہے وہ اپنے درباری کینٹ کی بھی ایک نہیں سنتا اور اس کی ملک بدری کے احکامات صادر کر دیتا ہے، کارڈیلیا کے دونوں چاہنے والوں کو طلب کرتا ہے۔ ایک چاہنے والا نواب آف برگنڈی تو ہتھیار ڈال دیتا ہے اسے تو دولت چاہیے تھی ایک شہزادی چاہیے تھی مگر فرانس کا بادشاہ اسے خوش دلی سے قبول کر لیتا ہے۔

شیکسپیئر اکثر متضاد کردار پیش کرتا ہے تا کہ قارئین کو ہر پہلو کو جانچنے کا صحیح موقع دستیاب ہو، اس صورت حال میں ہیلینی اور ریگارن وال بھی موجود ہیں لیکن کچھ نہیں کہتے۔ بادشاہ کے سامنے کوئی سر پھرا ہی لب کشائی کی جرأت کر سکتا ہے اور کینٹ سر پھرا ہے ایسا سر پھرا ہے کہ جس کا دل اپنے آقا کے لئے محبت سے لبریز ہے اور جو اسے حق بات بتانے میں کوئی خوف محسوس نہیں

کرتا۔ بہر کیف فیصلہ ہو چکتا ہے اور کنگ لیئر سو درباریوں کے ساتھ ماہ بہ ماہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ٹھہرنے کا فیصلہ کرتا ہے لیکن ابھی یہ منظر ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ چاپلوس اور رطب اللسان بیٹیاں ایک نئے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں اور اپنے باپ بادشاہ کے رویے پر سراپا احتجاج بن جاتی ہیں اس لئے نہیں کہ ان کی بہن جائیداد سے محروم ہو گئی ہے بلکہ اس پر تو وہ خوش ہیں کہ اس کا حصہ بھی انہیں ہی مل گیا ہے۔ احتجاج تو اس بات پر ہے کہ اب انہیں اس شخص کو جو اب بادشاہ نہیں شخص رہ گیا ہے کو برداشت کرنا ہو گا وہ چھوٹی سی باہمی مشاورت کے بعد رخصت ہوتی ہیں اور یوں پہلا منظر اختتام پذیر ہوتا ہے جس نے صبح زندگی کو شامِ زندگی میں تبدیل کر دیا ہے، جس نے سچ کو جھوٹ میں اور جھوٹ کو سچ میں تبدیل کر دیا ہے۔ سامعین اور قارئین پر ایک لرزہ طاری ہے اب کیا ہو گا اب کیا ہونے والا ہے اور یہی کیفیت اچھے ڈرامے کی روحِ رواں ہے۔

شیکسپیئر نے اس ماسپاسی کو انفرادی واقعہ نہیں رہنے دیا کہ کوئی اٹھ کر یہ کہہ دے کہ یہ تو ایک گھریلو واقعہ ہے اس میں آفاقیت کہاں چنانچہ اس نے ارسطو کے المیہ کے تصور کے برعکس ثانوی پلاٹ کا تجربہ کیا اور اس میں وہ نہایت کامیاب بھی رہا۔

اس ڈرامے میں جہاں لیئر اپنی دو بیٹیوں کی بے رحمی کا شکار ہوا ہے وہیں ایک اور درباری یعنی Earl of Gloucester جس کا ذکر پہلے منظر میں ہو چکا ہے۔ اپنے ناجائز بیٹے کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہے جس کی پیدائش کے بارے میں وہ پہلے بتا چکا ہے ہماری مراد ہے ایڈمنڈ سے دوسرے منظر کے آغاز ہی میں گلاسٹر کے محل میں ایڈمنڈ ایک خود ساختہ خط کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور یہاں وہ جو خود کلامی کرتا ہے اس سے اس کی سوچ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ سولھویں صدی میں شیکسپیئر نے کس مہارت اور بے باکی سے اس سوچ کا اظہار کیا ہے"

Thou Nature, art my goddess; to thy law My services are baund. wherefore should I stand in the plague of custom, and permit the curiosity of nations

to deprive me, For that I am some tewlve or fourteen moonshines.

Lag of a brother? why basterd? wherefore base? when my dimensions are as well compact, My mind as generous, and my shape as true,

As honest madam's issue? why brand they us with base?

With baseness? bastardy? base, base? Who , in the lusty stealth of nature, take more composition and fierce quality than doth, within a dull,stale, tired bed, go to th'creating a whole tribe of Fops. Got 'tween asleep and wake? (L1-15,A1 S II), Act(1)S-12)

"اے فطرت تو ہی میری دیوی ہے اور میں تیرے ہی قانون کا پابند ہوں تو پھر میں عوام الناس کی مریضانہ ذہنیت کی پرواہ کیوں کروں اور اپنے آپ کو اس حق سے محروم کیوں رکھوں جس کا میں مستحق ہوں میں تو صرف اپنے بھائی سے کوئی بارہ چودہ مہینے چھوٹا ہوں تو یہ لوگ مجھے ناجائز کیوں کہتے ہیں، گھٹیا کیوں کہتے ہیں جبکہ میری شکل وصورت اتنی ہی متناسب ہے اور میری طبیعت میں اتنی ہی فراخی ہے جتنی کہ کسی جائز بیٹے میں ہوتی ہے تو پھر یہ لوگ مجھے کم تر کیوں گردانتے، گھٹیا کیوں کہتے ہیں حالانکہ میری پیدائش تو بڑے ہی زوروں سے ہوتی ہے اس جوش و خروش میں ہمارے اعصاب کی زیادہ تو انا بناوٹ ظہور پذیر ہوتی ہے ان کے مقابلے میں جو باسی ڈھیلے ڈھالے بستر میں پیدا ہوتے ہیں اور احمقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی پیدائش سوتی جاگتی کیفیت کا عمل ہوتی ہے۔"

اس خود کلامی سے ایڈمنڈ کے مزاج اور اس کے نقطۂ نظر کا خوب خوب اندازہ ہو جاتا ہے اور یوں شیکسپیئر ایک مکتبۂ فکر کو اظہار کا موقع دیتا ہے کیونکہ اس کا انداز موضوعی نہیں معروضی ہوتا ہے۔ کسی ایک کردار کی رائے اس سے منسوب نہیں کی جاسکتی یہی وجہ ہے کہ شیکسپیئر کو کردار نگاری میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اسے خدا کے بعد دوسرا بڑا تخلیق کار قرار دیا گیا ہے۔ ایڈمنڈ اپنے خیالات کا اظہار کر کے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جائز یا ناجائز کیا ہوتے ہیں اپنے باپ کی جائیداد پر اسکا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایڈگر کا جو کہ اس کے باپ کا جائز بیٹا ہے چنانچہ وہ تُل گیا ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کرے اور اس نے ایڈگر کی طرف سے ایک خط تحریر کیا ہے جس سے گلوسسٹر غضب ناک ہو جائے گا اور ایڈگر کو جائیداد سے محروم کر دے گا۔

وہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ گلوسسٹر نمودار ہو جاتا ہے وہ بوکھلایا ہوا اور افسردہ ہے اسے کینٹ کی جلاوطنی پر افسوس ہے اور کنگ لیئر کا فیصلہ بھی اس کے لئے پریشانی کا باعث ہے وہ حیران ہے کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا وہ یہ سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ وہ ایڈمنڈ کو ایک خط جیب میں ڈالتے ہوئے دیکھ لیتا ہے چونکہ وہ ہر درجے کا وہمی ہے اس لئے جان کر رہے گا کہ یہ خط کس کا ہے ایڈمنڈ گلوسسٹر کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہے وہ جان بوجھ کر اسے خط دکھانے میں تاخیر کرتا ہے کہ کہیں اس کی بدنیتی کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے اور پھر اس کے اصرار پر اسے خط دکھا دیتا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ بوڑھے لوگ ہماری زندگی کی بہترین خوشیوں والا حصہ ہم سے چھین لیتے ہیں اور ہمیں جائیداد اس وقت دیتے ہیں جب ہم میں لطف اندوزی کی طاقت رہتی ہی نہیں، اس نے ایڈمنڈ کو دعوت دی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے گلوسسٹر توقع کے مطابق سیخ پا ہو جاتا ہے اور فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے جائیداد سے محروم کر دے گا وہ اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیتا ہے اور اسے ملنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا وہ ایڈمنڈ کو اپنا جائز وارث قرار دے دیتا ہے اور اس صورت حال کو سورج اور چاند گرہن سے منسوب کر دیتا ہے اور چلا جاتا ہے اور اب ایڈمنڈ پھولا نہیں سماتا اس کی تدبیر کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اور اسے یہ بھی احساس ہے کہ اس نے اپنے باپ کو

کیسے احمق بنایا ہے بلکہ یہ کہ سادہ لوح لوگ کتنی جلدی احمق بن جاتے ہیں اس کا اظہار اس نے اپنی خود کلامی میں نہایت عمدگی سے کیا ہے۔

" This is excellent foppry of the world, that , when we are sick in fortune, often the surfeits of our own behaviour, we make guilty of our disasters the sun, the moon, and stars; as if we were villains on necessity; fools by heavenly compulsion;knaves, thieves and treacherous, by spherical predominance; drumkards, liars, and adultrers, by an enforc'd obedience of planetary influence; and all that we are evil in , by a divine thrusting on.(page 1078)

"دنیا والوں کی مضحکہ خیز حماقت ملاحظہ ہو جب ہم پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے جو ہماری اپنی بے راہ روی کا نتیجہ ہوتی ہے مگر ہم اپنی تباہی کو سورج اور ستاروں کے نام منڈھ دیتے ہیں گویا ہم تو بد معاش بننے پر مجبور تھے اور ہماری حماقتیں تو آسمان کی دین ہیں ہم بد معاش چور اور سازشی سیاروں کی گردش کے باعث بن جاتے ہیں اور اسی طرح انہی سیاروں کی روشنی کی وجہ سے ہم شرابی دورغ گو اور زانی بن جاتے ہیں اور جتنی برائیاں ہم میں ہیں سب آسمان سے نازل ہوئی ہیں"۔

اندازہ لگایئے کہ ایڈمنڈ کتنا تلخ حقیقت پسند ہے اور کس طرح زمانے کے منہ پر طمانچہ لگاتا ہے جس نے اس کے باپ کے قصور کو اس کے نام لگا دیا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ شیکسپیئر کا یہ کردار انکی کتنی بڑی تخلیق ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سے بڑے گھناؤنے جرائم سرزد ہوئے ہیں لیکن اس کے خیال میں یہ سب کچھ دنیا کی غلط بینی ہے جس نے اسے وہ کچھ بنا دیا ہے جو کچھ وہ بن رہا ہے اور

بنتا جا رہا ہے۔

ابھی وہ بغلیں بجا ہی رہا ہوتا ہے کہ اس کا شکار سادہ لوح اور ناتجربکار ایڈگر نمودار ہو جاتا ہے اور ایڈمنڈ ایک نیا روپ دھار لیتا ہے اور سورج اور چاند گرہن کی باتیں کرنے لگتا ہے تا کہ یہ ثابت کر سکے کہ کس مہارت سے وہ ایڈگر کو بے وقوف بناتا ہے اور یقین دلا دیتا ہے کہ اس کا باپ اس کے سخت خلاف ہو گیا ہے اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے تا کہ اس کی اپنے باپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکے اور وہ اپنی صفائی پیش ہی نہ کر سکے اس کے ضمیر میں کوئی خلش جنم ہی نہیں لیتی اور وہ یہ سب کچھ بڑے غیر جذباتی اور عملی انداز سے کر رہا ہے۔

ادھر تیسرے منظر میں گانرل اور اس کا ملازم آسولڈ اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور گونرل اسے اپنے باپ کنگ لیئر کے ساتھ ناشائستہ سلوک کی ہدایات دیتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ اگر اسے یہاں رہنا منظور نہیں تو وہ میری بہن ریگن کے پاس چلا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کی رائے مجھ سے مختلف نہیں وہ حقارت سے کہتی ہے۔

"Idle old man,

That still would manage those authorities

That he hath given away !!

(A1-Sc III, L-17-18)page 1079)

"بے کار بوڑھا وہ اختیارات اب بھی اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے جن سے وہ دست بردار ہو چکا ہے۔"

گونرل کا انداز انتہائی حقارت آمیز ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ بوڑھے بچوں جیسے ہوتے ہیں اور انہیں قابو میں رکھا جانا چاہیے۔ گونرل کی یہ رائے کہ لیئر جو اختیار دے چکا ہے انہیں استعمال کرتے رہنا چاہتا ہے بڑی اہم ہے اور یہی شاید المیے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ لیئر عملاً اپنے اختیارات سے دست بردار ہو چکا ہے لیکن وہ مزاجاً ایسا نہیں کر سکا۔ المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے مزاج

کے تضاد کو سمجھ نہیں پاتا اور ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بیٹیوں نے ناسپاسی کی حد کر دی ہے لیکن جہاں وہ بے حد بے رحم اور ناسپاس ہیں وہاں کینٹ کا کردار ملاحظہ ہو۔ اسے لیئر نے سچ بولنے پر ملک بدر کر دیا ہے لیکن کینٹ کے دل پر اب بھی لیئر کی حکومت ہے اس نے جس کا نمک کھایا ہے وہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا، اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا، چنانچہ لباس اور آواز بدل کر وہ لیئر کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے اور ملازمت کی درخواست کرتا ہے۔ دریں اثناء اوسولڈ سامنے سے گزرتا ہے اور لیئر کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور آئیں بائیں شائیں کر کے گزر جاتا ہے۔ جب وہ دوبارہ سامنے آتا ہے تو لیئر برانگیختہ ہو جاتا ہے لیکن اوسولڈ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کینٹ کو غصہ آتا ہے اور اسے چت گرا دیتا ہے۔ لیئر کو اس کی یہ ادا پسند آتی ہے اور اسے اپنے مصاحبین میں شامل کر لیتا ہے۔ ادھر ایک مصاحب جو کہ اس کا مسخرہ ہے، اپنے مخصوص انداز میں لیئر پر واضح کرتا ہے کہ صورتحال بدل چکی ہے۔ مسخرے کا کردار بہت اہم ہے شیکسپیئر کے ڈراموں میں مسخرے مختلف کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے کردار سے سامعین اور قارئین بڑے محظوظ ہوتے ہیں اور یوں المیے کی شدت کم ہو جاتی ہے کیونکہ المیے کی شدت کا برقرار رہنا نفسیاتی طور پر سامعین کے لئے مناسب نہیں اگرچہ ارسطو المیہ ڈراموں میں ایسے کرداروں کی اجازت نہیں دیتا لیکن شیکسپیئر کا اپنا ایک طریقہ کار ہے اور وہ زندگی کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ غم اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اس کے طربیہ ڈراموں میں المیہ مناظر اور المیہ ڈراموں میں دل خوش کن مناظر موجود ہوتے ہیں۔

اس منظر میں مسخرے کی گفتگو بڑی دل چسپ ہے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں لیئر کو اس کی حماقت کا احساس دلاتا ہے اور دنیا کی ریت بیان کرتا ہے وہ بتاتا ہے کہ دنیا صرف طاقت کو پوجتی ہے اور کچھ کچھ لیئر کو بھی اس کا اندازہ ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" اب کمان سے تیر نکل چکا ہے اور اس شدید غلطی کا احساس مسخرے کو ہے اور کینٹ کو بھی بلکہ لیئر کو بھی۔

گونرل نمودار ہوتی ہے اور شکایت کرتی ہے کہ اس کے مصاحبین نے ناک میں دم کر دیا ہے اور اس کی دیدہ دلیری پر حیران اور ششدر ہے اور مزے لے لے کر صورتحال کو بیان کرتا ہے اور لیئر کو یوں لگتا ہے جیسے کہ کسی نے اس سے اس کو چھین لیا ہو لیکن اس کی دل آزاری میں گونرل آگے سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اس کی گفتگو بڑی توہین آمیز ہے لیکن لیئر ابھی پر امید ہے۔ اس کی نظریں اپنی دوسری بیٹی ریگن پر ہیں وہ گھوڑے طلب کرتا ہے اور ریگن کے محل میں جانا چاہتا ہے، اسے دکھ ہے کہ اس نے کارڈیلیا کی ذرا سی غلطی کو کتنا بڑا سمجھ لیا تھا، وہ بادشاہ جس کے سامنے کوئی دم بھی نہیں مار سکتا تھا اب توہین اور تضحیک کا نشانہ بن رہا ہے۔ وہ گونرل کو بد دعائیں دیتا ہے اور چلا جاتا ہے لیکن فی الفور لوٹتا ہے اور انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے کہ اس کے پچاس مصاحب اس سے چھین لیئے گئے ہیں۔ گونرل اس سے پوچھے بغیر پچاس مصاحبین کو برطرف کر چکی ہوتی ہے۔ اب لیئر کے غم کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ سین انتہائی دردانگیز ہے حیرت یہ ہے کہ آسمان ماحول میں کیسے کیسے رنگ بدل لیتا ہے۔ رطب اللسان بیٹی اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی بیٹی اپنے آپ کو محبت کا پیکر بتانے والی بیٹی حقارت اور بے رحمی کا مجسمہ بن جاتی ہے اور یوں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کتنی تلخ ہے کتنی بے رحم لیکن اس زندگی میں کینٹ اور مسخرے جیسے وفا کے پیکر بھی ہیں۔

گونرل اپنی بہن کو خط بھی لکھوا دیتی ہے۔ ادھر لیئر بھی گونرل کو ایک خط لکھواتا ہے لیکن مسخرے کا خیال ہے کہ اس کی دوسری بیٹی بھی پہلی بیٹی جیسی ہی ہے مسخرے کے بیانات عقل و دانش سے لبریز ہیں اور وہ زندگی کے ناقابلِ تردید حقائق کی طرف اشارے کرتا ہے اور لیئر کی ذہنی احیاء میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تلخ تجربے لیئر کے دوسرے جنم کا پیش خیمہ بن رہے ہیں، جب اس کی جھوٹی انا جاتی رہے گی اور وہ جان لے گا کہ درباری اور سرکاری زندگی کتنی جھوٹی اور مکارانہ ہوتی ہے۔ ادھر ایڈگر ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اور اپنے ناعاقبت اندیش والد کی حماقتوں کا شکار ہو رہا ہے وہ ایڈمنڈ کے کہنے پر محل سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر ایڈمنڈ اپنے باپ کو یقین دلا دیتا

ہے کہ ایڈگر فرار ہو گیا ہے کیونکہ شاید اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اس کی سازشوں کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔

ادھر گلوسٹر لیئر کے لئے نرم گوشہ رکھتا ہے اور یہ بات ریگن کو معلوم ہو چکی ہے اور بتانے والا ایڈمنڈ ہی ہے جو ایک طرف ایڈگر کا شکار کر رہا ہے اور دوسری طرف گلوسٹر کا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں لیئر ریگن کے محل میں پہنچتا ہے اس کے ساتھ کینٹ بھی ہے جو نہایت صاف گوئی سے کام لیتا ہے۔ اس کی صاف گوئی لیئر کے لئے مصیبتیں پیدا کرتی ہے اور لیئر کو وہاں سے بھی نکلنا پڑتا ہے اب اس کے ساتھ صرف مسخرہ اور کینٹ ہیں طوفانِ باد و باراں انتہائی خوفناک صورتحال اختیار کر چکا ہے لیئر اور ایڈگر دونوں اس طوفان کا مقابلہ کر رہے ہیں لیئر کی حالت دیدنی ہے اور اس سلسلے میں ایک درباری کچھ یوں خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

" Contending with the fretful elements; Bids the wind blow the earth into the sea, swell the curled waters 'bove the main,

that things might change or cease;"(A III, S-1,L.4 Page 1091)

"وہ اذیت ناک عناصر سے برسرِ پیکار ہے اور استدعا کر رہا ہے کہ ہوا زمین کو سمندر میں پھینک دے یا سمندر کا سارا پانی زمین کو ڈبو دے تا کہ صورتِ حال یکسر تبدیل ہو جائے۔"

اگلے منظر میں لیئر کو طوفانوں کے ساتھ نبرد آزما دکھایا جاتا ہے اور جو قیامت اس پر ٹوٹتی ہے اس کا کبھی وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ محلات کی عیش پرستانہ زندگی گزارنے والا شہنشاہ اب محض مسخرے کا مصاحب ہے اور فطرت پر حکمرانی کرنے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ مزاجاً بادشاہ نہ تو اپنی بیٹیوں کے سامنے جھکتا ہے اور نہ ہی شعلہ بار عناصر کے سامنے سپر انداز ہوتا ہے۔ وہ آندھیوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ چلیں، طوفان اپنے غضب میں غلطاں رہیں۔ ہوائیں اپنا کام کریں اسے ان کی کوئی

پرواہ نہیں کیونکہ وہ اس سے پہلے بیٹیوں کی ناسپاسی دیکھ چکا ہے۔ اگر بیٹیوں کو رحم نہیں آیا تو خوفناک عناصرِ فطرت اس پر کہاں رحم کریں گے۔ ایک طرف وہ صدمے کی گہری کیفیت سے دوچار ہے اور دوسری طرف اپنا بھرم بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ برہنہ سر نحیف و نزار، یہ سب کچھ برداشت کرتا جا رہا ہے۔ اس کی بیٹیوں کو سب صورتحال معلوم ہے لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اُسے اپنی کرنی کا پھل ملنا چاہیے کیونکہ ان کے خیال میں وہ بڑا ظالم اور سفاک رہا ہے۔ جس کا ثبوت ان کے پاس نہیں سوائے اسی رویے کے جو اس نے کارڈیلیا اور کینٹ کے ساتھ روا رکھا ہے اور جس پر وہ دل ہی دل میں خوش ہیں۔

کینٹ کو یہ صورتحال دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے وہ اسے ایک جھونپڑی میں لے جانا چاہتا ہے لیکن لیئر پہلی بار بڑی شدت سے اپنے مسخرے کے بارے میں سوچتا ہے شاید اس نے ایسا پہلے کبھی نہ سوچا ہو اب مصیبت نے اس کے دل میں مصیبت زدگان کے لئے ہمدردی پیدا کر دی ہے

My wits begin to turn

Come on my boy.How dost, my boy? Art cold?

I am cold myself where is this straw-

"(Act-3,S.2,line-68Page,1093)

"میرے حواس اڑے جا رہے ہیں آؤ او لڑکے تیرا کیا حال ہے۔ میرے لڑکے تجھے بھی سردی لگی ہو گی۔ مجھے بھی سردی لگی ہوئی ہے وہ تنکا کہاں ہے"

لیئر جھونپڑی کو تنکا کہہ رہا ہے اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بڑا ہوتا ہے اور یہاں وہ کہتا ہے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ بعض اوقات ضرورت کے وقت کتنی معمولی سی شے کتنی اہم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا دل مسخرے کے لئے ملول ہے لیکن مسخرہ اپنا فرض نبھا رہا ہے اور لیئر کو ہنسانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ وہ اس نازک صورتحال سے لیئر کو آگاہ بھی کرنا چاہتا ہے مسخرہ بڑی فلسفیانہ باتیں کرتا ہے۔

ادھر گلوسٹر ایڈمنڈ کو کہتا ہے کہ لیئر کے ساتھ بدسلوکی اچھی بات نہیں اور یہ کہ میں لیئر کا ساتھ دوں گا اور ایڈمنڈ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ گلوسٹر کے ارادے سے کارن وال کو آگاہ کر دے گا اور پھر اس کی چاندی ہی چاندی ہے۔ اگلے منظر میں لیئر کینٹ اور مسخرہ نمودار ہوتے ہیں وہ اس جھونپڑی کے قریب ہیں جہاں لیئر کو ٹھہرنا ہے لیکن لیئر جھونپڑی میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ اسے اگر ذرا سا سکون ملا تو اسے بڑا طوفان آن گھیرے گا۔ وہ طوفان جو اس کی بیٹیوں نے برپا کر رکھا ہے لیئر کی کیفیت دیدنی ہے وہ چیختا ہے چلاتا ہے اور حیران ہے کہ وہ اس سلوک کا مستحق نہ تھا لیکن پھر وہ جھونپڑی میں جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے لیکن پہلے مسخرے سے کہتا ہے کہ وہ اندر جائے مسخرہ اندر جاتا ہے اور کہتا ہے واہ واہ اے قدرت یہاں ایڈگر عریاں بے سہارا دکھوں کی تصویر بنا ہوا موجود ہے۔ اب لیئر کہتا ہے کہ میں نے تو ایسی غربت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا، اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ غربت اور عسرت ہوتی کیا ہے؟ بعض ناقدین کے خیال میں اس منظر میں تین طرح کے ذہنی عارضوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ایک ذہنی عارضہ لیئر کو لاحق ہے۔ دوسرا ایڈگر کو اور تیسرا مسخرے کو۔ مسخرہ تو دل بہلانے کے لئے اور اس مقام پر آگہی کی شمع جلانے کے لئے موجود ہے مگر لیئر کو ناسپاسی نے دیوانہ بنا دیا ہے اور ایڈگر کو سازشوں نے۔ یوں زندگی جانے کس کس انداز سے انسانیت پر حملہ آور ہوتی ہے اور ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شیکسپیئر انسانی مسائل سے کس قدر آگاہ ہے اور انہیں پیش کرنے میں کتنی مہارت رکھتا ہے۔ نصیحت کے انداز میں بات کہہ دینا، وعظ کر دینا ایک الگ بات ہے مگر زندگی کو مجسم صورتوں میں پیش کرنا صرف بڑے فنکار کے لئے ہی ممکن ہوتا ہے۔ دیکھئے اس منظر میں ایک مصیبت زدہ اپنا کردار کس طرح ادا کر رہے ہیں۔ لیئر کم و بیش ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور اس کی کیفیت انتہائی دردانگیز اور عبرت آموز نظر آتی ہے۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایڈمنڈ کا گھٹیا پن بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس کا نشانہ وہ شخص ہے جس نے اس کو جنم دیا ہے کہتے ہیں کہ گلوسٹر نے بدی کو جنم دیا اور وہ بدی خود اس پر حملہ آور ہو رہی ہے اسے منہ کا کھایا ہوا ناک سے اگلنا پڑ رہا ہے لیکن گلوسٹر سراپا بدی نہیں وہ حق کا ساتھ دینا جانتا

ہے اور اسے لیئر کی حالت زار پر رحم آتا ہے۔ گو اس کی آنکھیں نکل جاتی ہیں لیکن اسے اس کا کوئی قلق نہیں اور اس کے سامنے کارن وال کا ایک اپنا غلام اور اس کی اپنی بے انصافی پر اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور اسے وہ زخم لگاتا ہے جو اس کی موت کا سبب بنتا ہے یوں فطرت کا انتقام بھی جاری رہتا ہے یہ انتقام ریگن سے بھی متعلق ہے کیونکہ کارن وال کی وفات کے بعد وہ بیوہ ہو جاتی ہے اور ایڈگر کے دام میں پھنس جاتی ہے۔

یہ صورت حال بڑی گمبھیر ہے۔ ایڈگر کی حالت دیدنی ہے لیکن وہ پھر بھی مطمئن ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اب اس پر جو افتاد پڑی تھی وہ پڑ چکی ہے اس سے بڑھ کر ظلم اس پر کیا ہوگا لیکن عین اس وقت ایڈگر کا باپ گلوسٹر نمودار ہوتا ہے جس کی بینائی چھن چکی ہے اور اسے کوئی ہاتھ پکڑ کر چلا رہا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ایڈگر کے پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی ہے اور اسے سمجھ نہیں آتا کہ وہ زیادہ دکھی ہے یا اس کا باپ۔

"World, world, o warld!

But that thy strange mutations make us hate thee,

Life would not yield to age–

"(Act-IV, Line-10, page 1098-99)

"دنیا، دنیا۔ اے دنیا! تیرے انقلابات دیکھ کر تجھ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ کاش کہ کوئی بوڑھا نہ ہوا اور پھر آگے چل کے ایڈگر کہہ اٹھتا ہے۔"

"O gods! who is't can say

"I am at the worst"?,

I am worse than e'er I was"

"او! دیوتاؤں! کون کہہ سکتا ہے کہ میری حالت بدترین ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری حالت پہلے سے زیادہ دگرگوں ہے"

اسے اپنی وجاہت یاد آرہی ہے جب اس نے یہ کہا تھا کہ اس کی حالت بدترین ہے اس سے زیادہ کیا بدتر ہوگی وہ اپنے باپ کی حالت دیکھ رہا ہے اس کا دل پھٹا جا رہا ہے لیکن وہ اسے نہیں بتا سکتا کہ وہ کون ہے کیونکہ ابھی اس پر اصل صورتحال واضح نہیں ہوئی، اس کے لئے ڈھونگ رچائے رکھنا بہت دشوار ہے لیکن اسے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ گلوسٹر اسے Dover لے جانے کو کہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کی بے ثباتی کا احساس دامن گیر ہے۔ وہ ایڈگر کی حالتِ زار پر پریشان ہے اور اسے اپنا سارا پیسہ دے دیتا ہے جو اسکے پرس میں موجود ہے اور دیوتاؤں سے استدعا کرتا ہے کہ دنیا میں انصاف ہو اور بے حس لوگوں کی حس بیدار ہو جائے تا کہ ہر ایک کو اس کا حصہ مل سکے اور ظلم و زیادتی ختم ہو جائے۔ گلوسٹر یہ بھی جان چکا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے ایڈگر کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ اسے اس بدلی ہوئی کیفیت میں نہیں پہچان پاتا۔

ادھر گونرل بھی ایڈمنڈ کی محبت جیت لینا چاہتی ہے اور اپنے شوہر کے خلاف ہو گئی ہے لیکن ایڈمنڈ کسی سے بھی مخلص نہیں۔ گونرل اپنے شوہر ایلبنی سے جھگڑ پڑتی ہے اتنے میں ایک پیامی پہنچتا ہے اور ایلبنی کو بتاتا ہے کہ کارن وال مر چکا ہے (جس نے غیض میں آ کر گلوسٹر کی آنکھوں کو کچل دیا تھا) اور سارے واقعات سے اسے آگاہ کرتا ہے اس پر ایلبنی کہتا ہے کہ کوئی اوپر موجود ہے تبھی تو برے کو اس کی سزا مل رہی ہے۔ ایک پیامی ایلبنی کو ریگن کا خط پہنچاتا ہے جس میں وہ اسے فوجوں کو مجتمع کرنے کو کہتی ہے کیونکہ خبر ہے کہ فرانس کا بادشاہ اور کارڈیلیا لیئر کی حمایت کے لئے پہنچ گئے ہیں۔

بادشاہ کو تو کوئی کام ہے اس لئے واپس چلا گیا ہے لیکن کارڈیلیا ابھی موجود ہے اور وہ اپنے باپ کو اپنی بہنوں کی زیادتیوں سے نجات دلانا چاہتی ہے۔ بعد ازاں گلوسٹر ایڈگر کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور ایڈگر اسے باور کراتا ہے کہ وہ Dover کی چوٹی پر پہنچ گئے ہیں۔ لیکن گلوسٹر کو لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہے لیکن پھر وہ مان ہی لیتا ہے اور وہاں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنا چاہتا ہے وہ اپنے تئیں چھلانگ لگا دیتا ہے لیکن ایڈگر ایک کسان کے لباس میں اس کے سامنے پہنچ جاتا ہے

اور کہتا ہے کہ وہ بڑی بلندی سے گرا ہے بلکہ بڑی حد تک کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر کنگ لیئر ظاہر ہوتا ہے جس نے عجیب و غریب کپڑے پہنے ہیں اور ہاتھوں میں پھول لیئے ہوئے ہے ایڈگر اسے دیکھ کر اور بھی زیادہ پریشان ہوتا ہے اور گلاسٹر بھی دکھ کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس دیوانگی کے عالم میں لیئر جو کچھ کہتا ہے وہ انتہائی اہم ہے اور اشتراکی طرزِ فکر کا پتا دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ دیکھو منصف چور کو ڈانٹ رہا ہے حالانکہ وہ خود بھی چور ہے لیئر کہتا ہے کہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک کسان کا کتا بھکاری کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ ویسے نہیں بھونکتا یہ وہ دنیا ہے کہ اگر کتے کو کرسی پر بٹھا دیا جائے تو لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک بدمعاش ایک طوائف کو کوڑے لگا رہا ہے لیکن دل ہی دل میں للچا بھی رہا ہے کاش کہ وہ اس کے ہاتھ لگ جاتے ۔۔۔۔۔ سود خور، دھوکے باز کو سزا دیتا ہے، دیکھو تو سہی جن کے پھٹے پرانے کپڑے ہیں ان کے گناہ باہر جھانکتے ہیں اور جنہوں نے اطلس و کمخواب پہن رکھی ہیں انہیں کا کوئی گناہ کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔ لیئر کے یہ الفاظ ٹوٹے پھوٹے ہیں، بے ترتیب ہیں، لیکن کتنے سچے ہیں۔ یہ سچ اس نے زندگی کو غموں کے الاؤ میں ڈال کر سیکھا ہے۔ لیئر پاگل پن میں کبھی اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھ لیتا ہے اور کبھی مجبور، اور کبھی منصف بن بیٹھتا ہے اور اپنی بیٹیوں کو حاضرِ عدالت کرتا ہے۔

شیکسپیئر نے جس خوبصورتی سے لیئر کی دیوانگی کا ذکر کیا ہے اس سے اس کی ژرف نگاہی کا پتا چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی ذہن کا کتنا بڑا نباض ہے اور دیوانگی کی کتنی عمدہ تصویر کشی کر سکتا ہے۔ لیئر دوڑ رہا ہے اور غائب ہو جاتا ہے اتنے میں گونرل کا ملازم اوسولڈ ظاہر ہوتا ہے اور وہ ایڈگر کو پہچان لیتا ہے لیکن ایڈگر اسے مار دیتا ہے اور اس کی جیب سے ایک خط برآمد ہوتا ہے جو گونرل نے ایڈمنڈ کو لکھا ہے اور جس میں اس نے ایڈمنڈ کو ہدایت کی ہے کہ وہ ایلبنی کو قتل کر دے، وہ خط میں اپنے آپ کو اس (ایڈمنڈ) کی بیوی لکھتی ہے۔ اخلاقی زوال اور انحطاط کی تصویر جس انداز سے شیکسپیئر نے پیش کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ برائی کتنی نفرت انگیز ہوتی ہے بہر حال

یہ خط ایڈگر کے لئے بہت اہم ہے۔

حالات بڑی جلدی سے تبدیل ہو رہے ہیں اور ایک منظر میں لیئر کو بستر پر سویا ہوا دکھلایا جاتا ہے جبکہ اسکے ساتھ ہی موسیقی بج رہی ہے کیونکہ ڈاکٹر کی یہی ہدایت ہے، موسیقی کے مثبت اثرات کے حوالے سے شیکسپیئر کا یہ انداز جدید نفسیاتی تحقیق کے لیئے راہ ہموار کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ شیکسپیئر زندگی کی بنیادی اور آفاقی حقیقتوں سے کس قدر واقف تھا۔

اس سین میں کارڈیلیا اور کینٹ محوِ گفتگو ہیں جہاں فرانسیسی فوجوں نے پڑاؤ ڈالا ہے۔ کارڈیلیا کو انتہائی نرم دل اور بنیادی انسانی جذبات کے پیکر کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے وہ لیئر جس نے اسے انتہائی حقارت سے جائیداد سے محروم کر دیا تھا اب اسی کے پیار کی آغوش میں ہے۔ کارڈیلیا ڈاکٹر سے بڑی دل سوزی کے ساتھ محوِ گفتگو ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا باپ جلد از جلد اچھا ہو جائے وہ اس کے سارے غم سمیٹ لینا چاہتی ہے اور اسے سکون دینا چاہتی ہے۔ لیئر آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا ہے اور کارڈیلیا انتہائی پیار سے اس سے مخاطب ہے اور اسے افسوس ہے کہ اس کی بہنوں نے اس سے اتنی بدسلوکی کی ہے۔

یہاں اس کی گفتگو انتہائی دل کو چھو لینے والی ہے اور شیکسپیئر کا یہ کمال ہے کہ انسانی جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ لیئر ہوش میں آتے ہی کارڈیلیا کے سامنے جھک جاتا ہے اور اسے اپنی حماقتوں کا احساس پریشان کئے ہوئے ہے۔ وہ ندامت اور پریشان حالی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں، وہ اسے کہتا ہے کہ وہ اسے زہر پلا دے کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے۔ کارڈیلیا ایک محبت کا پیکر ہے وہ انسانی کمزوریوں کو جانتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ باپ کی محبت کیا ہوتی ہے اور اولاد کی محبت کیسی ہونی چاہیے وہ اپنے باپ کے لئے سب کچھ تج دینا چاہتی ہے لیکن ادھر ایڈمنڈ ریگن اور گونرل نے ایک فوج جمع کر لی ہے اور ایڈمنڈ اپنے آپ کو معتبر سمجھنے لگا ہے لیکن ایلبنی صورتِ حال کا جائزہ لے رہا ہے، اتنے میں ایڈگر ایلبنی کو وہ خط پیش کرتا ہے جو اس نے اوسوالڈ کی جیب سے نکالا تھا اور یوں سب صورتِ حال اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ فوجیں ایک

دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہیں اور جنگ ہونے والی ہے جنگ لمحوں میں برپا ہو جاتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ کارڈیلیا کو شکست ہوئی ہے۔ لیئر اور کارڈیلیا کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ جب ایڈگر یہ خبر گلاسٹر کو دیتا ہے تو اس کی افسردگی اتنی بڑھتی ہے کہ وہ پھر خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ اس پر ایڈگر اسے کہتا ہے

What, in ill thoughts again? men must endure
Their going hence,even as their coming hither:
Ripeness is all"(Act 5, S-II, Line -9 page 1108)

"کیا پھر وہی بدخیالی کا انسانوں کو مرنا بھی اسی طرح قبول کر لینا چاہیے جیسا انہوں نے جینا قبول کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو پھلنے پھولنے کی ہوتی ہے"

یعنی جینا مرنا تو ناگزیر ہے۔ ہمیں ہنس کر ہر صورتِ حال قبول کر لینی چاہیے، بس یہی ہمارا فرض ہے۔

ایڈگر کی طرح کارڈیلیا بھی زندگی کی سفیر ہے، وہ ہتھیار گرانا نہیں چاہتی اور جانتی ہے کہ فتح و شکست زندگی کا ناگزیر حصہ ہیں اور ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہوتا آیا ہے کہ نیکی کو بھی شکست ہوتی رہی ہے، اس کے ذہن میں عیسیٰ کا صلیب پر چڑھایا جانا ہو سکتا ہے اور ہم حضرتِ حسینؓ کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیکی کی شکست بھی شکست نہیں ہوتی کیونکہ نیک لوگ دلوں پر حکومت کرتے رہتے ہیں ان کے اعمال چاند ستاروں کی طرح دمکتے رہتے ہیں جبکہ برائی کی فتح روسیاہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کارڈیلیا کو شکست ہو چکی ہے وہ اور کنگ لیئر گرفتار کر لئے گئے ہیں اور کارڈیلیا کہتی ہے۔

We are not the first
Who with best meaning have incurr'd the worst

(Act-5,S-3, Line-3, page-1108)

''ہم دنیا میں پہلے نہیں جنہیں نیک ارادوں کے باوجود بدترین حالات سے دوچار ہونا پڑا ہو''۔ یہاں لیئر کی سپردگی دیدنی ہے اس کی نخوت ماضی کا قصہ بن چکی ہے اس پر اپنی حقیقت آشکار ہو چکی ہے وہ تجربات کی بھٹی سے گزر کر کندن بن چکا ہے۔ آتشِ زندگی نے اس کی جھوٹی انا کو راکھ کر دیا ہے اب بادشاہت کا نشہ باقی نہیں رہا وہ جیل میں خوشی خوشی جانے کے لئے تیار ہے، کیا یہ کم ہے کہ ممتا کی پیکر اس کی بیٹی اس کے ساتھ ہوگی جس نے اس کے لئے سلطنت تک تج دی ہے اب شوہر تک بھی یاد نہیں۔ لیئر پھولا نہیں سماتا وہ اس کے سامنے جھک سکتا ہے اس سے معافی مانگ سکتا ہے اور قصے کہانیاں سنا کر زندگی گزار سکتا ہے۔

ادھر ایڈمنڈ کینٹ کے ذریعے کارڈیلیا کے قتل بلکہ شاید لیئر کے قتل کا بھی پروگرام بنا چکا ہے لیکن اتنے میں ایلبنی نمودار ہوتا ہے اس کے ساتھ گونرل بھی ہے اور ریگن بھی اور اس پر حقیقتِ حال منکشف بھی ہو چکی ہے۔ ایڈمنڈ اس کی نظروں میں گر چکا ہے، گونرل اور ریگن دونوں اسے اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھانے کیلئے بے تاب ہیں لیکن حالات کسی اور طرف گامزن ہیں، گونرل کو بھی پتا چل گیا ہے کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے ایلبنی ایڈگر کو بلاتا ہے اور اسی وقت ریگن پکار اٹھتی ہے کہ وہ مر رہی ہے، گونرل خوش ہے کہ اس کا زہر کام کر رہا ہے لیکن گونرل تو بے راہ روی کا زہر خود بھی پی چکی ہے۔ دونوں بہنیں موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ ایڈگر ایڈمنڈ پر فتح یاب ہوتا ہے اور ایڈمنڈ آخری سانس لے رہا ہے اب اس میں کچھ انسانیت جاگی ہے اور وہ سب کچھ اگل دیتا ہے۔ گونرل، ریگن اور ایڈمنڈ کو موت نگل لیتی ہے مگر موت اچھے بُرے میں امتیاز نہیں کرتی لیئر مردہ کارڈیلیا کو ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے پکار رہا ہے۔ چیخ رہا ہے اور بے بسی کی تصویر بنا ہے۔

"Howl, howl, howl, howl! O, you are men of stones!
Had I your tongue and eyes, I'd use them so
That heaven's valult Should crack,

"(Act-5, S-3,Line-257 page1112)

''دہائی ہے دہائی ہے دہائی تم سب پتھر کے بنے ہوئے ہو، کاش کہ میری زبان تم جیسی ہوتی اور تمہاری آنکھوں جیسی آنکھ میرے پاس ہوتی میں ان کے ذریعے آسمان کو ریزہ ریزہ کر دیتا''

کینٹ غم سے نڈھال گھٹنوں کے بل جھک جاتا ہے۔ لیئر کو کسی کی کچھ خبر نہیں ہے اسے تو اپنی لاڈلی کی موت کھائے جا رہی ہے وہ لحہ بہ لحہ مر رہا ہے''

And my poor fool is hang'd! No , no , no life!
Why should a dog, a horse, a rat have life,
And thou no breath at all? thou'lt come no more,
Never, never, never, never, never.
Pray you undo this button, thank you, sir,
Do you see this ? Look on her, look, her lips
Look there, look there!

''میری معصوم سی بچی پھانسی پر چڑھا دی گئی نہیں نہیں نہیں نہیں کوئی زندگی نہیں ایک کتے، ایک گھوڑے اور ایک چوہے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ زندہ رہے جبکہ تو نہ ہو تو کبھی نہیں آئے گی، کبھی نہیں، کبھی نہیں کبھی نہیں کبھی نہیں، خدا کے لئے یہ بٹن کھول دو بہت شکریہ۔ کیا تم دیکھتے ہو اس کی طرف دیکھو، اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھو، وہاں دیکھو وہاں دیکھو''۔

وہ ڈھیر ہو جاتا ہے؟ کون کہتا ہے وہ ڈھیر ہو جاتا ہے زندگی کو جاری رہنا ہے اس کی مٹی سے ایڈگر جنم لے رہا ہے۔ ایلبنی جنم لے رہا ہے۔ جو نظامِ سلطنت چلائیں گے کینٹ کو تو لیئر کے پیچھے دوڑ جانا ہے اور وہ دوڑ گیا ہے۔

یوں یہ بہت بڑا المیہ اختتام پذیر ہوتا ہے کتنی آنکھوں کو نم کر دیتا ہے، کتنے دلوں کو سوگوار

لیکن اس غمی اور سوگواری سے زندگی جنم لیتی ہے موت نہیں۔ موت تو ایک ماندگی کا وقفہ ہے اور کیا ہے۔ زندگی رواں دواں رہتی ہے شیکسپیئر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے اور ہمیں واقف کرانا چاہتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ کبھی کبھی لگتا ہے کہ

اتنی بڑی سزا ہے ذرا سے گناہ کی

اور یہ بات لیئر ایک جگہ کہتا ہے کہ میں نے غلطیاں کم کی ہیں لیکن مجھے ان کی سزا بڑی کڑی ملی ہے، خود انگریزی نقاد بریڈ لے کا خیال ہے کہ لیئر کے ساتھ ہمدردی اس لئے بھی ہو جاتی ہے کہ اس نے ڈرامے کے صرف پہلے منظر میں بے اعتدالی کا ثبوت دیا ہے اور زیادہ سے زیادہ پہلا ایکٹ کہہ لیجئے اور پھر اس پر آفات ہی ٹوٹتی رہتی ہیں اور پھر اس کا نیا جنم انتہائی بڑا ہے وہ ایک منکسر المزاج، معتدل اور پیار کرنے والا بن جاتا ہے لیکن اس کے لئے اسے آگ اور خون کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے۔

شیکسپیئر کے ہیرو زندگی سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور ان کے رویوں میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ زندگی ایسے طمانچے لگاتی ہے کہ دماغ سیدھا ہو جاتا ہے، میکبتھ کا دماغ بھی سیدھا ہوا کچھ ہیملٹ کا بھی اور اوتھیلو کا بھی مگر لیئر کے دماغ میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ بہت شدید ہے اور بہت فطری بھی۔ درباریوں کی رطب اللسانی اور چاپلوسی اس سے اعلیٰ انسانی اوصاف چھین لیتی ہے لیکن دریائے زندگی کی موجیں اس میں ایک ایسی تبدیلی لاتی ہیں کہ وہ دھلا دھلایا اور صاف ستھرا بچے کی طرح معصوم نظر آتا ہے۔ یوں اس المیہ ڈرامے میں الم ہی الم ہے دکھ ہی دکھ ہے وہ لوگ جو عیش و طرب میں کھوئے ہوئے ہیں ان کے عیش کے دن بھی بڑے محدود ہیں ایڈمنڈ کی ساری شاطرانہ چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور وہ سر کے بل زمین پر گرتا ہے اور پیوند زمین ہو جاتا ہے، ریگن اور گونرل اپنی کرنی کا پھل بھگتتی ہیں انہیں ایک لحہ بھی سکون کا حاصل نہیں ہوتا ہے۔

مانا کہ کنگ لیئر میں برائی فاتح نظر آتی ہے لیکن اگر ایڈمنڈ، گونرل اور ریگن کے انجام پر نظر ڈالیں تو یہ کامیابی اور فتح گناؤ بے لذت دکھائی دیتی ہے۔ گلاسٹر کی عزت کے چند لمحات مہنگے پڑتے ہیں اور اس کی نیک دلی بھی اسے دکھوں سے نہیں بچا سکتی۔

لیکن یہ سب کردار زندگی کا آئینہ ہیں ہم کنگ لیئر میں زندگی کو نہایت قریب سے دیکھتے ہیں جو ہم میں ہماری فکر میں بڑی گہری اور مثبت تبدیلی واضح ہوتی ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ جذباتی نقطہ نظر تباہی کا باعث ہوتا ہے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کا راستہ بڑا ہی مشکل راستہ ہوتا ہے لیکن یہی راستہ درست راستہ بھی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غم جزوِ زندگی ہے اور بہترین طرزِ عمل یہ ہے کہ زندگی کے غموں کو بھی قابلِ برداشت بنایا جائے اور زندگی کا بوجھ بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اٹھایا جائے۔ زندگی کبھی کھلونا تھی نہ ہوگی یہ تو میدانِ عمل ہے جس میں مکافاتِ عمل بھی ہے اور لذتِ عمل بھی راحتِ فکر بھی ہے اور بیش قیمت تجربہ بھی۔ یہ وہ تجربہ ہے جو آنکھوں کو نور اور دل کو سرور عطا کرتا ہے مضمحل قویٰ کو توانا بناتا ہے۔ دست و پا کو قوت دیتا ہے اور ذہن کو صلابت عطا کرتا ہے۔ یہ کوئی پند نامہ نہیں اور نہ ہی کوئی تمثیلی ڈرامہ ہے بلکہ زندگی کا کھرا اور سچا اظہار ہے۔

اس ڈرامے میں شیکسپیئر کا اسلوب نگارش بہت ہی اثر انگیز ہے۔ کہیں کہیں خطابت اور جذبات نگاری ضرور ہے کچھ تو یہ صورتحال کا تقاضا ہے اور کچھ سولہویں صدی کے ناظرین کی خواہش کا احترام لیکن شیکسپیئر میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ لفظوں کا حسنِ استعمال جانتا ہے، استعاروں کو خوبصورتی سے برت لیتا ہے، فطرت کی خوفناکی کی تصویریں اس ڈرامے کا طرۂ امتیاز ہیں۔

بے شک شیکسپیئر زبان کے حوالے سے بہت سی غلطیوں کا مرتکب بھی ہوا ہے لیکن مجموعی تاثر نہایت خوش گوار ہے ڈرامے کو جتنی بار مرضی پڑھیے غالب کی غزلوں اور خیام کی رباعیوں کی طرح کبھی کشش کم نہیں ہوتی کیونکہ یہ ڈراما ہماری زندگیوں کا اپنا ڈراما ہے اور ہم خود اس کا حصہ بن جاتے ہیں یوں ادبِ عالیہ ہمیں اطلاعات فراہم نہیں کرتا نہ ہدایات دیتا ہے بلکہ ہمیں وہ تجربہ عطا

کرتا ہے جو ہمارے دلوں کی دھڑکن اور خون کی گردش میں شامل ہو جاتا ہے یہ وصف کنگ لیئر میں بدرجہ اتم موجود ہے اس کے بارے میں حرفِ اول کہنے کی کوشش کی گئی ہے حرفِ ثانی کی جسارت نہیں کی گئی اور حرفِ آخر شاید کبھی کوئی بھی نہ کہہ سکے۔

☆☆☆☆

پنجابی مضامین

ولیم شیکسپیئر

ڈرامہ ساڈی رگاں وچ لہو وانگر گردش کردا اے۔ تے انسانی فطرت اچ ازلاں توں موجود اے۔ بچہ جو کجھ ویکھدا اے اوہدی نقل کردا اے۔ تے نقل نوں ای حیاتی سمجھدا اے۔ یونانی نقاد ارسطو نے آکھیا سی ڈرامہ حیاتی دی نقل اے، برصغیر پاک و ہند وچ ڈرامہ کجھ زیادہ ترقی نہیں کر سکیا۔ کالی داس ہوراں دا سنسکرتی ڈرامیاں وچ بڑا ناں اے۔ تے اردو اچ آغا حشر تے امتیاز علی تاج سرکڈھویں تے مشہور ڈرامہ نگار ہوئے نیں۔ بعد اچ ٹی۔وی ڈرامے نیں وی اپنی عظمت دے جھنڈے گاڑ چھڈے۔

دنیا وچ بہت گھٹ ڈرامہ نگار ایہو جہے ہوئے نیں۔ جہناں نوں کدی وی نظر انداز نہیں کیتا جا سکے گا۔ جہناں وچ یونان دے Aeschylus(ایس کے لس)، Sophocles(سوفوکلیز) تے Europedes(یوروپڈیز) ہے سن۔ تے انگریزی دا اکو ای ناں شیکسپیئر۔ انگلستان دی دھرتی تے شیکسپیئر دے قد کاٹھ جیہا کوئی ڈرامہ نگار نہ اوس توں پہلاں سی نہ اوس توں بعد ہون جوگا ہویا اے، ورجناں ڈرامہ نگار ہوئے نیں پر کوئی وی شیکسپیئر دے نیڑے تیڑے نہیں پہنچ سکیا۔ پڑھن والیاں نوں ایہہ سن کے حیرت ہوئے گی کہ ایہہ فنکار بہتا پڑھیا لکھیا نہیں سی بس کجھ اک سال ای سکول وچ پڑھیا تے لاطینی تے انگریزی سکھی، پر ایہنے اپنے 37 ڈرامے لکھ کے ڈرامے دی دنیا اچ اپنے آپ نوں امر کر لیا۔ انیویں صدی دے اک دانشور کارل لائل نے آکھیا سی کہ دنیا بھر وچ ساڈیاں ساریاں نوآبادیاں توں زیادہ مقبول شیکسپیئر نے بنایا، تے ایسا ای صدی دے چوٹی دے نقاد میتھیو آرنلڈ نے آکھیا سی "کہ اسی ہر اک دے اتے انگلی چک سکدے آں پر شیکسپیئر تے نہیں"۔ "All abide our questions but thou art free". نقاداں دا ایس گل اُتے اتفاق اے کہ "رب توں بعد سب توں وڈا تخلیق کار شیکسپیئر ہویا اے" "Next to God created he"۔ پر ایہہ گل وی

دلچسپیوں خالی نہیں کہ ایہو جہے نقاداں دی کمی وی نہیں جیہڑے سرے توں شیکسپیئر دے وجود نوں ای نہیں مندے، اُنہاں دا خیال اے کہ جنہوں اسی شیکسپیئر آکھدے آں ایہو جیہا کوئی بندہ سولہویں ستارھویں صدی وچ انگلستان وچ ہے ای نہیں سی، تے جیہڑے ڈرامے اوہدے کھاتے لکھے جاندے نیں او اوسے زمانے دے لکھاری فرانسس بیکن یا کسے ہور دے ہو سکدے نیں، پر ادب دیاں ساریاں تریخاں من دیاں نیں کہ ولیم شیکسپیئر 23 اپریل 1564ء سٹریٹفورڈ۔اپون۔ایوان (انگلینڈ) (Stratford-upon-Avon,England) وچ پیدا ہویا۔ او اک خوشحال تاجر دا پتر سی جیہڑا ایس شہر دا میئر وی رہ چکیا سی۔ ایہہ وی دسیا جاندا اے کہ شیکسپیئر دے والد نیں اوہنوں شہر دے گرائمر سکول وچ داخلہ دوایا جیہڑا مشہور سکول سی، تے اوتھے اوہنے لاطینی تے ریاضی سکھی تے کجھ ای سالاں بعد گھریلو مشکلاں واروں اوہنوں سکول چھڈنا پیا، اُس ویلے اوہدی عمر چودہ ورھے سی، فیر اوہ کیہ کجھ کردا رہیا، ایہہ وی کسے نوں پتا معلوم نہیں، اوہ اجے 19 وریاں دا سی تے اوہنے اپنے توں اٹھ (۸) ورھے وڈی کڑی نال ویاہ کر لیا جیہڑی بڑی امیر کبیر سی، پر ایہہ ویاہ کوئی بہتا کامیاب نہ ہویا، تے شیکسپیئر نوں ڈاھڈا اوکھا کیتا اوہدے تن (۳) بچے پیدا ہوئے پر اوہ خوش نہ رہ سکیا، اجے اوہدی عمر کوئی 23 ورھے سی کہ اوہنوں ہرن دی چوری باجھوں اپنے شہر توں نسنا پے گیا، او لندن جا پہنچیا جتھے ڈرامے نوں بڑی اہمیت حاصل سی تے اوہنے وی اداکاری شروع کر دتی تے نال نال ڈرامے وی لکھنے شروع کر دتے، تے وڈھیرا ناں کمایا، بڑا ای مشہور ہو گیا۔ اوہدے ڈرامے کمال دے ڈرامے سن لوکاں دے دلاں دی دھڑکن بن گئے تے چار چفیرے اوہدی بلے بلے ہو گئی دولت وی ہتھ لگی تے شہرت وی۔ لندن دے دو تھیٹراں The Globe تے Black Friars دا حصے دار وی بن گیا۔ لندن تے سٹریٹفورڈ وچ بڑی جائیداد بنا لئی، فیر اوہ 1608ء وچ سٹریٹفورڈ دوبارہ جا وسیا، تے 3۔اپریل 1616 وچ وفات پا گیا۔

شیکسپیئر نے 154 (Sonnets) سونٹاں لکھیاں تے 37 ڈرامے تے دو ہور

منظوم ڈرامے وی لکھے۔ حیرت دی گل ایہہ سی کہ ڈرامے وچ اوہنے نویاں راہواں کڈھیاں۔ تے اپنے زمانے دے سرکڈھویں ڈرامہ نگاراں مارلو تے بن جانسن نوں پچھے بہت ای پچھے چھڈ گیا۔ پڑھے لکھے تے ان پڑھ سارے ای اوہدے ڈرامیاں تے مرن مٹن لگ پئے، اوہنے اوہ شہرت پائی جیہڑی کسے نوں وی حاصل نہیں ہوئی۔ اوہدے سنجیدہ ڈرامے تے مزاحیہ ڈرامے ایڈے مشہور ہوئے کہ ایس توں پہلاں کسے دے وی نہیں ہوئے سن۔ جد کہ ایہہ گل ناممکن سی کہ کوئی غمناک ڈرامے وی لکھ لوے تے مزاحیہ وی۔ تے مزاحیہ ڈرامیاں وچ وی درد دا رنگ ہووے۔ تے دردوں بھرے ڈرامیاں وچ وی خوشی دی لہر موجاں ماردی وکھائی دیوے۔ پر ایہہ معجزہ شیکسپیئر نے کر دکھایا تے اوہ ای کر سکدا سی۔ اوہدے المیہ ڈرامے تے دنیا وچ ایڈے مشہور ہوئے کہ اج وی اوہ ساڈے تعلیمی نصاباں دا حصہ نیں تے ساری دنیا وچ پڑھے پڑھائے تے سٹیج تے پیش کیتے جاندے نیں۔ اوہدے چار المیہ ڈرامیاں وچ کنگ لیئر، ہیملٹ، اتھیلو تے میکبتھ جنہاں نے جاجا تے دھماں پائیاں ہوئیاں نیں تے اوہدے طربیہ ڈرامے Twelfth Night، As you like it، تے Much ado about nothing، اپنی مثال آپ نیں۔ اوہنے تاریخی ڈرامے وی لکھے تے کمال کر چھڈیا۔ اوہدے ڈرامیاں وچ پوری دنیا دی کہانی موجود اے۔ ساڈے سارے عیب دی تصویر کھچی گئی اے، ساڈے دل دی آواز تے روح دی پکار ایہناں وچ صاف صاف سنائی دیندی اے۔ شیکسپیئر اک معجزہ سی، اوہ کیہڑا راز سن جنہاں اوہنوں معجزہ بنایا اوہناں نوں جاننا دلچسپی توں خالی نہیں۔ سب توں پہلی خوبی ایہہ اے ہے کہ شیکسپیئر گوشت پوست دے جیوندے جاگدے کردار اینج پیش کردا اے جیویں اوہ ساڈے نال رہندے وسدے ہون بالکل ساڈے اپنے ورگے، ہسدے کھیڈدے، روندے رواندے، سوچدے تے عمل کردے۔ A.C Bradley (اے۔سی بریڈلے) نے اوہدی اس صفت نوں نویکلی صفت قرار دتا اے تے اوہ سمجھدا اے کہ کردار نگاری وچ شیکسپیئر دا کوئی مقابلہ نہیں کر سکدا۔ تے اوہدے ڈرامیاں نوں پڑھ کے ایہو ای جاپدا اے کہ اوہ انسانی نفسیات توں اینا واقف سی جنے شاید سگمنڈ

فرائڈ، ایڈلر تے یونگ وی نہ ہو سکن۔ کیونکہ اوہ اپنے کرداراں دے اندر وسدا سی انہاں دی روح تے دل توں پوری طراں واقف سی۔ ڈاکٹر جانسن ہوراں نے اٹھارہویں صدی وچ اوہدی کردار نگاری تے نکتہ چینی کیتی سی تے اوہدا خیال سی کہ اوہدے کرداراں وچ اک دور رنگ ای موجود ہن۔ پر بعد دے نقاداں نے جانسن نال اتفاق نہیں کیتا، ویہویں (۲۰) صدی دے پرکھ پڑچولی کجھ جانسن دے ہم خیال جاپدے نیں پر ساڈے خیال اچ شیکسپیئر دے کردار اپنی مثال آپ نیں تے اوہ حیاتی دے ہر شعبے نال تعلق رکھدے نیں اے رنگا رنگی کسے ہور ڈرامہ نگار وچ موجود نہیں۔ زنانیاں دے کردار تے ہور وی زیادہ کامیابی نال پیش کیتے گئے نیں۔ نو سال توں پنجاہ سٹھ سال تک دیاں عورتاں دے کردار جس کامیابی نال شیکسپیئر نے پیش کیتے نیں اوہ اوہدا ای حصہ اے۔ اوہنے زنانیاں نوں جیوندیاں جاگدیاں تے متحرک وکھایا اے۔ اینا متحرک کہ اوہ ساڈی صدی دیاں تیز طرار تے ہشیار زنانیاں جاپدیاں تے مرداوہناں دے مقابلے وچ بے جان نظر آوندے نیں، اوہدے طربیہ ڈرامیاں دے بارے وچ Hazlitt نے آکھیا سی کہ شیکسپیئر دے انہاں ڈرامیاں وچ ہیروئین ہے نے پر ہیرو نہیں۔ ہیرو اوہناں دے اگے ندان جاپدے نیں۔ پورشیا، روزلنٹ، Voila تے Beatrice جہیاں چنچل تے شوخ کڑیاں صرف شیکسپیئر پیش کر سکدا سی۔ شیکسپیئر دی اک ہور خوبی ایہہ سی کہ اوہ زنانیاں توں وکھ معصوم بچیاں دے کرداراں نوں وی بڑی فنکاری نال پیش کردا اے۔ میکبتھ تے Winter's Tale (ونٹرز ٹیل) وچ چھوٹے بچیاں دے لافانی کردار پیش کیتے گئے نیں۔

شیکسپیئر جناں، بھوتاں تے چڑیلاں نوں وی اپنے ڈرامیاں وچ بڑی مہارت نال پیش کردا اے۔ اس طراں اوہ بے تکے نہیں لگدے، حقیقت توں قریب جاپدے نیں۔ میکبتھ وچ تن چڑیلاں دے کردار کمال شے نیں۔ ہیملٹ، جولیس سیزر تے ٹیمپسٹ وچ وی ایہو جہے کردار کمال ہنر نال پیش کیتے گئے نیں۔۔

شیکسپیئر دی دنیا وچ کسے پیشے، کسے ہنر تے کسے طبقے دی کمی نہیں انہاں وچ بادشاہ وی

نے تے کملے جھلے لوک وی، کمی کاری وی نیں تے شہزادے شہزادیاں وی، کسان مزدور وی نیں تے ہنر مند وی۔ حق تے ایہو اے کہ زندگی دے ہر شعبے نوں شیکسپیئر نے اس کمال نال پیش کیتا اے کہ اوہ جیندے جاگدے انسان جاپدے نیں۔

شیکسپیئر دیاں ساریاں کہانیاں اپنیاں نیں۔ اوہ پہلے توں ای موجود سن پر اوہناں نوں جیہڑا اسلوب اوہنے دتا اے اوہدے پاروں اوہ لافانی بن گئیاں نیں۔ شیکسپیئر نے اوہناں لئی جیہڑا طریقہ اختیار کیتا اے اوہ وی صرف شیکسپیئر ای کر سکدا سی۔ پلاٹ دی بُنت وچ اوہنے اپنا کمال وکھایا اے۔

اوہدے ڈرامیاں وچ طنز دے تیکھے تیر موجود نیں بلکہ چوسر وانگر اپنے کرداراں دے نال ہمدرد اے۔ اوہناں تے ہس ہسدا اے۔ اوہ چنگے بھیڑے سارے کرداراں نوں کسے تعصب توں بغیر پیش کردا اے، اوہدی دنیا وچ اخلاقوں ڈِگے ہوئے کردار ایڈمنڈ (Edmund) تے ایاگو وی ہین تے Cordelia (کارڈیلیا) تے Desdemona (ڈیسڈیمونا) وی اوہ اپنے کرداراں وچ ساہ لیندا اے تے ہر کردار نال انصاف کردا اے۔ اوہ نصیحتاں تے واعظ نہیں کردا بلکہ حیاتی دا تجربہ پیش کردا اے. انگریزی شاعر جان کیٹس نوں اوہدی ایہو خوبی چنگی لگدی سی تے اوہ وی ایہو جیہا فنکار بننا چاہندا سی۔ شیکسپیئر دے ڈرامیاں وچ بُرائی نوں ہمیشہ شکست ہوندی اے ایہہ ضروری نہیں کہ نیکی نوں انعام وی ملے ڈاکٹر جانسن نوں ایہو گل اک اکھ نہیں سی بھاوندی۔ شیکسپیئر دے ڈرامیاں وچ زندگی دی ہر خشبو، ہر رنگ، ہر ذائقہ، ہر احساس موجود اے تے اوہدے کرداراں دے قول آکھان بن گئے نیں۔ اوہناں دے آکھان سب توں زیادہ دہرائے جاندے نیں تے بار بار نقل کیتے جاندے نیں۔ شیکسپیئر نوں زبان تے بیان وچ وی قدرت حاصل سی اوہ دکھ دیاں بھرویں تصویراں پیش کر سکدا سی تے سکھ تے چین توں بھرے ماحول دی وی تصویر کشی کر سکدا سی۔ سوال ایہہ ہے کہ اوہ کیہ نہیں سی کر سکدا؟ جواب ایہہ ہے کہ اوہ سب کجھ کر سکدا سی۔

اک عام لکھاری دا ذخیرۂ الفاظ چار پنج ہزار توں بہتا نہیں ہوندا، ملٹن جیہے وڈے شاعر

نے کوئی ست ہزار الفاظ استعمال کیتے سن پر شیکسپیئر دا ذخیرۂ الفاظ پندرہ ہزار سی۔ اج شیکسپیئر دنیا دا فیا پر فیا شاعر تے ڈرامہ نگار بن گیا، کالرج دے خیال اچ شیکسپیئر نا صرف انگریزی دا ساریاں کولوں اُچا تے سچا ڈرامہ نگار اے بلکہ سب توں اچا شاعر وی اے۔

ایس مختصر جیہے مضمون اچ شیکسپیئر دا تعارف کرانا مقصود سی اوہدی عظمتاں نوں جانن لئی کتاباں بلکہ لائبریریاں دی لوڑ اے۔ علامہ اقبال ہوراں نے وی اپنی کتاب بانگِ درا وچ شیکسپیئر نوں انج بھرواں خراج پیش کیتا اے۔

شیکسپیئر

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ
ہے ترے فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی
کیا تری فطرتِ روشن تھی مآلِ ہستی؟
تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اورعالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

☆☆☆

جون ملٹن

انگریزی ادب وچ علم و فضل دے ہمالیہ جئے پہاڑاں دی کوئی کمی نہیں ،شیکسپیئر اک ہمالیہ ای سی پر ملٹن وی شیکسپیئر توں بعد کسے ادبی تے علمی کوہ ہمالیہ توں گھٹ نہیں تے اگر شیکسپیئر نوں صرف ڈراما نگار آکھیا جاوے تے ملٹن انگریزی دا سب توں وڈا شاعر اکھوائے گا۔ جہدی تعریف ہر اک نے کیتی تے جہدی ادبی حیثیت تے علمی مقام نوں ہر اک مندا اے،انگریزی دے شاعر ٹینی سن نے اوہنوں انگلستان دی آواز دا خدائی ساز قرار دتا اے۔

"God-Gifted organ of the voice of England"

Words Worth نے اپنی ایک سونٹ London وچ اوہنوں بھرواں خراج پیش کیتا اے۔

Milton! Thou shouldst be living at this hour:
England hath need of thee: she is a fen
Of stagnant waters: altar, sword, and pen,
Fireside, the heroic wealth of hall and bower,
Have forfeited their ancient English dower,
Of inward ha happiness. We are selfish men;
Oh! raise us up, return to us again;
And give us manners, virtue, freedom, power.
Thy soul was like a star, and dwelt apart;
Thou hadst a voice whose sound was like the sea:
Pure as the naked heavens, majestic, free,
So didst thou travel on life's common way,

In cheerful godliness; and yet thy heart
The lowliest duties on herself did lay.

اوہدی روح نوں اک ستارہ قرار دتا اے،اک ہور شاعر شیلی نے اوہنوں روشنی دا تیجا سپوت قرار دتا اے

"The third among the Sons of light"

ایدے وچ شک نہیں،ہومر نے ورجل توں وکھ ملٹن نے اپنی سب توں وڈی رزمیہ نظم Paradise Lost تخلیق کیتی جہڑی انگریزی ادب دا سنگھار اے تے بہت وڈا مان اے۔

ایہہ نظم بارہ ہزار مصریاں دی اے تے ایدے وچ شاعر نے خدائی احکام دا جواز پیش کرن دی کوشش کیتی اے تے اے سب کجھ آرنلڈ دے مطابق کمال انداز نال پیش کیتا اے۔آرنلڈ اوہدے انداز تحریر نوں "Grand Style" قرار دیندا اے۔

ہر شاعر تے نقاد نے اوہدی تعریفاں دے گن گائے پر بوہت سارے ایہو جئے نقاد وی سن جہڑے اوہنوں تنقید دا نشانہ بناندے سن۔ٹی ایس ایلیٹ(T.S Eliet) تے ازرا پونڈ(Ezra Pound) نے صاف صاف آکھیا کہ اوہنے انگریزی زبان دی مٹی پلیت کر چھڈی اے۔

اک ہور نقاد ریلے(Raleigh) نے اوہدی نظم Paradise Lost نوں مردہ خیالات دا مجسمہ قرار دتا بلیک نے آکھیا کہ اوہ اس نظم وچ خدا دا نہیں بلکہ شیطان دا حامی اے۔ ڈاکٹر جانسن نے وی ایس نظم اُتے کڑی تنقید کیتی اوہدے مطابق ایہو اسی مجبوراً پڑھنے آں ایہنوں پڑھ کے کوئی تسکین حاصل نہیں ہوندی۔

"Its perosal is a Duty
rather than a pleasure"

کیٹس نے وی اوہنوں پسند نہیں کیتا پر ایہہ ضرور آکھیا کہ ایہہ نظم (Paradise Lost) دنیا

دی اعلیٰ ترین تخلیق اے۔

ملٹن نے اپنی ساری شاعری وچ اعلیٰ قدراں دا پرچار کیتا اے۔ تے انگریزی زبان نوں ادبِ عالیہ دا حصہ بنا چھڈیا اے۔ اوہدی انگریزی ادب تے زبان دی خدمات نوں کدے وی نظر انداز نہیں کیتا جا سکے گا اوہ کوئی چتالیس ورھیاں دا سی کہ اوہدی بینائی بالکل ختم ہو گئی لیکن فیر وی اوہنے اوہ کارنامے سر انجام دتے نے جہڑے ہمیش سنہری حرفاں وچ لکھے جان گے تے انگریزی ادب دی تاریخ اوہنوں کدے وی بھلا نہیں سکے گی اوہدے حیرت انگیز کمالات تے ذکر توں پہلاں کجھ تھوڑا جیہا اوہدی نجی حیاتی بارے جان لینا وی ضروری اے۔ جون ملٹن لندن وچ بریڈ سٹریٹ چیپ سائڈ دے مقام تے 9 دسمبر 1608ء وچ پیدا ہویا۔ اوہدا والد اک سخت گیر عیسائی فرقے Puritanism نال تعلق رکھدا سی پر اس دے باوجود اوہ بڑا روشن خیال تے وسیع المشرب سی ملٹن سینٹ پال سکول وچ تعلیم پاندا رہیا اوہنے بی اے 1629ء تے ایم اے 1632ء وچ کر لیا۔ پر اوہدی علم دی پیاس ہور وی ودھدی رہی تے اوہنے کوئی پیشہ اختیار کرن دی بجائے پڑھائی نوں اپنا اوڑھنا وچھونا بنایا تے Horton دے مقام تے ست سال کتاباں نال ای عشق نبھاندا رہیا۔ فیر اوہنے سوچیا کہ ہن دنیا دی سیر کیتی جائے تاں جے اوہنوں عملی تجربہ حاصل ہو سکے 1638ء وچ اوہ یورپ دی سیر لئی نکل پیا تے پیرس راہیں اٹلی وچ پہنچیا پر انگلستان وچ خانہ جنگی دیاں خبراں نے اوہنوں بے قرار کر چھڈیا تے اوہ چھیتی انگلستان پہنچ گیا۔ فیر اوہنے انگلستان دی آزادی دی جنگ وچ حصہ لیا جہڑی شہنشاہیت دے خلاف لڑی جا رہی سی اوہنے شعر کہنے وی چھڈ دتے تے اپنا سب کجھ ملک دی بھلائی لئی قربان کر چھڈیا جدوں اوہدے فرقے Puritanism نوں کامیابی ہوئی تے کراؤن ویل انگلستان دا حاکم بن گیا تے ملٹن اوہدا لاطینی سیکرٹری مقرر کیتا گیا۔

ملٹن دی پہلی شادی 1643ء وچ میری پاول (Mary Powel) نال ہوئی، پر اوہنوں کوئی سکھ نہ ملیا، دس ورھیاں بعد 1653ء وچ اوہدی نظر بالکل ختم ہو گئی، ۲ ورھیاں مگروں

فیر اوہنے کیتھرین نال شادی کیتی پر کوئی اک ورھے بعد اوہدا انتقال ہو گیا۔ 1660ء وچ کراؤن ویل دی حکومت ختم ہو گئی تے، پیورٹن ازم نوں زوال آ گیا تے ملٹن نوں وی گرفتار کر لیا گیا تے اوہدیاں کتاباں ساڑ دتیاں گئیاں ہن اوہ غریب تے کلا رہ گیا سی اوہنے فیر اک ہور شادی کیتی تے اوہنوں کجھ سکون ملیا۔ پر نال ای اوہدی پہلی بیوی توں پیدا ہون والیاں دھیاں نے اوہنوں ڈاہڈا اوکھا کیتا پر اوہ وی گھبراؤن والا نہیں سی تے اوہنے اپنی سب توں وڈی نظم Paradise Lost، 1667ء وچ لکھی پیراڈائز ریگینڈ (Paradise Regained) تے Samson Agonistes، 1671ء وچ لکھیاں تے تن ورھیاں بعد 8 نومبر 1674ء وچ اوہنے وفات پائی۔ وفات کدوں پائی! کدے حرفاں تے جذبیاں دے پجاری وی وفات پاندے نیں! اوہ زندہ رہیا تے زندہ رہے گا۔ اوہنے اپنی شاعری دا آغاز اپنے کالج دے دوراں توں کردا سی پہلے اوہنے لاطینی وچ نظماں لکھیاں تے فیر اوہنے اپنی نظم

Ode on the Morning of Christ's Nativity

لکھی تے اپنے کالج وچ بڑا ای مشہور ہویا۔ ایس توں بعد اوہنے چار ایہو جہیاں نظماں لکھیاں کہ اگر اوہ Paradise Lost نہ وی لکھدا تاں وی اوہدی شہرت کدے وی کم نہ ہوندی، ایہہ اوہدے پہلے دور دیاں نظماں سن، ایہہ سن L'Allegro، تے Il Penseroso ایہناں دو نظماں وچ اوہنے خوشی تے غم دیاں بھرویاں تے سچیاں تصویراں کھچیاں نیں تے ایہہ نظماں اوس دے اس دور دی یادگار نیں جدوں اوہ اجے زندگی نوں ہسدا کھیڈدا ویکھنا چاہندا سی تے اوہدے سارے آزادی دی اوس تحریک دا ابھرواں اثر سی جنہوں تحریک احیائے علوم دے ناں توں یاد کیتا جاندا اے ایہہ تحریک سولھویں صدی دے آخری حصے وچ شروع ہوئی سی تے پرانی یونانی تے لاطینی کتاباں دے ترجمیاں باجھوں اک نویں سوچ دا منڈھ بنی گئی سی، ایس تحریک دے فن والے آزادی، آزاد خیالی، حسن دی پوجا تے جسم بازی نوں اہم قرار دیندے سن تے اوہناں دا مذہبی تنگ نظری نال کوئی تعلق نہیں سی اوہ انسانی عظمت تے انسانی آزادی دے حامی سن، ملٹن وی اوہناں

کولوں بڑا متاثر سی ایہی وجہ اے کہ اوہنوں تحریک احیائے علوم دا پچھیتا پتر آکھیا جاندا اے Belated son of Renaissance تے Spenser دا شعری پتر وی آکھیا جاندا اے Poetic son of Spenser ایہناں دو نظماں توں بعد اوہنے اک منظوم ڈراما "Comus" لکھیا تے فیر اپنے اک متر King Edward دی وفات تے اک مرثیہ Lycidas لکھیا دوسرے دور وچ کجھ نثر لکھی تے بارہ (۱۲) سونٹاں تے تیسرے دور دا ذکر پہلاں ای کیتا جا چکیا اے۔ ملٹن انگریزی شاعری دا مان اے تے پچھان اے اوہ پہلا شاعری جنہے blank verse بڑی کامیابی نال استعمال کیتا اوہنے زبان نوں وسعت دتی تے اوہنوں اپنی مرضی نال ورتیا اوہدی تشبیہات اوہدے خیال دی وسعت دا پتا دیندیاں نیں، اوہنے یونانی تے لاطینی دیومالا نوں وی بڑے فن کارانہ انداز وچ پیش کیتا۔

ملٹن اک طرح ساڈے شاعر علامہ اقبال توں بہت قریب سی ایہہ دونویں شاعر انسانی آزادی دے قائل سن پر خدا دی حکمرانی نوں ضروری سمجھدے سن، دوواں نیں شیطان نوں بڑی دل کش تے متحرک شخصیت دے طور تے پیش کیتا اے۔ دونویں شاعر تقدیر تے قسمت دے سخت مخالف سن اوہناں دا خیال سی کہ انسان خود اپنے لئی جنت تے جہنم بناندا اے۔ اقبال دی طرح ملٹن وی یقین رکھدا سی کہ نا طاقتی بہت وڈا جرم اے To be weak is miserable doing a suffering دونویں شاعر ملائیت دے سخت خلاف سن تے ملائیت نوں ساری خرابیاں دا ذمہ دار قرار دیندے سن۔

ملٹن دی نظم Paradise lost نوں پڑھ کے ایہہ اندازہ ہوندا اے کہ اوہ امن دا قائل سی تے اوہدے خیال وچ آدم جنت توں کسے سدا بہاروں نہیں نکلیا بلکہ اوہنوں بڑیاں ذمہ داریاں دتیاں گئیاں ایہہ خیال وی اقبال دے خیال دے بہت نیڑے اے۔ بہت سارے نقاداں نے ملٹن نوں ناپسند کیتا اے اوہناں دا خیال اے کہ اوہ پرانے عہدنامے دی تعلیمات عام کردا رہیا اے، اوہ ایہہ وی کہندے نیں کہ ملٹن نے انگریزی زبان و ادب نوں ڈاہڈا نقصان

پہنچایا اے پر ملٹن دی عظمت توں کدے وی انکار نہیں کیتا جا سکے گا اوہ انسان حوصلے تے انسانی شان بان دا شاعر اے اوہ مذہبی بندہ سی پر اوہ تنگ نظر کدے وی نہیں ہو سکیا اوہدا خیال سی کہ انسان نوں انسان نال پیار کرنا چاہیدا اے تے دوجیاں دے کم آنا چاہیدا اے تے کدی وی مایوس نہیں ہونا چاہیدا اوہدی اپنی حیاتی اک مسلسل جدوجہد دی تصویر پیش کردی اے، ایہہ ای وجہ اے کہ ہر دور دے پڑھن والیاں نے اوہنوں پسند کیتا تے اوہدی خدمات نوں بھرواں خراج پیش کیتا اے۔

☆☆☆

ولیم ورڈز ورتھ

انگریزی ادب داروشن تارا

اردو ادب وانگر انگریزی ادب دا اسمان وی ہزاراں چن تاریاں نال جگمگ جگمگ کردا وکھائی دیندا اے۔ پہلا تارا چودھویں صدی وچ روشن ہویا تے اوہنے اپنی روشنی نال سارے ہنیریاں نوں نورو نور کر چھڈیا۔ اوہ سی جافرے چوسر (1340-1400) فیر کجھ انج ہویا کہ 150 وریاں دے دوران کوئی وڈا شاعر پیدا نئیں ہویا۔ پر سولہویں صدی دے آخری 25 وریاں وچ شاعراں تے ادیباں دی لین ای لگ گئی، انگریز لکھاریاں اوہ معجزے وکھائے کہ دنیا عش عش کر اٹھی جیہڑے اوہناں توں بعد گھٹ ای نظر آئے۔ ایہناں چن تاریاں اچ شامل سن، شیکسپیئر، سپنسر، جون ڈن فرانسس بیکن، بن جانسن، کرسٹوفر مارلو۔ تے ہور بتیرے، کس کس دا ناں لیئے تے کس کس دا چھڈ یئے، پر جس شاعر دا ذکر اسی کر رہے آں اوہ ڈیڑھ پونے دوسو سال پہلاں 1770ء وچ پیدا ہویا تے 80 وریاں تک اپنے کمال وکھاندا رہیا۔ انگریزی نقاد میتھیو آرنلڈ، اوہنوں انگریزی دا تیجا وڈا شاعر مندا اے۔ یعنی شیکسپیئر تے ملٹن توں بعد اوہنے اپنے فن دے جیہڑے کمالات وکھائے اوہ کوئی ہور گھٹ گھٹ ای وکھا سکیا اے۔ ایہہ ایناں سچا تے سُچا شاعری تے ساڈے علامہ اقبال ہوری وی کہہ اٹھے۔

Wordsworth saved me from atheism in the days of my studentship.

یعنی "ورڈز ورتھ نے طالب علمی دے دور وچ میتوں کفر توں بچا لیا" پروفیسر حمید تے پروفیسر سید حامد علی جیہاں نقاداں نے ثابت کیتا اے کہ علامہ دی پہلی شعری کتاب بانگِ درا دی کوئی 40 نظماں ورڈز ورتھ دی شاعری توں متاثر نیں تے علامہ اقبال دی فطرت بارے شاعری دے اُتے ورڈز ورتھ دے صاف صاف اثرات ویکھے جاسکدے نیں۔

ورڈز ورتھ نوں ایہہ کناوڈا خراجِ تحسین اے ایہدا اندازہ لگانا مشکل نئیں، ورڈز ورتھ

نے اپنی شاعری راہیں، انگلستان دی مادہ پرست زندگی وچ روحانیت دا اک ایہو جیہا دیوا روشن کیتا، جدی روشنی اجے تیکر محسوس ہوندی اے۔ انگلستان وچ صنعتی انقلاب شروع ہو چکیا سی تے شہراں دا سکون تے امن غارت ہو گیا سی ہر پاسے لالچ، خودغرضی تے دوجیاں کولوں اگے لنگھن دی خاہش نے سارا سکون لٹ لیا سی۔ ایہی وجہ اے کہ ورڈز ورتھ نے ایہدے خلاف بھرپور احتجاج کیتا تے اوہدی نظم The World is too much with us دے کجھ شعر ایہدا ثبوت نیں۔

The world is too much with us; late and soon,
Getting and spending, we lay waste our power:
Little we see in nature that is ours;
We have given our hearts away, a sordid boon!

اسی دنیا دی مادیت اچ بُری طراں پھس گئے آں
دنیاوی کاروبار وچ ای اساں اپنی ساری جندڑی گوا چھڈی اے
فطرت جو ی ساڈے لئی اے اسی اوہدے ول تکدے وی نئیں
تے اسی گھٹیا گھٹیا خوشیاں تے اپنے دل وار بیٹھے نیں

لندن دی خستہ حالی دا اگھار اوہنے اک ہور نظم "London" وچ کیتا اے جدے وچ اوہنے ملٹن دی روح نوں واجاں ماریاں نیں۔

Milton! Thou shouldst be living at this hour:
England hath need of thee: she is a fen
Of stagnant waters: altar, sword, and pen,
Fireside, the heroic wealth of hall and bower,
Have forfeited their ancient English dower,

Of inward happiness. We are selfish men;

Oh! Raise us up, return to us again;

And give us manners, virtue, freedom, power.

ملٹن! کدے توں ہُن ہوندا
انگلستان نوں تیری لوڑ اے
اوہ اک سنڈا س بن گئی اے، دھرم، جنگ تے علم
گھریلو حیاتی کھیل کود، ناچ تے موسیقی
ساریاں وچ ایہو جہی گل نہیں رہی جہڑی کدے ہوندی سی،
ساڈیاں خشیاں مُک گیاں نیں
اسی خودغرض ہو گئے آں
آ کے سانوں جگا۔۔۔۔۔
تے سانوں چنگے رہن سہن، نیکی، آزادی تے طاقت دی دولت دے

ایہہ احتجاج ورڈزورتھ دی بوہت ساری شاعری وچ موجود اے۔ اوہدا خیال اے کہ اسی فطرت دے نال رہ کے اپنی حیاتی نوں خوشگوار بنا سکدے آں۔ تے ورڈز ورتھ ایہو جیہا شاعر اے۔ جہنوں کدے وی فراموش نہیں کیتا جا سکدا۔

ورڈزورتھ 7۔اپریل 1770 Cockermouth,Cumberland وچ پیدا ہویا۔ تے اوہنے اپنی حیاتی، ہاریاں، مزدوراں تے محنت کشاں دے نال شروع کیتی۔ تے اوہناں دے تجربات اوہدی شاعری دا حصہ بن گئے۔ اوہنے ایہناں پنڈ والیاں توں بوہت کجھ سکھیا تے احترامِ آدمیت دا جذبہ اوہدی شاعری وچ ملدا اے۔ اوہ ایسے تجربے دا حصہ اے۔ اوہنے رسمی تعلیم ہاک شیٹ، لنکا شائر کیمبرج وچ پائی، پر اوہ رسمی تعلیم نوں اہمیت نہیں دیندا سی۔ اوہدا خیال سی کہ اصل کتاب فطرت دی کتاب اے۔ اوہنے اپنی اک نظم An Evening

Scene وچ ایہناں خیالات دا کجھ اس طراں اظہار کیتا اے۔

Up! Up! my friend, and clear your looks,
why all this toil and truble?
Up!Up! my friend and quit your books
or sourly! you'll grow double.
"Books! it's a dull and endless trife,
Come,hear, the woodland linnet
How sweet his music on my life,
There's more of wisdom in it"

اُٹھ اُٹھ میرے یار اپنی سوچ نوں بدل
ایویں کیوں مشقتاں جھلناں اے
اُٹھ اُٹھ میرے یار ایہناں کتاباں نوں چھڈ
نہیں چھڈیں گا تے اوکھا ہوویں گا
ایہہ کتاباں رُکھیاں پھکیاں نیں تے انہاں وچ سر نہ کھپا
لیٹ دا گاؤن سن، کنا سوہنا گاندا اے
قسم اے رب دی ایہدے وچ بڑی حکمت اے

اوہ دو واری فرانس وی گیا۔ تے فرانس دے انقلاب نوں بڑے غور نال ویکھیا۔ تے متاثر وی ہویا۔ اوہنے فرانس دے مفکراں روسو (Rousseau) تے والٹیئر دے آزادی بارے نعریاں نوں اپنے دل وچ وسا لیا۔

فرانس وچ انقلاب 1789 وچ آیا۔ تے تباہیاں لیایا، نپولین بر سرِ اقتدار آ کھلوتا (?) بیٹھا۔ تے کسے نوں وی کجھ نہیں لبھیا پر ورڈزورتھ نوں اپنی شاعری لئی بوہت کجھ لبھیا۔ تے اوہنے غریباں،

بے سہاریاں، محتاجاں، ہاریاں تے مزدوراں دے لئی اپنی شاعری وقف کر چھڈی۔ اوہ Coleridge نال مل کے اس مشن تے روانہ ہویا، Coleridge تے اوہنوں راہ وچ ای چھڈ دتا، پر ایہہ جوان اپنی راہ توں نہیں ہٹیا تے اوہنے اپنیاں ساریاں نظماں وچ پنڈاں دے لوکاں دے سکھاں، دکھاں دیاں کہانیاں بیان کیتیاں ۔ 1798 توں 1808 تک دا دور اوہدی شاعری دا سنہری دور اکھواندا اے۔ اوہنے اوہ سب کجھ لکھیا جیہڑا ایس توں پہلاں کدے نہیں لکھیا گیا سی ہاں جیہڑے نذیر اکبر آبادی وانگر اک نوی نویکلی راہ کڈی۔ اوہدے نال نال ہور شاعراں نے وی ایس تبدیلی نوں قبول کیتا، سدے، شیلی، بائرن، کیٹس، تے ہور بوہت سارے شاعر وی اوہدی راہ تے چل پئے تے انج انگلستان وچ اک انقلاب برپا ہویا جنہوں رومانی انقلاب دے ناں نال یاد کیتا جاندا اے ۔ شاعری وچ ایہہ انقلاب بڑی تبدیلیاں لیایا۔ ایس توں پہلاں اٹھارھویں صدی وچ شاعری بارے بوہت مختلف نظریات سن تے ایہناں نظریات دا سرخیل Alexander Pope سی۔ اوہدی شاعری تے اوہدے ہم خیال قلم کاراں دی تحریراں وچ شہری زندگی نوں بڑی اہمیت حاصل سی تے اوہناں دا خیال سی کہ صرف پڑھے لکھے امیر کبیر حیثیت والے ای شعراں نوں سمجھ سکدے نیں اوہناں توں ہٹ کے ورڈز ورتھ نے ایہہ ثابت کیتا بلکہ منوایا کہ پنڈاں وچ رہن والے لوک وی شعر سمجھ سکدے نیں تے اوہناں دی زندگی بارے شاعری کرنا وی اک بوہت وڈی خدمت اے۔ ایس واسطے اوہنے عام لوکاں دی زندگی نوں اپنی شاعری وچ پیش کیتا کہ جونکاں لبھن والا، لکڑاں وڈن والا تے گلیاں اچ پھرن والا، ڈیریاں تے بہن والے، گھاہ کٹن والے تے حقے دے سوٹے لاون والے عام لوک وی شاعراں دے دھیان دے لائق نیں، اوہناں بارے لکھن اچ اک ہور ای مزا اے۔ ایہہ سچے تے کھرے لوک زندگی لئی بڑا خزانہ نیں۔ ورڈزورتھ نے ایہہ کوشش وی کیتی کہ ایہناں بارے حالات نوں ایہناں دی اپنی زبان وچ پیش کیتا جائے یعنی اوہ زبان جیہڑی لوکی بولدے نیں اوہی شاعر دی زبان ہونی چاہیدی اے۔

شاعر جیہڑا اوس زبان وچ اپنے خیالاں دے رنگ بھردا اے تے ہور کجھ وی نہیں کردا۔ اوہدے خیال اچ شاعر اوہ بندہ اے جیہڑا عام بندیاں نال گلاں باتاں کردا اے۔ اوہ کوئی اسمانی مخلوق نہیں نہ کوئی اوہنوں وحی نازل ہوندی اے بلکہ اوہ تے عام بندہ ہوندا اے جہدا دل نرم ہوندا اے تے اوہ دوجیاں دے دکھاں نوں محسوس کر سکدا اے۔ ورڈزورتھ نے ایس گل تے وی زور دتا کہ دیہاتی ویب ای انسان دا اصل ویب اے تے جو کجھ پنڈاں وچ موجود اے اوہ ای سچا تے کھرا اے۔ ایس لئی اوہدا فطرت ول دھیان ہویا تے اوہنے محسوس کیتا کہ ایہہ نہراں، ندیاں، دریا، چن تارے تے پھُل بوٹے تے ہور بہت ساریاں نعمتاں انسان لئی نیں۔ تے نالے اوہدے خیال اچ ایہناں شیواں دا مالک وی ایہناں راہیں ای ساڈے نال رشتہ جوڑدا اے۔ جے اسی اوس وڈی طاقت نال رشتہ جوڑنا چاہندے آں تے سانوں فطرت نال رہنا پئے گا۔ اوہنے ایہہ نظریہ وی قائم کیتا کہ ایہہ فطرت انسان نوں بوہت کجھ پڑھاندی اے تے سکھاندی اے تے کدے دھوکا نہیں دیندی، ایس وجہ توں اوہنوں فطرت دا پجاری آکھیا جاندا اے۔ اوہنے اپنی ہر نظم وچ فطرت دے حسن تے اوہدے اثرات دا بھرواں اظہار کیتا اے۔ پر بہت سارے لکھن والے اوہدی اس گل نال اتفاق نہیں کردے تے اوہ سمجھدے نیں کہ اوہنے فطرت دا صرف اک رخ ویکھیا اے۔ اوہدیاں تباہ کاریاں نوں نظر انداز کر چھڈیا اے۔ اوہ ایہہ بھُل گیا اے کہ فطرت انسان دی دشمن وی اے، طوفان تے ہنیریاں جیہڑے ظلم ڈھاندیاں نے اوہنوں ایہناں ایس دا اندازہ نہیں یاں اوہ جان بجھ کے اوہدا صرف اک رُخ ای پیش کردا اے۔

ورڈزورتھ نے بالاں بارے جناں کجھ لکھیا اے اوہ کسے ہور شاعر دے کلام وچ نہیں لبھدا اوہ بالاں نوں بزرگاں کولوں وی سیانا سمجھدا اے۔ اوہدے خیال اچ اوہ روحانی طور تے بوہت اچے ہوندے نیں تے مادیت دے روگ توں محفوظ ہوندے نہیں۔ اوہنے پنچھیاں، پکھیرواں نوں وی اپنی شاعری دا حصہ بنایا اوہدیاں بوہت ساریاں نظماں پکھیرواں بارے موجود نیں۔ اوہ انسانی دل نوں بڑی عزت تے توقیر دیندا اے اوہ تے کسے شے نوں گھٹیا

نئیں سمجھدا، ہر شے اپنی اہمیت رکھدی اے تے اوہدی قدر ہونی چاہیدی اے۔ ورڈزورتھ حیاتی دے سچے واقعات نوں پیش کردا اے، اوہ بجڑکاون والیاں نظماں نئیں لکھدا۔ ایس واسطے بوہت سارے پڑھن والے اوہدے کلام وچ دلچسپی نئیں لیندے۔ ورڈزورتھ کوئی فلسفی نئیں نہ اوہ تصوف دا کوئی نواں تصور پیش کردا اے بلکہ اوہدی خواہش ایہہ وے کہ انسان آزادی نال زندگی گزارے اوہدی زندگی سدھی تے سچی ہووے تے اوہ فطرت نال اپنا تعلق قائم کرے۔ اوہنوں پڑھ کے آتما نخش ہوندی اے اک سرور ملدا اے۔ اوہ اک رکھواں گرا ہے جدے تھلے بہہ کے شانتی ای شانتی اے سکھ ای سکھ اے۔ ورڈزورتھ بچ پچھو تے یاداں دا شاعر وی اے اوہنوں ماضی دیاں یاداں اک نویں حیاتی بخشدیاں نیں تے اوہ اوہناں وچ ای ڈبیا رہندا اے، اوہدی نظم Daffodils, To the Cuckoo, Tintern Abbey تے ہور بوہت ساریاں نظماں ایس گل دا جیوندا جاگدا ثبوت نیں۔ اوہ سارے انساناں نوں اک ویکھنا چاہندا اے تے چاہندا اے کہ زندگی وچ دھوکا، مکاری، جھوٹ، فریب مک جانا چاہیدا اے محبت تے پیار دیاں گلاں ہونیاں چاہیدیاں نے تے سارے انسان برابر نے تے اکو ای خاندان اے اوہدے ایہہ خیالات علامہ اقبال نوں ایہنے چنگے لگدے سن کہ اوہ بار بار ورڈزورتھ دے کلام نوں پڑھدے سن۔

اک انگریزی مفکر J.S.Mill نے آکھیا اے کہ ورڈزورتھ نوں پڑھن والا کدے دکھی نئیں ہو سکدا" ورڈزورتھ ایہو جئی رہتل پیش کردا اے جیہڑی سارے انساناں نوں جوڑدی اے ساریاں نوں پیار تے سچائی دا پیغام دیندی اے۔

ورڈزورتھ دی موت ۲۳ اپریل ۱۸۵۰ء وچ ہوئی، پر اوہ اج وی زندہ اے تے ہمیش زندہ رہے گا۔

☆☆☆

کنگ لیئر

جے خود ایہہ اندازہ لانا ہووے کہ باری تعالیٰ نے انسان نوں کنیاں کو ذہنی صلاحیتاں عطا کیتیاں نیں تے سانوں دنیا دے وڈے ادیباں، شاعراں، دانشوراں تے سائنس داناں دے کارنامیاں ول ویکھ لینا چاہیدا اے، اوہناں دیاں تخلیقاں تے ایجاداں انسان نوں حیرت وچ پا دیندیاں نیں تے انسان کہہ اٹھدا اے کہ بیشک وڈی اے شان اوہدی جنے انساناں نوں بنایا تے اوہناں نوں ایہیاں صلاحیتاں دتیاں۔

ایہناں نامی گرامی شخصیتاں وچوں اک شخصیت ولیم شیکسپیئر (1564ء۔1600ء) دی وی اے جنہے انگریزی ادب وچ اوہ مقام حاصل کیتا جیہڑا نہ اوہدے توں پہلاں کوئی کر سکیا سی تے نہ ای اوہدے بعد اج تیکر کر سکیا اے۔ شیکسپیئر نے سینتی (۳۷) ڈرامے تے دو منظوم ڈرامے لکھ کے انگریزی ادب نوں اوہ شہرت تے عظمت دتی کہ کارل لائل کہہ اٹھیا کہ انگلستان دی دنیا بھر وچ فتوحات اک پاسے تے شیکسپیئر دے کمال دوجے پاسے، تے فیر وی شیکسپیئر دا پلڑا اچھواں ای ہووے گا۔ اوہنے اپنے ڈرامیاں وچ نت نویں جہان پیش کیتے، ہر جہان کسے انسانی گرہ (Human Planet) کولوں گھٹ نئیں۔ ایدے ہر اک ڈرامے وچ پوری زندگی دھڑکدی ہوئی محسوس کیتی جاسکدی اے، پر اوہدے چار ایسے ڈرامیاں دی تے کوئی ریس ای نئیں، کوئی مقابلہ ای نئیں۔ ایہہ ڈرامے نیں "ہیملٹ"، "میکبتھ"، "اوتھیلو" تے "کنگ لیئر"۔

کنگ لیئر خورے کیوں مینوں اوہدے باقی سارے ڈرامیاں توں کجھ بوہتا ای اثر انگیز جاپدا اے۔ میں جدوں وی ایہہ ڈراما پڑھیا میں نویں حیاتی محسوس کیتی، میں اکثر آکھدا ہوندا واں کہ جنہے کنگ لیئر پڑھ لیا اوہ کدے خودکشی نئیں کر سکدا، کدے ڈپریشن دا شکار نئیں ہو سکدا۔ ایدے وچ حیاتی دے اوہ ٹانک نیں جیہڑے رگاں وچ لہو نوں دوڑا دیندے نیں، تے انسان وچ ہر اوکڑ توں نمٹن دی شکتی پیدا ہو جاندی اے۔

ڈرامے دی کہانی کوئی نویکلی کہانی نئیں بلکہ ایہہ ساڈے اپنے وسیب دی کہانی اے پر

کرداراں دے مکالمیاں راہیں شیکسپیئر نے کمال کر چھڈیا اے، انسان پڑھدا رہوے تے حیاتی دے سارے راز ظاہر ہونے شروع ہو جاندے نیں، "کنگ لیئر" کوئی ۸۰ ورہیاں دا بندہ اے، اوہ انگلستان دا حکمران اے تے محسوس کردا اے کہ اوہنوں مرن توں پہلاں اپنی سلطنت اپنی تِنوں کڑیاں دے حوالے کر دینی چاہیدی اے، تے اوہ حصے وی مقرر کر دیندا اے، اوہدی سب توں وڈی کڑی دا ناں (Goneril) گونرل دوجی دا ناں (Regan) ریگن تے تیجی دا ناں (Cordelia) کارڈیلیا، پہلیاں دو کڑیاں دی شادی ہو چکی اے تے تیجی دی اجے ہونی اے۔ لیئر نوں عجیب و غریب خیال آؤندا اے، اوہ تِنوں کڑیاں نوں بلا کے پچھدا اے کہ تسی میتھوں کناں پیار کردیاں او، گونرل تے ریگن سب کجھ اوہدے اُتے قربان کرن لئی تیار نیں۔ اوہ کہندیاں نیں تسی ساڈے سب کجھ او، تہاڈے کولوں چنگا کون ہو سکدا اے، اوہ اوہدیاں تعریفاں کردیاں نہیں تھکدیاں، خوشامد دے سارے گُر استعمال کردیاں نیں۔ تیجی دھی "کارڈیلیا" ایہہ سب کجھ سن دی اے تے حیران ہوندی اے۔ اوہنوں جاپدا اے کہ ایہہ بھیناں خوشامد کر رہیاں نیں، اوہ اپنے پیو وانگر راست باز اے۔ جدوں لیئر اوہنوں پچھدا اے کہ دس توں کیہ کہنی ایں تے اوہ کہندی اے "Nothing my Lord" "کجھ وی نہیں میرے آقا" بادشاہ اگ بگولا ہو جاندا اے "فیر آکھیں" اوہ فیر ایہو آکھدی اے، اوہ کہندی اے میریاں بھیناں ساری محبت تہانوں کنج دے سکدیاں نیں جدوں اوہناں دے شوہر موجود نیں۔ میں کدے شادی کیتی تے میری ادھی محبت میرے شوہر لئی ہووے گی" فیر کیہ سی بادشاہ آپے توں باہر ہو گیا، اوہ تے اپنی باقی زندگی ایس اپنی تیجی کڑی نال گزارنا چاہندا سی تے اوہنے ایہدا حصہ وی کوئی چوکھا ای مقرر کیتا سی، پر ہُن تے نقشہ ای بدل گیا، ایہدا حصہ وی اوہنے دونواں وڈیاں کڑیاں نوں دے چھڈیا۔ کارڈیلیا نال شادی کرن لئی دو امیدوار سن۔ اک فرانس دا بادشاہ سی تے دوجا برگنڈی دا نواب۔ ایہہ صورت ویکھ کے برگنڈی دا نواب تے کھسک ای گیا، کہن لگیا جس توں اوہدا اپنا پیو خوش نہیں اوس توں ہور کون خوش ہو سکدا اے، پر فرانس دا بادشاہ ڈٹ گیا۔ اوہنے کہیا ایہہ کیہ گل ہوئی تھوڑی جیہی تعریف نہ کرن

پاروں اینی وڈی سزا۔ ایہہ کڑی تیجی جاپدی اے، ایہنوں میں اپنی ملکہ بنانواں گا۔ اوہ کارڈیلیا نوں لے کے ٹر گیا تے دونواں کڑیاں دی حکومت ہو گئی، تے حکومت لیندیاں ای اوہناں دے تیور بدل گئے، اوہ بادشاہ دی ایہہ گل وی نہیں من سکیاں کہ اوہ سو (۱۰۰) نواب اپنے کول رکھے گا، اوہناں نے آکھیا ایدھی کیہ لوڑ اے۔ بادشاہ حیران سی ایہہ کیہ ہو گیا۔ حالات اک دو ہفتے وچ ای ایسے خراب ہوئے کہ بادشاہ نوں محلوں باہر کڈھ دتا گیا تے اوہ طوفان وچ اک مسخرے تے اک دو درباریاں نال باہر نکل گیا، طوفان وی کوئی قیامت دا سی، بجلی کڑکدی سی تے اگ ورساندی سی، طوفان پاروں ہر شے جڑوں اکھڑ گئی تے کنگ لیئر سی کہ اوہنوں امان دی تھاں نہیں لبھدی سی، طوفان جاری رہیا، کسے نے اوہدی مدد نہیں کیتی۔ ایہہ گل جدوں کارڈیلیا نوں پتا چلی تے اوہ اپنیاں فوجاں لے کے انگلستان آ گئی۔

اودھر ڈرامے وچ اک ہور سانحہ وی ہویا، اک نواب گلوسٹر (Gloucester) سی، اوہنوں بادشاہ نال بڑی ہمدردی سی پر اوہ وی اک ایسے دا شکار ہو گیا، اوہدا اک اپنا پتر سی ایڈگر (Edgar) تے اک ناجائز پتر ایڈمنڈ (Edmund) وی سی، ایڈمنڈ نے اک سازش کیتی تے گلوسٹر نوں ایڈگر دے خلاف کر چھڈیا، تے اودھر ایڈمنڈ ریگن تے گونرل نوں دانہ پاؤن لگ پیا تے دوہاں نوں اپنی محبت دے جال وچ پھسا لیا تے اوہ پھس وی گئیاں، ریگن دے شوہر (Cornwal) کارن وال نے گلوسٹر دیاں اکھیاں کڈھوا دتیاں۔ ایہہ سارا کم ایڈمنڈ دے راہیں ہویا تے جدوں اوہدیاں اکھیاں کڈھیاں جا رہیاں سن تے اوودوں اک غلام اُٹھیا تے اوہنے کارن وال تے وار کیتا تے اوہدی جان لے گیا۔ اودھر گونرل دا شوہر (Albany) آل بنی نیک دل ثابت ہویا تے کارڈیلیا نال جا ملیا، جیویں دسیا گیا اے کہ گونرل تے ریگن دوویں بھیناں ایڈمنڈ تے مرمٹن لگیاں، گونرل نے ریگن نوں زہر دے دتا پر ایسے وچ جنگ دا میدان تیار ہو گیا۔ اک پاسے ایڈمنڈ سی تے دوجے پاسے کارڈیلیا تے آل بنی، پر قدرت دا لکھیا کجھ ہور سی، کارڈیلیا نوں شکست ہو گئی، اوہنوں پھانسی چڑھا دتا گیا، لیئر ایہہ برداشت نہ کر سکیا۔ اوہدا دل پھٹ گیا

اودھر ایڈگر نے اک مقابلے وچ ایڈمنڈ نوں شکست دے چھڈی، ایڈمنڈ مرنک گیا۔ ریگن زہر نال تے گونرل آپئی مر نک گئی اوہناں دیاں لاشاں وی میدان وچ پہنچ گیاں۔ ایلبنی تے ایڈگر نے ایس موقعے تے ساری سلطنت اپنے قبضے وچ لے لئی تے ہمت نہ ہاری، ڈراما اتھے مک گیا پر ڈرامے وچ جہڑا جہان موجود اے اوہدیاں ریساں نہیں، حیاتی دے کنے رخ نیں جہڑے کرداراں راہیں، تے اوہناں دی مشکلاں راہیں پیش کیتے گئے نیں۔ جتی وار پڑھو مرزا غالب دی غزلاں وانگر نویں نویکلے مطلب ظاہر ہوندے جاندے نیں، حیاتی دا کوئی اجیہا رنگ نہیں جہڑا ایس ڈرامے وچ پیش نہیں کیتا گیا۔

جدوں ڈراما شروع ہوندا اے ساڈی ملاقات دو کرداراں نال ہوندی اے، ایہہ کردار نیں Kent تے Gloucester، گلوسٹر دا ناجائز پتر ایڈمنڈ، کینٹ تے گلوسٹر دی گفتگو راہیں اسی ڈرامے دی دنیا وچ داخل ہو جاندے آں تے سانوں پتا چلدا اے کہ ایہہ دنیا اخلاقی گراوٹ دا شکار اے تے ایہہ گراوٹ ذہنی وی اے تے مادی وی۔ گلوسٹر اپنے ناجائز پتر دی پیدائش دا جس طراں ذکر کردا اے اُس توں اندازہ ہوندا اے کہ ایہہ معاشرہ اخلاقی طور تے کناں زوال پذیری۔ اپنے پتر ایڈمنڈ جہڑا ہن جوان ہو چکیا اے دا تعارف کراندیاں ہویاں گلوسٹر کینٹ نوں کہندا اے:

Sir,this young fellow's mother could: where upon she grew round-womb'd and had, indeed, Sir, a son for her cradle ere she had a husband for her bed....... though this knave came something saucily to the world before he was sent for, yet was his mother fair; there was good sport at his making" (Line15-25),(Act1-scene1)

"جناب ایس نوجوان دی ماں شادی کرن توں پہلاں ای حاملہ ہو گئی تے خاوند توں بغیر ای پتر جم سٹیا۔ ایہہ پتر دھکم دھکی دنیا اچ آیا پر کیہ دساں ایہدی ماں ڈاھڈی سوہنی سی تے ایہنوں جمن لگیاں بڑا ای مزہ آیا۔"

ایہہ اوہ دنیا سی جہدے وچ گناہ تے ثواب وچ کوئی خاص فرق نہیں سی تے ایس دنیا نوں پاک کرن لئی قدرت نے ڈھیر سارے دکھاں دا اہتمام کیتا، گلوسٹر کوئی اسی (۸۰) ورہیاں دا اے تے بادشاہ کنگ لیئر وی کوئی اینی ای عمر دا اے پر درباریاں دی چاپلوسی نیں اوہنوں بڑا ای سخت گیر بنا دتا اے پر اوہ چاہندا اے کہ مرن توں پہلاں اوہ اپنی سلطنت اپنی کڑیاں اچ ونڈ دیوے، جس دا ذکر اسی پہلاں وی کر آئے آں۔ اوہنوں کیہ پتہ سی کہ اوہ اپنی کڑیاں دی محبتاں آزماون لگ پوے پر اینی ناں ارسطو دے مطابق Error of Judgment اے یعنی بنیادی انسانی غلطی جہڑی دکھاں دا سبب بن دی اے۔ تے سلطنت دو کڑیاں نوں دے کے تے تیجی نوں محروم کر کے لیئر سمجھدا اے کہ اوہنے ٹھیک ای کیتا اے تے اوہدا خیال اے کہ اودیاں دونویں دھیاں تے اوہناں دے خاوند اوہنوں احترام دیندے رہن گے، بھاویں اوہ بادشاہ نہیں وی رہیا پر اوہناں دے دلاں وچ بادشاہ بن کے رہے گا پر اوہ نہیں سی جان دا کہ محبتاں مکدیاں جھٹ وی نہیں لگدا تے بوہت ساریاں محبتاں تے لوکاں دیاں مجبوریاں ہوندیاں نیں۔ دونواں دھیاں نے اوہنوں محلوں باہر کڈھ چھڈیا، اوہدے ہنجواں تے ہانواں دا اوہناں تے کوئی اثر نہیں ہویا دنیا کنی ظالم ہوندی اے، رشتے کنے جھوٹے ہوندے نیں اوہدا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں تے ایہہ قسمت کسے اک بندے دی نہیں۔ جتھے لیئر نال ایہہ سلوک ہو رہیا اے اوتھے گلوسٹر نال وی کجھ گھٹ نہیں ہو رہی۔ اوہدا ناجائز پتر اوہدے جائز پتر ایڈگر نوں جائیداد توں محروم کر دینا چاہندا اے تے اک جھوٹا خط لکھ کے گلوسٹر دے سامنے کجھ ایس طراں پیش کردا اے کہ اوہ من تے تیار ہو جاندا اے کہ ایہہ خط ایڈگر نے ای لکھیا اے تے اوہ اوہنوں قتل کر دینا چاہندا اے گلوسٹر وہمی جیہا بندہ اے تے سمجھدا اے کہ ہُنے ہُنے جہڑے سورج تے چن گرہن دے واقعے ہوئے نیں ایہہ

اوہناں دا نتیجہ اے کہ رشتے ترٹ بھج رہے نیں اوہ کہندا اے۔

"These late eclipses in the sun and moon portend no good to us: .... Love cools, friendship falls off, brothers divide: in cities, mutinies; in countries, discord; in palaces treason; and the bond crack'd 'twixt son and father" (Act-1,scene-2),(L-100-108)

ایہہ ہُنے ہُنے دے سورج تے چن گرہن ساڈے لئی چنگے نہیں رہے۔ محبتاں مک گئیاں، دوستیاں دا اللہ ای حافظ، بھائیاں اچ جھگڑے، شہراں اچ بغاوتاں، ملکاں وچ فساد تے محلاں وچ سازشاں، پیو تے پتر دے رشتیاں وچ تریڑاں، گلوسٹر دا ایہہ بیان کناں عالمگیر اے۔ ہن وی گلوسٹر جئے بندیاں دا گھاٹا نہیں جیہڑے اپنے پاپاں نوں شیطان دے ناویں لا کے چین دی مالا جپدے نیں۔ پر گلاسٹر دا ناجائز پتر ایڈمنڈ بھانویں ناجائز اے پر اوہ جان والا اے کہ سچ کیہ اے۔

This is the excellent foppery of the world, that when we are sick in fortune, often the surfeits of our own behaviour,we make guilty of our disasters the sun, the moon and stars; as if we were villains by necessity, fools by heavenly compulsion; knaves, thieves, and treacherous, by spherical predominance; drunkards, liars, and adulterers by an enforc'd obedience of planetary influence;

(L:119-127,Act:1,Scene:2)

لوکی کنے جھلے نیں جدوں کدے کوئی اوکڑ آن پوے جیہڑی ساڈے اپنے کرتوتاں بھاروں آوندی اے، کدی اسی سورج تے الزام لاندے آں کدی چن تے، کدی تاریاں تے، جیویں بدمعاشی ساڈی مجبوری ہووے، تے ساڈیاں حماقتاں اسمانوں اتر دیاں ہون، اسیں بدمعاش، چور، باغی وی ستاریاں دی گردش دے سببوں ہوندے آں، ساڈی شراب نوشی جھوٹ تے زنا سارے ای ستاریاں دی کارستانیاں نیں۔

شیکسپیئر نیں ایڈمنڈ راہیں کھل کھلا کے جیہڑیاں گلاں کیتیاں نیں اوس توں جاپدا اے کہ سولہویں صدی اچ گل کرنا کناں سوکھا سی۔ اک پاسے گلوسٹر جیہا تقدیر پرست اے تے دوجے پاسے ایڈمنڈ جیہا خوفناک حقیقت پسند۔ اوہدی حقیقت پسندی اوہدے اک ہور بیان وچ ویکھی جا سکدی اے، ایڈمنڈ جیویں کہ پہلاں دسیا گیا اے گلوسٹر دی ناجائز اولاد اے۔ ایڈمنڈ نوں اپنے ناجائز ہون تے کوئی پچھتاوا نہیں ویسے ایہہ اوہدا قصور وی نہیں پر جس انداز نال اوہ اپنے وجود دا جواز پیش کردا اے اوہ اوہدی لاابالی طبیعت دا پتہ دیندی اے۔

Thou, nature, art my goddess; to thy law
My services are bound. Wherefore should I
Stand in the plague of custom,.........
Why bastard? Wherefore base?
When my dimensions are as well compact,
My mind as generous, and my shape as true,
As honest madam's issue? Why brand they us,
With base? with baseness? bastardy? base,base?
Who, in the lusty stealth of nature, take
More composition and fierce quality

Than doth, within a dull, stale, tired bed,

Go to th' creating a whole tribe of fops,

Got'tween asleep and wake"

(Line:1-15),(Act:1,Scene:2)

"فطرت تے !توں ای میری دیوی ایں تے میری ساری حیاتی تیرے لئی اے تے فیر میں رسماں دے عذاب اچ کیوں پھساں۔ میں حرامی تے گھٹیا کیوں اکھواواں جد کہ میری شکل صورت اینی ای ٹھیک اے جناں کہ میرا دماغ، تے میں اک جائز پتر وانگر آں،لوکی میتوں گھٹیا کیوں کہندے نیں جدوں کہ میری پیدائش اوہناں نالوں زیادہ جوش وخروش وچ ہوئی اے جہڑے کہ بے لطف تے بے مزہ ڈھنگ نال پیدا ہوندے نیں تے جاگدی ستی کیفیت اچ ہندے نیں"۔

ایتھوں ایہہ جاپدا اے کہ تحریکِ احیائے علوم دے اثر پاروں کنی تبدیلی آئی سی۔

پر ایہہ گل سی ایڈمنڈ تے گلوسٹر دی جس توں سانوں اندازہ ہوندا اے کہ شیکسپیئر کس کس طراں دے کردار تخلیق کرسکدا اے پر لیئر دے کردار دی تخلیق بڑی نویکلی اے او وڈا شہنشا اے تے شہنشاہی طبیعت رکھدا اے، تے سب کجھ اپنی دونواں کڑیاں نوں دے چھڈ دا اے، تے فیر اوہدا کناں بُرا حشر ہوندا اے،اوہنوں پڑھ کے جند ڑی دی اوکڑاں دا پتا چلدا اے۔لیئر دی حالت بڑی افسوسناک اے دونویں کڑیاں اوہنوں محلوں باہر کڈھ چھڈ دیاں نیں۔فطرت پورے غیض وغضب وچ اے،ڈرامے دے تیجا ایکٹ تے پہلے سین وچ کینٹ تے اک ہور درباری دیاں گلاں توں طوفان دی شدت دا اندازہ لایا جاسکدا اے۔کینٹ پچھدا اے کہ بادشاہ کتھے وے تے درباری جواب دیندا اے:

"Contending with the fretful elements;

Bids the wind blow the earth in to the sea,

Or swell the curled waters 'bove the main,

That things might change or cease;"

(Line:4-6,Act:3,Scene:1)

"بادشاہ فطرت نال لڑ دا اے تے واواں نوں حکم دیندا اے کہ دھرتی نوں سمندر وچ ڈوبدے یاں سمندر دا سارا پانی کنڈھیاں توں باہر نکل آوے تاں جے سب کجھ مک مُک جاوے ایس توں اندازہ ہوندا اے کہ اوہدی ذہنی کیفیت کیہ اے"۔

اوہ آہستہ آہستہ پاگل ہو جاندا اے،اوہنوں کسے تھاں وی چین نئیں تے اودھر ایڈمنڈ دی سازش کامیاب ہو جاندی اے، تے ایڈگر وی طوفان اچ پھس جاندا اے تے پاگلاں جیہے کپڑے سپا کے جنگلاں اچ پناہ لیندا اے تے فیر وی خوش اے۔ایس لئی شروع اچ لکھیا گیا اے کہ ایس ڈرامے نوں پڑھ کے بڑا حوصلہ ملدا اے، بڑی روشنی ملدی اے تے بندہ حیاتی دیاں ساریاں اوکڑاں نوں ہس کھیڈ کے برداشت کرنا سکھ جاندا اے۔ایڈگر جدوں اپنے پیو کولوں ڈر کے تے پاگلاں دا روپ دھار کے جنگل اچ لکدا پھر دا اے تاں وی خوش اے،او کہندا اے کہ ہن ایس توں ودھ مشکل کیہ آسکدی اے، ہن جے کر کوئی تبدیلی آئی تے اوہ خوشیاں لے آوے گی اوہ کہندا اے۔

"Yet better thus, and known to be contemn'd

Than, still contemn'd and flatter'd. To be worst.

The lowest and most dejected thing of fortune,

Stands still in esperance, lives not in fear:

The lamentable change is from the best;

The worst returns to laughter."

(Act:4, Scene:1),(Line:1-6)

”میں اجے ای چنگاواں کہ میری حالت بہت ہی بُری اے۔ تے ہور بُری کیہ ہووے گی، میری قسمت بوہت مشکل اچ اے۔ تے ہن میتوں کوئی خوف نہیں مشکل توں بعد بہتری ای آسکدی اے، جدوں اوہ ویکھدا اے کہ اوہدے سارے دیاں اکھاں کڈھ دتیاں گئیاں نیں۔ تے اوہ ویکھ ای نہیں سکدا۔ تے اوہدا ہتھ کسے نے پھڑیا ہویا اے، تے اوہنوں بڑا دکھ ہوندا اے۔ تے اوہ کہہ اٹھدا اے"

"O gods! who is't can say" I am at the worst?

I am worse then ev'r I was."

(Act:4, Scene:1),(Line:25-27)

اے دیوتاؤ! کون کہہ سکدا اے کہ میری حالت سب توں بُری اے، میری حالت بُری اے ہاں ایہہ آکھیا جاسکدا اے کہ میری حالت پہلاں توں بری اے۔ ایڈگر ایہہ نتیجہ کڈھدا اے کہ انسان نوں ہمیشہ خوش رہنا چاہیدا اے، ایہہ سوچ کے کہ اوہدے نالوں وی زیادہ اوکڑاں وچ خورے کنے پھر دے نیں۔ تے ہن ایڈگر ایہہ وی ویکھدا اے۔ تے اسی وی ویکھدے آں کہ بادشاہ دا کیہ حال ہو گیا اے، تے اوہنے ہن صبر کرنا سکھ لیا اے۔ ہن اوہدے سامنے حیاتی دیاں ساریاں مشکلاں صاف صاف موجود نیں۔ اوہ زندگی اچ انصاف دا خواہش مند ہو گیا اے۔ ایس حالت اچ اوہ اپنی گوی کارڈیلیا کول پہنچدا اے۔ تے اوہنوں پچھان نہیں سکدا کیوں جے اوہ اپنے حواس کھو بیٹھا اے، کارڈیلیا جان دی اے کہ حیاتی کیہ اے، ایس لئی اوہ کہندی اے:

We are not the first

who, with best meaning have incurred the

worst.

(Act:5,Scene:3),(Line:4-5)

”اسی کوئی پہلے نہیں، جہناں نے اپنے نیک ارادیاں دے ہوندے ہویاں بدترین

حالات برداشت کیتے نیں“۔ جدوں کارڈیلیا نوں شکست ہو جاندی اے۔ تے گلوسٹر خودکشی کرنا چاہندا اے۔ تے ایڈگر اوہنوں سہارا دیندا اے۔ تے کہندا اے“۔

What,in ill thoughts again?

Men must endure

Their going hence, even as their coming hither:

Ripeness is all. (Line:9-11),(Act:5,Scene:2)

”فیر اوہی ماڑی سوچ سوچن آلیاں نوں چاہیدا اے کہ اوہ مرنا وی سکھ لین جیویں اوہناں نے جینا سکھیا اے۔ حیاتی ای سب کجھ“

ایڈگر دا ایہہ قول سونے نال تولنا چاہیدا اے۔ زندگی اوکھی ہووے یا سوکھی اوہنوں بہادری نال گزارنا چاہیدا اے حیاتی دا کم ایہو ای اے کہ ایہہ چلدی رہووے۔ جیہڑا بوٹا لگدا اے اوہ پھلدا پھلدا اے۔ تے فیر وڈھیا جاندا اے، ایہو گل انہاں لئی وی سچی اے۔ غالبؔ نے آکھیا سی

تابِ لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جان جنی وی عزیز ہووے اوہنے مکنا ہوندا اے۔ تے ایہہ مکنا نویں حیاتی لئی جگہ بناندا اے۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

شیکسپیئر دا ایہہ شاہکار زندگی دا بھرواں ثبوت پیش کردا اے۔ بادشاہ محلوں باہر ہنیریاں دا مقابلہ کردا اے پر ہتھیار نہیں سٹدا۔ ایڈگر ہر سازش دا مقابلہ کردا اے۔ تے اپنے پیو دا سہارا بن دا اے۔ کارڈیلیا مسیح وانگر قربانی دیندی اے حسینؓ وانگر کربلا دے میدان اچ سچ دا جھنڈا اچا کردی اے۔ ایڈمنڈ، گونرل، ریگن تے کارن وال برائی دی علامت نیں، تے ایہہ علامتاں مٹ جاندیاں نیں پلیتی۔ تے ایڈگر نیکی دا مجسمہ نیں۔ تے حیاتی نوں اگے لے کے ٹرپیندے نیں۔

شکیسپیئر کوئی نیکی دا مبلغ نہیں اوہنے تاں حیاتی نوں جیویں اوہ ہے پیش کر چھڈیا اے۔ کارڈیلیا ہار جاوے یاں اوہ بھاویں لگ جاوے اوہنوں ایدھے نال کوئی سروکار نہیں کیوں جے اوہ جان دا اے کہ ایس دنیا اچ کئے عیسیٰ کئے حسین قربان ہوندے رہن گے۔ ایہہ ای وجہ اے کہ

قتلِ حسین روز کا معمول بن گیا
دنیا میں آج بھی ہے حکومت یزید کی

اٹھارہویں صدی دے نقاد ڈاکٹر جانسن نے آکھیا سی کہ کارڈیلیا دے حشر توں ایہہ پتا چلدا اے کہ شیکسپیئر نیں اخلاقیات نوں وڈھ کے رکھ دتا اے، پر اوہ آپ ای شیکسپیئر دی تعریف وی کر دا اے کہ اوہنے حیاتی نوں شیشہ وکھایا اے۔ تے شیشہ تے ہر شے ویکھ گا چاہے اوہ کسے نوں چنگی لگے، نہ لگے پر ایدھے اچ شک نہیں کہ شیکسپیئر دے ڈرامے اچ سکھن لئی بہت کجھ اے۔ جدوں گلاسٹر دیاں اکھیاں کڈھ دتیاں گئیاں اوہ کہندا اے۔

I stumbled when I saw; full oft 'its seen,

Our means secure us and our mere defects

Prove our commodities." (Act:4,Scene:1),(Line:20-22)

جدوں ویکھوں دسدا سی تے میرے پیر تلکدے رہے سن۔ ایہہ ویکھیا گیا اے کہ جدوں ساڈے کول ذرائع ہوندے نیں تے سانوں زیادہ ای بھروسہ ہو جاندا اے تے ساڈی کمزوریاں ساڈے لئی فائدہ مند ثابت ہوندیاں نیں۔ جدوں گلاسٹر دیاں اکھیاں کڈھ دتیاں جاندیاں نیں تے اوہنوں اصل حیاتی دا پتا چلدا اے تے اوہ غریباں بارے سوچنا شروع کر دیندا اے۔

" That will not see

Because he does not feel, feel your power

quickly;

So distribution should undo excess,

And each men have enough."

(Act4...Scene1),(Line:69-72)

جیہڑا محسوس نہیں کردا اوہنوں کجھ وی نظر نہیں آوندا تے اوہ اسماناں والے دی طاقت محسوس نہیں کر سکدا اساں۔ جے صحیح تقسیم ہووے تے ہر بندے نوں اوہدا حق ملے۔ جدوں کینٹ نوں کارن وال نے چھڈ دا اے تے اوہ کہندا اے۔

" Nothing almost sees miracles

But misery:"

(Act2..scene2),(Line:160,161)

معجزے صرف مشکلاں وچ ای نظر آوندے نیں، جدوں لیئر حواس کھو بیٹھدا اے تے حقیقتاں اوہدے مونہوں چوں نکلنا شروع ہو جاندیاں نیں۔

See how yond justice rails upon yond simple thief. Hark, in thine ear: change places and handy-dandy, which is the justice, which is the thief? thou hast seen a farmer's dog bark at a begger?.....

And the creature run from the cur?.....

A dog's obey'd in office.

Thou rascal beadle, hold thy bloody hand!

Why dost thou lash that whore? Strip thine own back;

Thou hotly lusts to use her in that kind

For which thou whipp'st her. The usurer hangs the

cozener in tatter'd clothes small vices do appear;

Robes and furr'd gowns hide all."

(Act: 4, Scene: 6),(Line:149-163)

ویکھو! اوہ قاضی کیویں اس چورنوں ڈانٹ رہیا اے۔ کن وچ سنو! ایہناں دی جگہ بدل دیو۔ تے پتا ای نئیں چلے گا کیہڑا چور اے تے کیہڑا قاضی۔ تسی ویکھیا ہووے گا کہ اک کسان دا کتا فقیر نوں ویکھ کے بھونکدا اے تے جدوں اوہ کتا نظر آ جاندا اے تے نس پیندا اے۔ ویکھو جے کتا دفتر اچ بیٹھا ہووے تے اوہ وی حکمران ہووے گا۔ اے بدمعاش منصف! اپنے ہتھ نوں روک۔ توں اوس کنجری نوں کیوں کوڑے مار رہیا ایں۔ اپنی پٹھ نوں ننگا کر کیوں جے خود اوہنوں ورتنا چاہندا ایں، تے کوڑے کیوں مارنا ایں۔ ویکھو سود خور دھوکے باز نوں پھانسی چڑھا رہیا اے۔ چیتھڑیاں وچ بڑے گناہ نظر آندے نیں۔ تے چوغے تے عباواں، گناہواں نوں چھپالیندیاں نیں۔

لیئر خورے کیہ کیہ کہندا جاندا اے، اوہنوں سچائی ہُن نظر آئی اے جدوں اوہ ننگا پُچا ہو گیا اے، محلوں باہر نکل آیا اے، جنگل اچ۔ تے اوہنوں اپنی کڑی وانگا جیہا قصوروی کتاں وڈا جاپدا سی۔ ہُن اوہنوں ساری دنیا دھوکے باز تے مکار نظر آندی اے۔

چیتے رہوے جو کجھ لیئر آکھیا اے یا گلوسٹر نے کہیا اے یا کسے ہور نے کہیا اے اوہ شیکسپیئر دا آکھان نیں۔ شیکسپیئر نیں تے ہر بندے نوں کہن دی اجازت دتی اے۔ تے اوہ اک نقاد دے مطابق رب وانگر چپ چپیتا بیٹھا سب کجھ ویکھدا پیا اے۔ دُسّن دا پیا اے، وکھاندا پیا اے تے سنادا پیا اے۔ انج کنگ لیئر اوہ شیشا اے جدے راہیں حیاتی ہی حیاتی جھاتیاں ماردی پئی اے تے انج کر کے مرے خیال اچ لیئر پڑھن والی شے اے تے، ویکھن والی شے اے۔ ایس ڈرامے نوں جناں پڑھو گے، جناں ویکھو گے، خورے کیہ کیہ سامنے آوے گا۔

☆-☆-☆-☆-☆

افسانے

ٹیلی فون

قصہ ہے ان دنوں کا جب عالمی گاؤں کو عالمی گاؤں بنانے والا جدید الہٰ دین کا چراغ ہاتھ نہیں لگا تھا، یعنی موبائل فون معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا اور عاشقوں کے کام آسان نہیں ہوئے تھے۔ ایک زمانہ تو وہ تھا جب پیام کا کام کبوتر سرانجام دیا کرتے تھے اور دل زدہ عاشق کہا کرتے ہوں گے کہ

واسطہ ای رب دا توں جاویں وے کبوترا
چٹھی میرے ڈھول نوں پچاویں وے کبوترا

لیکن شاید کبوتروں نے اپنا یہ حسین فرض سرانجام دینا بند کر دیا تھا یا پھر عاشقوں کے ہاتھ تحریر کی دولت لگ گئی تھی کہ انہوں نے محبت نامے تحریر کرنا شروع کر دیئے۔ لیکن یہ محبت نامے بڑے ہی خطرناک ہوا کرتے تھے، دل کا کیا پتا ہوتا ہے کہ کب کسی پہ آجائے، اور پھر یہ محبت نامے قیامت نامے بن جاتے تھے۔ خیر ان سے جان چھوٹی اور ٹیلی فون ہاتھ لگا لیکن یہ ٹیلی فون جو ایک ہی جگہ جامد ہوتا تھا اور Privacy کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی، وہ تو بھلا ہو ان سائنسدانوں کا جنہوں نے موبائل جیسی طلسمی قوت نامراد عاشقوں کے ہاتھ میں تھما دی۔

کچھ تو دل والوں کی سائنس نے سنی
عشق موبائل نے آساں کر دیا

تاہم اس کہانی کا تعلق اس دور سے ہے جب ابھی موبائل فون ایجاد نہیں ہوا تھا اور لینڈ لائن ٹیلی فون ہی سارے کام سرانجام دیتا تھا۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے یہ کوئی واقعہ ہے پندرہ بیس سال پہلے کا جب ٹیلی فون پر CLI کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا اور معلوم ہی نہیں ہوا کرتا تھا کہ فون کرنے والا ہے کون؟ جب تک کہ آپ اس کی آواز نہ پہچان لیں یا وہ خود نہ بتا دے۔ چنانچہ اس ٹیلی فون پر جہاں اور بہت سے کھیل کھیلے جاتے تھے وہاں عشق و محبت کا کھیل بھی کھیلا جاتا تھا۔ کسی

نے کسی کو فون کیا۔ "ہائے آپ کی آواز کتنی اچھی ہے اور ٹیلی فون سننے والا جھوم جھوم اٹھا، اور ان دیکھا اور انجانے پیاروں سے پیار کی پینگیں بڑھنے لگیں۔

تیمور خوش قسمت تھا کہ اس کے کمرے میں ٹیلی فون تھا اور اسے فیملی کے دوسرے افراد Disturb نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ جس سے چاہے بات کرے اور جو چاہے اس سے کوئی بات کرے۔ فیملی کے افراد اس کی دلجوئی میں لگے رہا کرتے تھے کہ کسی طرح تو اس کا دل بہلے، کسی سے بات کر لیتا ہے تو کیا ہے! چند سو روپے بل ہی تو ہے نا!...... یہ کوئی مہنگا سودا نہیں لیکن ٹیلی فون بھی تو تیمور کا دل نہیں بہلا سکا تھا........ دل کو کوئی دل دار چاہیے تھا اور دل دار کہاں ملتے ہیں ------ البتہ دل لگی کرنے والے ٹیلی فون پر مل سکتے تھے، کبھی کبھی وہ یہ سب کچھ کر بھی لیا کرتا تھا لیکن ایک رات...... بڑی اداس رات تھی وہ، معلوم نہیں تیمور اتنا پریشان کیوں تھا، کئی نغمے سنے، پر دل تھا کہ بہلتا ہی نہیں تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیور اٹھایا "آپ کون بول رہے ہیں؟..... میں ..... میں...... میں، آپ کون ہیں... آپ کون ہیں؟" "چلو چھوڑو ...... دیکھو دیکھو میں بہت اداس ہوں......" "تم بھی اداس ہو"

اچھا اچھا، کچھ دیر بات کر لیجئے نا "....اس موہنی سی نسوانی آواز نے کہا۔ آواز کیا تھی، جادو تھا۔ تیمور کچھ کھو سا گیا...... "نہیں نہیں یہ Flirt نہیں ہو سکتی" اس نے دل میں کہا۔

اچھا تو بات کیجئے میں سن رہا ہوں۔ تیمور نے کہا اور پھر کوئی ایک گھنٹہ مسلسل دونوں باتیں کرتے رہے، لیکن ایک دوسرے کو نام نہیں بتایا اور پھر نام میں رکھا ہی کیا ہے اور کہتے ہیں نا، پھول کو جس نام سے بھی پکار لیں پھول ہی ہوتا ہے، تیمور نے خدا حافظ کہا۔

رات کا کوئی ایک بج گیا تھا وہ کچھ دیر اس موہنی اور میٹھی آواز کے بارے میں سوچتا رہا، اور سوچتے سوچتے اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا... پھر اس نے کیا کیا خواب دیکھے اس کے بارے تو ہمیں کچھ معلوم نہیں لیکن تمام دن وہ ہشاش بشاش رہا۔ اس کا کہیں اتا پتا معلوم ہو جائے نا..... تو کتنا اچھا رہے گا"۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اتا پتا نہ

سبی بات ہی کرنی ہے نا، کتنی پیاری ہے اس کی آواز؟ وہ کتنی حسین ہوگی!...... یوں تیمور کا سارا دن گزر گیا پھر رات ہوئی، بارہ بج گئے...... کوئی گھنٹی ہی نہیں بجی.... پھر ایک گھنٹی بجی.... تیمور نے جلدی سے ریسیور اٹھایا... ہیلو.... تیمور نے کہا ادھر سے کوئی آواز ہی نہیں آئی ایک دو منٹ وہ سراپا سماعت بنا رہا مگر کوئی آواز نہیں آئی اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ایسے ٹیلی فون اسے پہلے بھی آتے رہتے تھے، کوئی بات کر لیتا تھا! کوئی نہیں!.........

وہ اس کے بارے میں زیادہ سوچا بھی نہیں کرتا تھا لیکن آج بات کچھ اور تھی اس کے دل کے تار بج اٹھے تھے اور اس کی روح پیار کے نغمے الاپ رہی تھی" یہ چند منٹوں میں کیا ہو جاتا ہے... کیا ہو جاتا ہے.... بھلا چنگا انسان شدبد کھو بیٹھتا ہے۔ تیمور کا حال بھی برا ہوتا جا رہا تھا اس نے الماری کھولی ایک ٹیبلٹ لی اور پھر کچھ دیر کے بعد اسے نیند آ گئی ایک دستک ہوئی!" تیمور بیٹا ابھی تک اٹھے نہیں اٹھو!" یہ اس کی ماں کی آواز تھی جو بوڑھی ہو چکی تھی...... تیمور ہی اس کی واحد امید تھا۔ تیمور ہڑ بڑا کر اٹھا اور دروازہ کھولا، تمام دن وہ پریشان سا رہا، اداس اداس کھویا کھویا، کبھی کوئی چیز اٹھاتا پھر اسے پھینک دیتا، اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا، ریسیور یونہی اٹھا لیتا کہ جیسے وہی آواز آ رہی ہو اور کبھی کبھی اسے یوں لگنے لگتا کہ وہی آواز آ رہی ہے۔ لیکن پھر اسے یہ سب سراب دکھائی دینے لگتا۔ یہ دن کے چند گھنٹے اسے صدیاں معلوم ہونے لگے تھے، وقت رک سا گیا تھا، ویسے وقت تھوڑا چلا جا رہا تھا اسے لگتا تھا جیسے سارے ہی مفلوج ہو گئے ہوں، لولے لنگڑے ہو گئے ہوں، وہ کسی کو آواز دینے لگتا تو رک جاتا اس نے دوپہر کا کھانا بھی صحیح طریقے سے نہیں کھایا تھا، اسے کوئی شے اچھی ہی نہیں لگتی تھی، اس کا خیال آتے ہی وہ خیالوں کے ہچکولوں میں جھولنے لگتا تھا، وہ تو بڑا حقیقت پسند ہوا کرتا تھا اسے کیا ہو گیا تھا ایسے لمحوں میں کسی کو کیا ہو جایا کرتا ہے کوئی حکیم نہیں جانتا کسی طبیب کو معلوم نہیں یوں سارا دن پہاڑ سا دن گزر ہی گیا۔ کبھی وہ اپنے آپ سے کہتا "نہیں یار کچھ نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوا ٹھیک تو ہوں میں۔ وہ تمام دن اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا، کبھی کوئی گانا سن لیا اور کبھی گانا گنگنانے لگتا، کوئی اسے ملنے آ جاتا تھا تو اس کا دل بہل جاتا تھا

لیکن آج کوئی اسے ملنے نہیں آیا تھا، قدرے پریشانی میں صبح شام میں ڈھل گئی..... پھر وہی رات.... پھر وہی تنہائی.... پھر وہ انتظار...... اتنا انتظار تیمور نے کبھی نہیں کیا تھا اور اب وہ ایک انجانی آواز کا انتظار کر رہا تھا..... وہ انجانی آواز رہ کہاں گئی تھی؟ لاکھ انجانی تھی پر اب اسے اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔ کوئی گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی، اس نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا، "Sorry کل میں آپ سے بات نہیں کر سکی، کچھ مہمان آ گئے تھے"۔

اب وہ بھی اس سے مانوس سی ہو گئی تھی، پہلی ٹیلی فون کال میں وہ طویل گفتگو کر چکے تھے، "پلیز اپنا نام تو بتا دیں" میرا نام...... آپ کیا کریں گی؟ اچھا مجھے تیمور کہتے ہیں... آپ کا نام کیا ہے؟ ہاں میں اب تمہیں آپ نہیں کہوں گی اور تم بھی مجھے آپ مت کہنا، "تم" میں کتنی اپنائیت ہوتی ہے.... ہے نا تیمور۔ ہاں تو میرا نام سلمیٰ ہے ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا" "کیا تمہیں اپنا نام پسند نہیں"؟ ہاں پسند ہے، پسند کیوں نہیں! پھر ان ٹیلی فون کالز کی تعداد بڑھنے لگی، ایک دن سلمیٰ نے اسے ملنے کی خواہش کی لیکن تیمور ہچکچانے لگا، تم مجھے مل کر کیا کرو گی "دیکھو! اچھا نہیں لگتا"، "اچھا کیوں نہیں لگتا"؟..... میں تمہیں ملنے آؤں گی اور میرا ایک کزن بھی ساتھ ہو گا اکیلی تو نہیں آ سکتی نا! تیمور پریشان سا ہو گیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات بہت آگے بڑھ جائے، معلوم نہیں نتیجہ کیا نکلے لیکن ایک دن دستک ہوئی "تیمور نے دروازہ کھولا، آیئے اندر آ جایئے..... سلمیٰ کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ سلمیٰ کچھ پریشان سی ہو گئی "تیمور! تمہیں نظر نہیں آتا کیا؟.... تم دیکھ نہیں سکتے؟..... اُف تم دیکھ نہیں سکتے..." "ہاں........ سلمیٰ کوئی دس بارہ سال پہلے میری بینائی ضائع ہو گئی تھی، چلو اندر چل کے بیٹھتے ہیں"، تیمور نے کہا

اور پھر وہ کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہے۔ تیمور نے اپنے بارے میں بتایا اپنے مشاغل بتائے، سلمیٰ بھی محوِ گفتگو رہی، ہنستی بولتی رہی لیکن کبھی کبھی تیمور کو سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں، جیسے کسی اشاروں کناؤں میں اپنے ساتھی سے کچھ کہہ سن رہی ہو لیکن وہ کچھ ایسا مدہوش سا تھا کہ وہ صورتِ حال کا تجزیہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

سلمیٰ نے کہا ''تمہاری بینائی ٹھیک نہیں ہوسکتی کیا؟''

''شاید نہیں...'' تیمور نے کہا

''چھلیئے کیافرق پڑتا ہے''

تیمور کچھ پریشان تھا اسے سلمیٰ کی آواز میں وہ مٹھاس اور شیرینی محسوس نہیں ہورہی تھی جو شاید فون پر ہوا کرتی تھی، شاید یہ اس کا اپنا خیال تھا۔

پھر وہ کئی بار اسے ملنے آتی رہی لیکن کبھی تنہا نہیں آئی، ہمیشہ اس کے ساتھ اس کا کوئی ساتھی بھی ہوتا تھا۔ اس طرح پانچ چھ ماہ گزر گئے اس دوران تیمور بھی کبھی کبھار فون کرلیتا اور سلمیٰ کو تو شاید معلوم تھا کہ تیمور سے بات کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ وہ تو اکثر و بیشتر تنہا ہی رہتا ہے۔ دل ہی دل میں تیمور سلمیٰ کو بہت چاہنے لگا تھا، وہ اپنی ماں سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے کرتے رہ گیا تھا، معلوم نہیں کیوں؟

کچھ دنوں، بلکہ کچھ ہفتوں تک سلمیٰ نے کوئی فون نہیں کیا، تیمور بھی فون نہیں کرسکا اور جب کیا بھی تو کوئی اجنبی آواز سنائی دی،

''آپ کون بول رہے ہیں؟''

''میں میں... میں میں۔''

''تم ہر وقت ٹیلی فون پر تنگ کرتے رہتے ہو پتا نہیں آپ جیسے لوگوں کے پاس وقت کہاں سے آجاتا ہے۔ سلمیٰ کی شادی ہوگئی ہے، اپنے کزن نثار کے ساتھ''۔

تیمور کے ہاتھ سے فون چھوٹ گیا اور وہ دھڑام سے چارپائی پر ڈھیر ہوگیا۔

☆☆☆

احمد بابا

عظمت خان ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انجینئر رہے تھے۔ تیس۔ پینتیس سال جاں توڑ محنت کی، خاصا کمایا لیکن پوری زندگی اچھے اصولوں کی پیروی کی، ڈسپلن کو کبھی نہیں توڑا، وقت کی پابندی کرتے رہے، آپ چاہیں تو ان کے معمولات سے اپنی گھڑی کا وقت درست کرلیں۔ اُن کا باقاعدہ ایک شیڈول تھا، کام کرنے کا، سونے کا، اخبار پڑھنے کا اور بچوں سے گپ شپ لگانے کا۔ ان کی گپ شپ اعلیٰ اقدار کے اردگرد گھوما کرتی تھی۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کو اپنے اصولوں کا جیتا جاگتا پیکر دیکھنا چاہتے تھے۔ ''آخر یہ میرے بچے ہیں، میرا فرض ہے کہ ان کی رہنمائی کروں اور کرتا رہوں'' وہ کہا کرتے تھے۔ لیکن وہ اتنی نصیحتیں کیا کرتے تھے اور انہیں بار بار دوہرایا کرتے تھے کہ ان کے بچوں پہ بڑی حد تک منفی اثرات مرتب ہونے لگے تھے، وہ ہر وقت کی نصیحتوں سے اکتا گئے تھے لیکن انہیں اپنے ابو میں خوبیاں بھی نظر آتی تھیں، اس لئے کبھی تو بڑی اکتاہٹ کا اظہار کرتے اور کبھی کبھی ان کی تعریف بھی کرنے لگتے ''ابو'' ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ انہوں نے بااصول زندگی گزاری ہے اور اصولوں سے بڑھ کر اور کیا بات ہوسکتی ہے، طارق کہتا ''یہ کیا بات ہوئی ہر وقت نصیحتیں، ہر وقت نصیحتیں آخر ہم خود بھی تو کچھ جانتے ہیں اور ہماری بھی کوئی سوچ ہے'' بلال کہتا، ''سچ پوچھو تو مجھے ابو کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ کیا ہوا جو بار بار سننا پڑتی ہیں۔ دیکھو ناقرآن میں نماز پڑھنے کا حکم کتنی بار آیا ہے۔ اللہ ایک بار بھی تو کہہ سکتا تھا، ایک بار بھی تو حکم دے سکتا تھا'' تحریم کہتی، کلثوم کبھی تائید کردیتی کبھی تردید۔

مسز خان بڑی متوازن طبیعت رکھتی تھی اور اپنے کاموں میں لگی رہتی تھی عظمت خان کا بہت خیال رکھتی تھی اور کبھی کبھی وہ اس پر برس پڑتے تھے اس کی سنتے ہی نہ تھے لیکن وہ سنی ان سنی کر دیا کرتی تھی۔ اس طرح زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔ مسز خان نے عظمت خان سے کہا ''بچیاں بڑی ہورہی ہیں کچھ ان کا تو سوچو'' ہاں تم ٹھیک کہتی ہو خان صاحب نے کہا اور چند ہی سال میں

دونوں بچیوں کی شادی کر دی۔ان کے بیٹے ان کی خواہش کے مطابق نہ تعلیم حاصل کر سکے تھے اور
نہ ہی کوئی ہنر سیکھ سکے تھے۔انہوں نے کسی نہ کسی طرح انہیں بھی معروف کر ہی دیا اور ان کی
شادیاں ہو گئیں بیٹیاں اپنے گھر چلی گئیں، بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ اپنے گھروں میں آباد ہو
گئے۔خان صاحب اور مسز خان آپس میں گفتگو کرتے رہتے اور یوں وقت گزرتا رہتا۔لیکن
ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی زندگی میں بڑی تبدیلی آئی،ان کی زندگی میں وہ تحرک اور جوش وخروش نہ
رہا جو ہوا کرتا تھا اور وہ بڑے سا کتائے اکتائے رہنے لگے۔انہوں نے بڑی تلاش کے بعد اپنے کام
کاج کے لئے ایک ملازم کا انتخاب کر لیا جس کا نام احمد تھا،لیکن خان صاحب اسے احمد بابا کہا
کرتے تھے،احمد بابا اچھا انسان تھا، جو چھوٹا موٹا کام خان صاحب کہتے وہ کر دیتا لیکن سب سے
بڑا کام یہ تھا کہ وہ ان کی باتیں سنے، ماضی کی کہانیاں سنے اور ان کے اصولوں اور اعلیٰ اقدار پہ مبنی
گفتگو سنے اور ہاں میں ہاں ملائے۔ویسے احمد بابا نہایت دھیمے مزاج کا انسان تھا اور بہت ہی
غریب آدمی تھا،اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، بیٹی اس نے بیاہ دی تھی مگر بیٹوں کو کوئی ملازمت
نہیں مل سکی تھی کبھی کوئی وہ ایک کام کر لیتے،کبھی دوسرا کام کر لیتے۔احمد بابا بھی چند جماعتیں پڑھا
ہوا تھا،کوئی خاص ہنر وہ بھی نہیں جانتا تھا،عظمت خان ملازمت سے پہلے لوگوں کے گھروں میں
چھوٹے موٹے کام کر لیا کرتا تھا اور تھوڑا بہت پڑھائی لکھائی کا کام مختلف دکانوں پہ کر لیا کرتا
تھا۔اس کا ایک مکان تھا جو اس نے اپنی بچی کی شادی کے موقع پر فروخت کر دیا تھا کچھ پیسے سے
شادی کر دی اور کچھ اس کی اپنی اور اس کی بیوی کی بیماریوں پر خرچ ہو گئے اور کچھ بچے لے
بھاگے۔اب وہ قدرے خوش تھا کہ اسے دو وقت کی روٹی مل رہی تھی، یہی غنیمت تھی۔خان
صاحب جو کچھ اسے ماہوار دیتے وہ خوشی خوشی قبول کر لیتا،ویسے بھی خان صاحب اس کے دکھ سکھ
کے ساتھی رہے تھے،انہیں یقین تھا کہ وہ انتہائی بااصول آدمی ہے۔خان بابا بھی اصول پرست
آدمی تھا اگرچہ حالات نے اسے بڑی مشکلات میں ڈال دیا تھا لیکن پھر بھی وہ خدا کا شکر ادا کرتا۔
مولا جس حال میں تو رکھے تیری بندہ پروری ہے،احمد بابا کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔خان

صاحب جب کبھی اسے پریشان حال دیکھتے،اس کی کچھ مدد کر دیتے۔اس کے یا اس کی بیوی کے
لئے دوائیاں خرید دیتے،اس لئے خان بابا ان کا بڑا ممنون تھا اور انہیں کہا کرتا تھا"خدا کرے کہ
میری زندگی آپ کی خدمت میں گزر جائے،آپ جیسے فرشتہ خصلت انسان کہاں مل سکتے ہیں۔"
خان صاحب کہتے"مجھے چھوڑو بس جو نیکی مجھ سے ہو سکی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے محنت کی ہے
،رزقِ حلال کمایا ہے،کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا،میں دھوکے کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور احسان
فراموشی میرے نزدیک ایک بہت بڑا جرم ہے"احمد بابا دل کا اچھا تھا اس کا بھی یہی خیال تھا اور وہ
کہا کرتا تھا"جی خان صاحب!کسی کو دھوکا دینے سے بہتر یہ ہے کہ انسان مر جائے اور پھر اپنے
پیاروں کو دھوکہ دینا.........ان پیاروں کو جو آپ کے لئے ہر سکون فراہم کرتے ہوں"تم نے یہ
اچھی اچھی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟"خان صاحب!حیرت سے پوچھتے""آپ ہی سے تو سیکھی
ہیں خان صاحب آپ ہی میرے آقا و مولا ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ آپ میرے ہر دکھ میں میری
مدد کرتے ہیں اور خان صاحب میری تو کیا آپ ہر ایک کی مدد کرتے ہیں"خان صاحب بہت خوش
تھے کہ انہیں ملازم کی صورت میں اتنا اچھا مصاحب مل گیا ہے وہ اپنی اہلیہ سے کہتے،احمد،میرے
بڑھاپے کا سہارا ہے،تم تو میری بات سنتی ہی نہیں ہو،اپنے کاموں میں لگی رہتی ہو،ایک خان بابا
ہے اتنا ایماندار،اتنا دیانت دار اور خوش اخلاق"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔آپ کا وقت گزر رہا ہے اور کیا
چاہیے۔میں بھی اپنا وقت کام کاج میں کاٹ ہی لیتی ہوں کبھی تحریم آ جاتی ہے کبھی کلثوم یا کبھی میں
ان سے ٹیلی فون پر بات کر لیتی ہوں اور کبھی آپ سے بھی تو بات ہو جاتی ہے نا۔خان صاحب ہنس
دیتے"اور وہ تمہارے بیٹے کبھی چکر ہی نہیں لگاتے اور کبھی آتے ہیں تو ایسے جیسے آتے ہی نہ ہوں"
چلو بیچارے کسی دھندے میں لگے رہتے ہیں،انہوں نے بھی تو پیٹ پالنا ہے نا،آپ کو تو دوسروں کا
خیال رہتا ہے اپنوں کا نہیں""یہ تمہارے بیٹے محنت کیوں نہیں کرتے میں نے بھی تو ساری زندگی
محنت کی ہے""اب تو آپ زیادہ ہی سخت ہوتے جا رہے ہیں،اپنے گھر کا کوئی خیال ہی نہیں
رکھتے،اتنی سخاوت بھی اچھی نہیں ہوتی""میں کب کنجوسی کرتا ہوں،بس الٹے تلکے مجھے پسند نہیں

ہیں، سادہ زندگی ہونی چاہیے۔ دیکھو ہمارے حضورؐ کتنے سادہ تھے'' ''میں کون سی فضول خرچی کرتی ہوں، آپ تو پیسے پیسے پہ مہر لگانے لگے ہیں۔ خان صاحب کی کچھ پنشن تھی جو انہیں ہر ماہ مل جاتی تھی اور کچھ پیسہ انہوں نے کاروبار میں لگا رکھا تھا اور وہاں سے بھی انہیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی لیکن وہ اپنی بیوی کو یہی تاثر دیتے تھے کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ انہیں بے سوچے سمجھے خرچ کر دیا جائے، چنانچہ وہ اپنی آمدنی اس سے چھپا کر ہی رکھا کرتے تھے، کچھ بنک میں، کچھ کہیں گھر پہ، تا کہ جب ضرورت پڑے تو وہ استعمال کر لیں۔

ادھر ایک دن احمد بابا اپنے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوا بہت پریشان ہے، بیوی پوچھتی ہے، آپ کو کیا ہو گیا ہے وہ جھلا کر کہتا'' کچھ بھی نہیں، کیا ہونا تھا مجھے، ٹھیک تو ہوں میں، تم اپنے کام سے کام رکھو'' وہ چڑ چڑا سا ہو جاتا ہے۔ اول تو احمد بابا کا چڑچڑا ہونا قدرتی بات تھی ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں مشکل سے دو تین چارپائیاں آتی تھیں، ایک چھوٹی سی الماری اور کچھ بکسے، دراصل وہ ایک ایسے مکان کے کمرے میں رہتا تھا جس کے ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی فیملی رہتی تھی، بس زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔ احمد بابا کچھ دنوں سے پریشان بھی تھا اس کا ایک بیٹا کسی مصیبت میں پھنس گیا تھا اور اس سے کچھ پیسوں کا تقاضا کر رہا تھا، بابا جیسے بھی ہو کوئی انتظام کرو، ورنہ میری مشکلیں بہت بڑھ جائیں گی، وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے'' ''وہ کون'' ''کوئی بھی ہو بابا کچھ پیسوں کا انتظام کر دو'' احمد بابا نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے، وہ کئی بار خان صاحب سے قرضہ لے چکا تھا، اسے کچھ اور مانگتے شرم آتی تھی وہ تو بن مانگے ہی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے، چنانچہ بابا پریشان رہنے لگا تھا اور آج تو اسکی پریشانی دیدنی تھی، کبھی وہ کوئی الماری پھرولتا اور کبھی کوئی بکسا، کبھی اپنے تکیے کے نیچے جھانکتا'' آپ کیا تلاش کر رہے ہیں'' بیوی نے کہا'' چپ کرو تمہیں کیا ہے'' ساری رات خان بابا کو نیند نہیں آئی، اگلے دن خان صاحب نے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم پریشان کیوں ہو؟ پیسوں کی ضرورت تو نہیں؟ نہیں خان صاحب نہیں۔ یہ لو، کوئی وٹامن استعمال کرو تمہاری صحت بگڑتی جا رہی ہے، تم اتنے اچھے آدمی ہو تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے، میں

تمہیں کسی Specialist کے پاس لے جاؤں گا'' سارا دن احمد بابا الجھا ہوا اور کھویا کھویا رہا۔ گھر جا کر کونے کھدروں میں ہاتھ مارنے لگا''۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے اتنے الجھے ہوئے کیوں ہو بیوی نے پوچھا'' ''میں الجھا ہوا نہیں ہوں تمہارا وہم ہے'' رات کو اس نے صحیح طرح کھانا بھی نہیں کھایا اور سو گیا۔ سوتا ہوا چیخ مار کر اٹھا، بیوی نے پوچھا کیا ہو گیا ہے؟ میں نے بڑا ڈروانا خواب دیکھا ہے، جیسے پولیس مجھے پکڑنے آئی ہے۔ اللہ کا نام لو تین بار قل شریف پڑھو اور سینے پر پھونک مار لو، آج اس سے سورۃ اخلاص بھی نہیں پڑھی جا رہی تھی، وہ بڑا پریشان تھا، دو راتیں پریشانی میں گزر چکی تھیں، وہ زیادہ Tension برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس کا سر پھٹا جا رہا تھا کہ اچانک اطمینان کے آثار اس کے چہرے پر ہویدا ہونے لگے۔ وہ بغیر ناشتہ کئے خان صاحب کے گھر جا پہنچا، خان صاحب اپنے لان میں ٹہل رہے تھے'' آج اتنی جلدی کیوں آ گئے ہو'' خان صاحب نے کہا! خان جی!! خان جی ---- کیا بات ہے؟ کہو۔ وہ جی.... وہ جی'' وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے، خان جی..... میں آپ کے بیس ہزار روپے اٹھا لے گیا تھا..... جو آپ کی الماری میں پڑے تھے'' احمد... تم..... تم!''

☆☆☆☆☆

بھول بھلیاں

آج وہ اتنا خوش تھا جتنا وہ شاید زندگی بھر کبھی خوش نہیں ہوا تھا۔اس دن بھی نہیں، جب کلاس میں ماسٹر صاحب نے اس کی بھرپور تعریف کی تھی اور اس کے بڑا آدمی بننے کی پیش گوئی کی تھی، اس دن بھی نہیں جب وہ پہاڑی مقامات کی سیر کے لئے گیا تھا اور اس کے چاروں طرف دلآویز مناظر اور رنگ و بو نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور اسے لگا تھا کہ اگر دنیا میں جنت ہے تو وہ بس یہیں ہے۔وہ تو اتنا خوش اس دن بھی نہیں ہوا تھا جب اس نے اخبار میں اپنا رول نمبر دیکھا تھا اور ایف ایس سی میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔آج کی خوشی انوکھی خوشی تھی جیسے ساری کامیابیاں اسے سلام کرنے آئی ہوں، ساری خوشیاں اس کے اشاروں پر رقص کر رہی ہوں، ساری دلکش شامیں اور دلفریب صبحیں اس کے اردگرد جمع ہوگئی ہوں۔وہ بن ٹھن کے اپنی شخصیت کا تمام جادو مجتمع کر کے باہر دروازے پر کھڑا تھا کہ اسے آواز آئی "شہزاد بھائی وہ آرہے ہیں"۔صائمہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔شہزاد کی حالت ہی دگرگوں ہوگئی۔اسے جانے کیا ہوگیا تھا۔اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور رنگ اڑ گیا، اس کے پاس ہی اس کی موٹر بائیک تھی جسے اس نے سٹارٹ کیا اور پوری سپیڈ سے چلانا شروع کر دیا۔اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، ایسا لگتا تھا کہ وہ بائیک پر بیٹھا ہوا بائیک سے بھی کہیں زیادہ تیز دوڑ رہا ہو، پیچھے دیکھنا اسے یارا نہ تھا۔جیسے وہ دیوتا Orpheus ہو اور اپنی پیاری دلہن Eurydice کو عالم ارواح سے اس شرط پر واپس لایا ہو کہ اسے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا، بس چلتے جانا ہے، چلتے جانا ہے، آگے ہی آگے چلتے جانا ہے، کبھی اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی آسیب اس کا پیچھا کر رہا ہو اور یہ کہہ رہا ہو کہ اگر اس نے پیچھے دیکھا تو وہ پتھر کا ہو جائے گا۔ویسے تو وہ پتھر ہوتا جا رہا تھا مگر اس پتھر میں جوش و خروش بلا کا پیدا ہو گیا تھا، کمال قوت پیدا ہو گئی تھی۔اسے کوئی پرواہ تک نہیں تھی کہ اس کے آگے کوئی نشیب ہے یا فراز، وہ کہیں چھپ جانا چاہتا تھا، دور چلا جانا چاہتا تھا، جیسے اس سے کوئی قتل ہو گیا ہو، کوئی ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہو جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔آدھ پون گھنٹے بعد جب وہ تھک ہار کر چور ہو گیا تو اسے ایک چھوٹا سا ہوٹل نظر آیا، اس نے اپنی بائیک کھڑی کی اور ہوٹل میں داخل ہو گیا اور ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔ویٹر اس کی طرف بڑھا "سر آپ کو کیا چاہیے؟ کیا۔۔۔کیا؟ مجھے کچھ نہیں۔۔۔کچھ نہیں"۔ویٹر "سر آپ ٹھیک تو ہیں۔۔۔۔۔چائے پیا پسند کریں گے"؟

"چائے! نہیں۔۔۔نہیں! ٹھہرو میں ابھی بتاتا ہوں" وہ پریشانی میں نڈھال وہاں بیٹھا رہا اور پھر اچانک آواز دی ویٹر پانی کا ایک گلاس، ویٹر پانی لے آیا، "سر اور کیا چاہیے"۔۔۔اور۔۔۔اور کچھ نہیں۔۔۔کچھ نہیں! وہ پانی کا گھونٹ لینے لگا، ایسا لگتا تھا کہ وہ پانی پی ہی نہیں سکے گا، پانی اس کے گلے سے پار ہو ہی نہیں رہا تھا عجب کیفیت تھی، ادھر کچھ آنکھیں اسے عجیب وغریب انداز سے دیکھنے لگیں، چہ میگوئیاں ہونے لگیں، وہ خود بھی خوفزدہ تھا کہ کوئی اسے کہیں جاسوس نہ سمجھ لے وہ وہاں بیٹھا رہا۔۔۔۔بیٹھا رہا۔

پانی کا گلاس کبھی ہونٹوں کو لگاتا کبھی میز پر رکھ دیتا، آج وہ پانی بھی نہیں پی سک رہا تھا، اس نے گلاس رکھ دیا اپنے خیالات میں گم اپنی آنکھیں بند کر لیں ایک آواز آئی "خیریت تو ہے بھائی! کیا ہو گیا ہے" وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا "ٹھیک ہوں، ٹھیک ہوں۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں"۔

یوں کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا وہ وہاں سے اٹھا باہر نکلا اور موٹر بائیک ادھر ادھر گھمانے لگا، ایسا لگ رہا تھا کہ وقت گزر ہی نہیں رہا تھا، کسی نے وقت کو زنجیر کر دیا ہے، وقت تھم کر رہ گیا ہے وقت ہی کیا وہ خود بھی تھم سا گیا تھا، رُک سا گیا تھا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔یوں دو گھنٹے گزر گئے اس کی حالت مارلو کے ڈاکٹر فاسٹس جیسی تھی جسے اپنی زندگی کا آخری گھنٹہ گزارنا قیامت نظر آ رہا تھا۔اندھیرا پھیلنے لگا، اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے گھر واپس جانا چاہیے۔اب اس میں وہ تیزی نہ تھی جو گھر سے نکلتے وقت تھی، اب وہ تھکا ہارا، مضمحل سا ہو گیا تھا، وہ کوئی دو اڑھائی گھنٹے بعد اپنے گھر پہنچا، اس کی بہن صائمہ دروازے پر کھڑی تھی۔

بھیا! آپ کہاں چلے گئے تھے، میں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا آپ کا کہیں پتا ہی نہیں

چلا۔کتنی عجیب بات ہے۔سونیا اوراس کی بہن دونوں آئے تھے۔آپ کے بارے میں کئی بار پوچھا،میں پریشان تھی کہ کیا جواب دوں،وہ کوئی پون گھنٹہ ٹھہریں،میں نےان کی خاطر مدارت تو خوب کی لیکن میں حیران تھی کہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔آپ کوتو سونیا کا بڑاانتظار تھابھیا! آپ ہی نےتو کہا تھا کہ کسی صورت انہیں ایک بار بلاؤ ایک بار بلالونا!

شہزاد خاموش ہوگیا ،اچھا ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا،میں تھک گیا ہوں ،بہت تھک گیا ہوں،مجھے نیند آرہی ہے۔وہ سوگیا،رات کے کوئی تین بجے اس کی آنکھ کھلی،وہ غور کرنے لگا کہ اسے کیا ہوگیا تھا۔محبت کا وہ کون ساجذبہ تھا،محبت کی کیسی لہر تھی۔احساس کی یہ کونسی حدت تھی جس نےاسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اسے ایسا کیوں لگنے لگا تھا کہ وہ سونیا کا سامنا نہیں کر سکے گا،جیسے وہ اسے دیکھتے ہی خاک ہو جائے گا،راکھ ہو جائے گا۔دن گزرتے گئے،وقت گزرتا گیا ،پھر سونیا کبھی نہیں آئی اوراس نے سونیا کے بارے میں کچھ زیادہ سوچا بھی نہیں،اس نے ایم اے انگلش کرنے کا ارادہ کیا،میں جو کہ انگریزی کا استاد تھا اس کے عزیز رشتہ دار مجھ سے پڑھتے رہے تھے،اس نے بھی مجھ سے پڑھنا شروع کر دیا،میں اپنے طلباء اور طالبات کو صرف کتابیں نہیں پڑھاتا بلکہ لگے ہاتھوں زندگی کی کتاب پڑھانے کا اہتمام بھی کرتا رہتا ہوں اور طلباء و طالبات کو دوست گردانےلگتا ہوں،ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہوں ،تاکہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے،سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں جیسے میرے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوایک طلباء پر ہی کیا موقوف طالبات کی بھی یہی کیفیت ہے،وہ جو بات اپنی سہیلیوں سے بلکہ اپنی قریبی سہیلیوں سے نہیں کرپاتیں مجھ سے اس طرح کہہ دیتی ہیں جیسے انہیں کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئی، مجھے فخر ہے میں بھی اپنی زندگی کے کئی اوراق انہیں سنانے لگتا ہوں،ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ تدریس کا عمل ایک باہمی تجربہ ہے،ہم اپنے طلباء سے بہت کچھ سیکھتے ہیں،جانتے ہیں،ہر طالب علم ایک کتاب ہوتا ہے۔اس کو پڑھ کر بڑا ہی مزہ آتا ہے،روشنی ملتی ہے۔آہستہ آہستہ شہزاد بھی مجھ سے کھلنے لگا،اپنی ہر بات بتانے لگا ،اس نے مجھے بتایا کہ سر ایک بات بتایئے،میں آپ سے پوچھنا

چاہتا ہوں،وہ میں نے اپنے آپ سے کئی بار پوچھنا چاہی لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا اور کسی اور سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ویسے شہزاد کی اب شادی ہو چکی تھی وہ ایک بچی کا باپ بھی تھا لیکن اسے اس شام کا واقعہ نہیں بھولا تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے اس نے مجھے ہر بات تفصیل سے بتائی،اس نے کہا سر اس دن میں صبح سے گھر کو سجانے میں لگا رہا تھا ،ایک ایک چیز قرینے سے رکھی،میری بہن صائمہ جو مجھ سے چھوٹی تھی اس نے بھی گھر کو سجانے سنوارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔سونیا اس کی کلاس فیلو تھی اور ایک دوبار ہمارے گھر آ بھی چکی تھی۔ایک بار میری نظر اس پر پڑی تو پھر اٹھ نہ سکی ،کیا جادو تھا اس میں،کیا حسن تھا،لفظوں میں طاقت ہی نہیں کہ اسے بیان کرسکوں۔سر! آپ نے بہت کچھ پڑھا ہے ،ادب کے بہت سے کرداروں کا تجزیہ کیا ہے لیکن سونیا جیسا کردار مجھے کتابوں میں ملا ہی نہیں۔لیکن سر! مجھے اس دن کیا ہو گیا تھا میں گھر سے کیوں بھاگ گیا تھا،میں نےتو خود ہی بلایا تھا،خود ہی کوشش کی تھی،سر! مجھے کیا ہو گیا تھا۔۔۔کیا ہوگیا تھا؟۔سر کچھ تو بتایئے نا! بتایئے نا یہ کیسا جذبہ تھا کیا میں پاگل ہو گیا تھا یا کسی آسیب نے مجھے آلیا تھا! کیا تھا؟۔۔۔سر بتایئے نا! کچھ تو بتایئے نا!

میں خاموش ہوگیا میں کیا بتاتا یہ تو محبت کی فتنہ سامانیاں ہیں،نیرنگیاں ہیں اور قیامت خیزیاں ہیں۔میں خاموش ہوگیا،وہ بھی خاموش ہوگیا،بہت دیر خاموش رہا اور پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔اچھا سر! میں چلتا ہوں ۔اس نے کہا اور چلا گیا اور مجھے حیرت زدہ کر گیا بلکہ شکستہ دل بھی،ایسی حیرت اور دل شکستگی جس نے مجھے اس سے کبھی اس موضوع پر بات ہی نہ کرنے دی اور نہ اس میں کبھی اس موضوع پر بات کرنے کی سکت پیدا ہوئی اور نہ ہی جرأت۔

☆☆☆☆☆

میرا اُستاد

"پرلے درجے کے بے وقوف ہو تم یار" کمال کیا تم نے، خود بھی پھنستے ہمیں بھی پھنسوا دیتے" امجد نے سعید سے کہا "اور کیا!" توقیر نے اضافہ کیا۔ سعید، امجد اور توقیر جانے کیسے دوست بن گئے تھے، ہاں آپ دوست ہی کہہ سکتے ہیں، سعید کا تعلق بڑے ہی غریب گھرانے سے تھا۔ ماں بے چاری سارا دن گھر گھر ہستی کرتی رہتی، اس کے بچے کبھی ایک سے لڑتے کبھی دوسرے سے جھگڑتے، وہ کبھی ایک بیٹی کو ڈانٹتی کبھی دوسری کو۔ باپ غریب آدمی تھا بے چارہ، کوئی خاص ہنر اس کے پاس تھا نہیں۔ بس کچھ کتابت جانتا تھا اور کتابت کی بساط سمٹتی جا رہی تھی، کمپیوٹر کا دور جو شروع ہو چلا تھا چند ایک کمپیوٹر ان کے شہر میں بھی آ گئے تھے اس لئے سعید کے والد تہور علی کو دو وقت کی روٹی کمانا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ جانے کیسے گزارہ کرتا تھا وہ بے چارہ۔

بہر حال سفید پوشی تھی جو کسی نہ کسی طور اس نے قائم کر رکھی تھی۔ مولا نے اس کا بھرم رکھا ہوا تھا لیکن کہتے ہیں ناں مصیبت اکیلی نہیں آتی بہت سی مصیبتوں کو ساتھ لے کر آتی ہے۔ تہور علی بیمار رہنے لگا تھا اور اب ذمہ داری بڑی حد تک سعید کے کاندھوں پر آ گئی تھی وہ محلے کے بچوں کو پڑھا دیتا اور دو پیسے کما لیتا۔ خود بھی اس نے صرف میٹرک ہی کیا ہوا تھا، نمبر بھی زیادہ نہ تھے پھر بھی اس نے کالج میں داخلہ لے ہی لیا تھا۔ کالج میں امجد اور توقیر سے اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا تھا وہ ایک ہی کلاس میں جو تھے۔ امجد خوشحال فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس کا باپ بہت بڑا سماجی کارکن تھا، ہر وقت سماجی کاموں میں الجھا رہتا تھا اور اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ رکھتا تھا چنانچہ دونوں اتنے معروف ہو گئے تھے کہ انہیں اپنے اکلوتے بیٹے امجد کی کوئی زیادہ پرواہ نہ تھی، گھر میں ایک ملازمہ تھی جو گھر کے کام کرتی رہتی تھی اور وہی امجد کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی، ماں باپ کو تو سماج سدھار ہی سے فرصت نہ تھی وہ اسی میں مگن رہتے تھے اسی میں خوش رہتے تھے، گھر کے سدھار کا خیال انہیں کبھی نہیں آیا

تھا۔ امجد تنہا تنہا سا محسوس کرنے لگا تھا اس نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن تو لے لی تھی لیکن پڑھائی سے اس کا جی کچھ اُچاٹ ہی سا ہو گیا تھا، توقیر کی کہانی کچھ امجد سے مختلف نہ تھی اس کا والد معروف عالمِ دین تھا۔ کبھی کہیں خطبہ دیتا تھا کبھی کہیں وعظ کرتا تھا، تھک ہار کر گھر پلٹتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی سائرہ بھی تھی، توقیر اور سائرہ الجھے الجھے سے رہتے تھے ان کی ماں اتنی پڑھی لکھی نہیں تھی کہ ان کی نفسیاتی الجھنوں کو سمجھ سکتی جب وہ اپنے شوہر نامدار سے ان کا ذکر کرتی تو وہ کہہ دیتے "بچا گوان فکر مت کرو، سب اوپر والا کرتا ہے، وہ سارے کام آسان کر دیتا ہے" وہ اَن پڑھ تھی کوئی زیادہ بحث تو نہیں کر سکتی تھی لیکن کبھی کبھی یہ ضرور کہہ دیتی تھی" کچھ گھر کا خیال بھی رکھ لیا کریں مولانا" وہ ہنس دیتا، وہ ہنستا صرف گھر ہی میں تھا، باہر اس کے چہرے پر بڑی سنجیدگی اور تمکنت طاری رہتی۔

بہر کیف سعید، امجد اور توقیر تینوں کا تعلق معاشرے کے مختلف الخیال طبقوں سے ضرور تھا لیکن انہیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ تینوں ایک ہی طبقے اور ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہوں۔ تینوں کو کم و بیش ایک ہی طرح کے مسائل درپیش تھے شاید اس لئے بھی ان کی دوستی بڑھنے لگی تھی اور بڑی گہری ہوتی جا رہی تھی، دوستی کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی الجھنیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کے اقتصادی مسائل بھی بڑھ رہے تھے ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں نے ان میں عجیب و غریب خیالات پیدا کر دیئے تھے۔ وہ دل بہلانے کے لئے کبھی کسی Tuck shop پہ چلے جاتے۔ کبھی کوئی فلم دیکھ لیتے یا پھر ادھر ادھر کبھی کسی دکان دار کے پاس اور کبھی کسی اور دوست کے پاس وقت گزارتے رہتے۔ "یار یہ دنیا عیش کر رہی ہے مشکلیں کیا ہماری قسمت میں ہی لکھی ہیں' امجد کو عجیب خیال آیا" کہہ تو کچھ ٹھیک ہی رہے ہو یار" توقیر نے کہا "ہوں، ہاں!" سعید سے کوئی جملہ نہ بن پڑا۔ آہستہ آہستہ تینوں دوست زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لیے ناپسندیدہ مشغلوں میں وقت گزارنے لگے، انہیں کبھی کبھی خود بھی حیرت ہوتی کہ انہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ تینوں کے والدین ان کی ذہنی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے۔ ایک دن تینوں ایک دوکان میں داخل ہوئے اور ایک نقلی ریوالور سے دکان دار کو ڈرا دیا اور اس کے سیف میں سے بہت سی رقم نکال لی۔ بس کیا تھا غلط

زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کوئی مہم سر انجام دے لیتے کبھی کوئی، لیکن وہ اپنے دل میں بہت خوش بھی نہیں تھے۔ اسی دلی اُلجھن کو دور کرنے کے لئے ہی تو شاید وہ ان راستوں پر چل پڑے تھے۔

ایک دن تینوں ایک محلے سے گزر رہے تھے۔ "یار یہ مکان بہت خوب ہے" امجد نے کہا "ہاں" توقیر نے کہا "ہاں ہاں ہاں" سعید بھی بڑبڑایا اور آنے والی شب کو وہ تینوں اس محلے میں تھے۔ وہ کچھ رقم ان کو بھی دے آئے تھے جن کو دینا ضروری تھا۔ اب انہیں اس دھندے کے سارے گُر آ گئے تھے، بڑا اعتماد پیدا ہو گیا تھا ان میں۔ وہ اس مکان کے قریب پہنچ گئے جو انہوں نے دن میں نشان زد کیا تھا دیواریں زیادہ بلند نہ تھیں انہیں پھلانگنا ذرا بھی مشکل نہ تھا وہ کچھ دیر کے لئے رُکے اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اب تو رات کے کوئی دو بج گئے تھے، وہ پانچ منٹ باہر ہی ٹھہرے رہے۔ سب سے پہلے دیوار پھلانگنے والا سعید تھا پھر امجد اور پھر توقیر۔ وہ صحن میں پہنچ گئے فیملی کے سارے افراد صحن ہی میں سوئے ہوئے تھے، ایک بچے کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ کون! کون! اور پھر چیخا، گھر کا سر براہ اُٹھ کھڑا ہوا، وہ کچھ سویا ہوا تھا اور کچھ جاگ رہا تھا لیکن کمال مستعدی تھی اس میں۔ کون ہو تم...... کون ہو تم! تینوں نے ماسک چڑھائے ہوئے تھے۔ سعید بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور بُری طرح ٹھٹک گیا سر، سر! آپ بولیئے نہیں اور اس نے امجد اور توقیر کو اشارہ کیا کہ وہ واپس لوٹ جائیں اور تینوں دیوار پھلانگ کر باہر بھاگ گئے، بہت تیز دوڑے امجد اور توقیر کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ سعید نے ایسا کیوں کیا ہے۔ کچھ دور جا کر ٹھٹکے اور پھر گفتگو کرنے لگے۔ سعید نے بتایا "یہ تو میرا استاد تھا ناں یار"

☆☆☆☆☆

کنول

کنول زندگی کی کوئی پینتیس چھتیس بہاریں دیکھ چکی تھی اور اب اس کے رنگ وروپ میں وہ تازگی اور شگفتگی نہیں رہی جو ہر آنکھ کو اپنا اسیر بنا لیتی تھی، اگر کوئی نظر اُٹھتی تھی تو اسی کی جانب اٹھتی تھی جب وہ رنگ ونکہت کی آغوش میں زندگی گزار رہی تھی، اس کی خوش مزاجی نے اسے زندہ و تابندہ رکھا ہوا تھا۔ اب بھی اس میں بلا کی کشش تھی، اس کی گفتگو میں وہ شیرینی تھی کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خوش قسمت تھی کہ ابھی حال ہی میں اس کی شادی اسد سے ہوئی تھی جو اس سے پانچ چھ سال چھوٹا تھا لیکن ذہنی شگفتگی اور فکر کی جولانی سے مالا مال تھا ان کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اور انہیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ رشتۂ ازدواج میں بس آج ہی منسلک ہوئے ہوں، انہوں نے اپنے پہلے دن اور پہلی رات کے حسن اور جاذبیت کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا تھا۔ کنول نے ایم اے انگلش کر رکھا تھا اور اسد بھی ادب کا طالب علم تھا اگرچہ اس نے ایم بی اے کر کے ایک فیکٹری میں ملازمت حاصل کر لی تھی لیکن اس کا ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کبھی ماند نہیں پڑے تھے چنانچہ جب وہ اکٹھے ہوتے تو ادب پر گفتگو ان کا مرغوب موضوع ہوتا اور ادب سے زندگی کا تعلق استوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہ اسد کہتا "تم کتنی خوبصورت ہو، کتنی جاذبِ نظر، حسین رنگوں کی طرح، حسین پھولوں کی طرح" کنول کچھ شرما سی جاتی لیکن پھر بے ساختہ کہہ اٹھتی تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے اور پھر دونوں مسکرانے لگتے اور قہقہے لگانے لگتے۔ کنول کہنے لگتی "کیا ہماری محبت ہمیشہ ایسے ہی رہے گی؟ کیا اسے ماہ و سال کی نظر تو نہیں لگ جائے گی؟" ماہ و سال ہمارے اپنے ہیں، ہمارے اپنے یار بیلی، ہمیں نظر کیوں لگائیں گے! جب ہم نے انہیں تر و تازہ اور دل کش رکھا ہے تو یہ ہمیں تازگی اور دلکشی عطا کیوں نہیں کریں گے وہ کہہ اٹھتا۔ اس طرح وہ ادب اور زندگی کے بارے میں خوش گپیاں لگاتے ہی رہتے لیکن بعض اوقات بات کرتے

کرتے کنول کچھ رُک سی جاتی، تھم سی جاتی، سہم سی جاتی، جیسے کوئی اسے پیچھے سے ڈراونی آواز سنائی دے رہی ہو، اسد کہتا "کنول تمہیں کیا ہو جاتا ہے، تمہاری گفتگو میں کبھی کبھی روانی نہیں رہتی۔ پگلی! میں جانتا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں، ماضی سے تعلق منقطع نہیں ہو سکتا، ماضی ہمیں اکثر پکارتا ہے کبھی ہمیں کوئی دل کش آواز سنائی دیتی ہے تو کبھی کوئی ناخوشگوار۔ تو پھر کیا ہوا، ماضی سے ہم کٹ تو نہیں سکتے" کنول کو کچھ سہارا سا ہو جاتا، اس کی کچھ ڈھارس سی بندھ جاتی۔ ایک دن اس نے اسد سے پوچھا تم نے "Hardy" کا ناول Tess of the D'Urbervilles پڑھ رکھا ہے ہاں" کیوں نہیں "تو پھر تمہاری Angel Clare کے بارے میں کیا رائے ہے" "پگلا! محبت کے بارے میں غلط دعوے کرتا تھا اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ محبت ہوتی کیا ہے! اور جب اسے معلوم ہوا تو محبت کرنے کا وقت گزر چکا تھا، گدھا کہیں کا" یہ گفتگو سن کر کنول کی ڈھارس بندھتی۔ کنول Tess نہیں تھی نہ وہ Tess کی صورتحال سے دوچار ہوئی تھی۔ Tess تو اپنے ایک نوجوان مالک Alec کی ہوس کا شکار ہو چکی تھی، ایک بچے کو جنم دے چکی تھی جو اللہ کو پیارا ہو چکا تھا اور جب وہ ایک اور نوجوان Angel Clare کی دیوانگی کا مرکز بنی تو وہ یہ سوچ کر کانپ کانپ جاتی تھی کہ وہ اپنے ماضی سے کیسے بچ سکے گی وہ Angel Clare کو بار ہا بتاتے بتاتے رہ گئی اور جب شادی کی پہلی رات انجل کلیئر نے اسے سب کچھ اپنی محبتوں کے بارے میں بتا دیا تو اسے بھی حوصلہ ہوا اور اپنے خلوص و محبت کے جوش میں اسے سب کچھ بتا بیٹھی اس کا بتانا ہی تھا کہ انجل کلیئر بالکل بدل گیا اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اُسے اس وقت ہوش آیا جب Tess، ایلک کو قتل کر چکی تھی اور اسے سولی پر لٹکایا جانے والا تھا۔

جس معاشرے سے کنول کا تعلق تھا وہاں تو لڑکی کے بارے میں ایک ذرا سی بات بھی ایک بھیانک سکینڈل کا روپ اختیار کر لیتی تھی، شادی سے قبل کی کنول ایک ہنستی کھیلتی خوش مزاج لڑکی تھی، جانے کون کون اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا لیکن اپنانے کے لئے شاید کوئی تیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کا تعلق نہایت غریب خاندان سے تھا، باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور ماں نے محنت

اور مشقت سے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تھی اور اس کی خوشی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار رہتی تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور گھر کا ماحول بھی اتنا صاف ستھرا اور دل پذیر رکھا تھا جس میں کنول جیسی ہونہار اور خوش اخلاق بچیاں بآسانی زندگی کو سمجھ سکتی تھیں لیکن معاشرے کو تو دولت درکار تھی، جہیز درکار تھا اور جانے کیا کیا اور یا پھر حسن سے اٹکھیلیاں کرنے کی خواہش...... کنول صورتحال سے پوری طرح واقف تھی ایک دو نوجوان اسے متاثر کر چکے تھے، اسے بالآخر معلوم ہوا تھا کہ وہ اس سے نہیں اس کے حسن سے محبت کرتے تھے، یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جو اسے پژمردہ اور افسردہ کر رہی تھی، اسے مریض بنا رہی تھی لیکن کنول تو ایک سلجھی ہوئی جہاں دیدہ ماں کی بیٹی تھی اور اس سے بڑھ کر وہ ادب کی طالب علم تھی، وہ ادب کے کرداروں سے قوت حاصل کرتی تھی۔ اس نے شیکسپیئر کا معرکتہ الآرا ڈرامہ "کنگ لیئر" پڑھ رکھا تھا، وہ جانتی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ زندگی کی سفاکی انسانی قوت اور حوصلے پر غالب نہیں آ سکتی وہ کنگ لیئر کی بیٹی Cordelia کو اپنا آئیڈیل سمجھتی تھی جس کو اس کے باپ کنگ لیئر نے صرف اس لئے جائیداد سے محروم کر دیا تھا کہ وہ اپنی دو بڑی بہنوں کی طرح چاپلوس نہیں تھی اور وہ جانتی تھی کہ کارڈیلیا نے اپنی خوبصورتی اور دل آویزی کو اپنے کردار کی بلندی سے قائم رکھا تھا، اس نے شیکسپیئر ہی کا ڈرامہ O t h e l o بھی پڑھ رکھا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کس طرح خوبصورت Desdemona کا گلا اس کے حبشی محبوب نے دبا دیا تھا، اگرچہ وہ ایک جرنیل بن چکا تھا لیکن اس کا حبشی پن قائم تھا یہ سب کچھ سوچ کر وہ کانپنے لگتی۔ اسے خیال آتا کہ کہیں اسد بھی اس سے بدگمان نہ ہو جائے، اسے ماضی کے ایک آسیب نے گھیر رکھا تھا وقتاً فوقتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی، کبھی وہ اسے نظر انداز کر دیتی اور کبھی اٹھا لیتی، شروع شروع میں تو جب وہ ٹیلی فون اٹھاتی تو کوئی آگے سے نہیں بولتا تھا۔ لیکن پھر ایک دن اسے آواز آئی، وہ شمشاد کی آواز تھی "تم بچ کر کہاں جاؤ گی، مجھے تمہارے سارے راز معلوم ہیں" اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور پریشان ہو گئی۔۔۔۔۔ بہت ہی پریشان۔

شام ہو چکی تھی اسد دفتر سے آنے والا تھا،اس نے خوش باش ہونے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ افسردہ افسردہ سی تھی ۔"کنول! کیابات ہے پریشان کیوں ہو" کچھ بھی نہیں ویسے ہی،اچھا آج دفتر میں کوئی خاص بات ہوئی کچھ مجھے بھی بتاؤناں" کچھ بھی نہیں کنول !بس دفتر کی تو ایک روٹین لائف ہوتی ہے اور کیا ہوتا ہے،اچھا تو میں ذرا نہالوں ، میں ابھی آتا ہوں،تم کھانا لگا دو، اسد باتھ روم کی طرف چلنے لگتا ہے، ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے،کئی گھنٹیاں بجتی ہیں،وہ ریسیور آف نہیں کرنا چاہتی کہ کہیں اسد کو کوئی شک نہ پڑ جائے۔وہ ریسیور اٹھا لیتی ہے،کنول! میں تمہارے شوہر کو سب کچھ بتا دوں گا۔تمہاری زندگی تباہ کر دوں گا" کنول پہلے تو پریشان ہو جاتی ہے،اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی ہے مگر پھر سنبھل جاتی ہے"شمشاد.....شمشاد! میری بات سنو۔میری بات سنو! پلیز دیکھو تمہیں کیا ملے گا تم میری زندگی تباہ کر کے کیا کرو گے؟ جب تم مجھے حاصل کر سکتے تھے۔۔۔۔تم نے حاصل نہیں کیا۔۔۔۔کیونکہ تم مجھے حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے،تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے تھے، میں سب کچھ سمجھ گئی تھی، دیکھو سنو! میرا شوہر ایک روشن خیال انسان ہے وہ سب کچھ سمجھ سکتا ہے وہ تم جیسے پلید لوگوں سے اچھی طرح واقف ہے اور یاد رکھو وہ تمہیں سیدھا کر دے گا اور تم میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے"اور پھر وہ ریسیور کریڈل پر رکھ دیتی ہے وہ جونہی مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے اسد کھڑا ہوتا ہے وہ مسکرا دیتا ہے۔اسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے،وہ اسے گلے لگا لیتا ہے اور چومنے لگتا ہے،تم کنول ہو،میری کنول! نہ کسی کی تھی اور نہ کسی کی ہو سکتی ہو۔

☆☆☆☆☆

چڑیا

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں گورنمنٹ کالج لائل پور میں ایم اے انگلش کا طالب علم تھا، میں نے کہا "لائل پور" جی ہاں! ان دنوں فیصل آباد کا نام لائل پور ہی تھا۔یہ ناموں کی بات بھی خوب ہے،کوئی انسان اپنا نام بدلنا چاہے تو بڑی مشکل ہوتی ہے،شہروں کا نام جو لاکھوں نفوس پر مشتمل ہوتا ہے بدلنے میں پل بھی نہیں لگتا،ویسے نام ہی بدلتے ہیں،کام ویسے ہی رہتے ہیں۔ چلئے چھوڑیئے! میں کہہ رہا تھا کہ میں ان دنوں ایم اے انگلش کا طالب علم تھا،ایم اے انگلش ہمارے لئے کسی قیامت کے منظر سے کم نہ تھا،ہم اتنے ڈرے ڈرے سہمے سہمے سے رہتے تھے جیسے ہم کسی ایسے جزیرے میں پھنس گئے ہوں جہاں کوئی جہاز یا کشتی دستیاب نہیں ہو سکتی جو ہمیں اپنی دھرتی سے منسلک کر دے۔اساتذہ نے پہلے پانچ چھ دن تو Reference Books لکھوانے ہی میں لے لئے جس سے یہ اندازہ ہوا کہ ہر نصابی کتاب کی تفہیم کے لئے پانچ دس کتابیں اور پڑھنا پڑیں گی، دس پندرہ طالب علم تو اس خوف سے Subject ہی چھوڑ گئے تھے اور ہم جو باقی رہ گئے تھے اساتذہ کی طرف بڑی عقیدت سے تکا کرتے تھے کہ شاید وہ ہمیں کوئی ایسا گر بتا دیں کہ ہماری مشکل آسان ہو جائے۔بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ خوف کچھ کم ہونے لگا،بعض اساتذہ نے Tips بتانا شروع کر دیں اور نوٹس دینا شروع کر دیئے اور کہا کہ گھبراؤ نہیں، پاس تو تم ہو ہی جاؤ گے،مگر ایک پروفیسر ایسے تھے جن کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایم اے انگلش کرنا کوئی آسان نہیں۔ پڑھاتے وہ بہت دلچسپی سے تھے ،انہیں اپنے مضمون پر دسترس بھی حاصل تھی،انگریزی بھی وہ پنجابی لہجے میں نہیں بولتے تھے،ان کی ہر بات ہم بڑی توجہ سے سنا کرتے تھے بلکہ سننے پر مجبور تھے۔ایک دن ایک کونے سے آپس میں باتیں کرنے کی آواز آئی،وہ بڑے غصے سے بولے "تم باتیں کر رہے ہو،اٹھا کر کھڑکی سے اس طرح پھینکوں گا کہ کئی فرلانگ دور جا کر گرو گے" اگر کوئی اور یہ جملہ ادا کرتا تو شاید ہم ہنسنے لگتے مگر ان کی زبان سے یہ جملہ سن کر ہم پر خوف

طاری ہوگیا، بچ بچ کا خوف۔وہ کلاس میں ہمیشہ سنجیدہ رہتے تھے اور بڑے عالمانہ انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے اور جب وہ گفتگو کرتے تھے تو بڑا ہی لطف آیا کرتا تھا۔

ایک دن یوں ہوا کہ وہ پڑھا رہے تھے کہ ایک چڑیا اچانک کمرے میں داخل ہوئی، وہ کبھی ِادھر سے اِدھر کبھی ِادھر سے اُدھر........اور اس طرح بڑی ہی Disturbance پیدا ہو رہی تھی۔سنجیدہ اور باتمکنت پروفیسر صاحب کے لئے صورتِ حال کچھ عجیب وغریب ہوتی جارہی تھی، ہم سوچ رہے تھے کہ وہ چڑیا ان سے کیوں نہیں ڈرتی اور شاید یہ خیال ان کے دل میں بھی آرہا ہو۔ان کے چہرے پر اچانک ایک مسکراہٹ پھیل گئی، وہ ہنسنے لگے........دیکھو دیکھو۔۔۔"سنو! دیکھتا ہوں کہ تم میں سے کون چڑیا کو باہر نکالے گا"۔تمام کلاس خاموش رہی مگر ایک سیدھا سادا سا طالب علم جو کلاس میں کچھا لگ تھلگ رہتا تھا، اٹھا اور اپنا رومال لیا، وہ چڑیا کی طرف لپکا، چڑیا کبھی ایک کونے میں کبھی دوسرے کونے میں، کبھی چھت پر کبھی کسی کرسی پر لیکن اس ہمارے دوست میں جانے اس دن کہاں سے بلا کا جوش آگیا تھا، وہ تُل پڑا تھا کہ چڑیا کو باہر بھگا کر رہے گا اور اگر وہ ایسا نہ کرپایا تو بہت بُرا ہوگا، وہ جیت گیا چڑیا ہار گئی اور بھُر سے دروازے سے باہر نکل گئی، تالیاں۔ تالیاں۔۔۔تمام کلاس تالیاں بجانے لگی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے باتمکنت اور سنجیدہ پروفیسر صاحب بھی تالیاں بجانے لگے، ان کی تالیوں پر طلباء کو جوش آگیا اور ایک نے کہا کہ "اختر ہمارا ہیرو ہے" اس دن کمال ہی ہوگیا تھا، انجانا اختر، جانا پہچانا بن گیا تھا، اسے کہتے ہیں زیرو سے ہیرو۔اختر پھولا نہیں سماتا تھا جیسے اس کے سر پر ہُما بیٹھ گیا ہو اور وہ بادشاہ بن گیا ہو، یا جیسے کہ وہ اِیڈی پس ہو، وہ اِیڈی پس جس نے اہلِ Thebes کا ناک میں دم کرنے والی بلا (Sphinx) کی یہ پہیلی بوجھ لی تھی کہ "بتاؤ وہ کونسی چیز ہے جو صبح کو چار پاؤں پہ چلتی ہے دوپہر کو دو پاؤں پہ اور شام کو تین پاؤں پہ" اور پہیلی بوجھے جانے پر بلا (Sphinx) نے اپنا خاتمہ کرلیا اور اہلِ Thebes کی جان چھوٹ گئی اور یوں اہلِ Thebes نے اسے اپنا بادشاہ چن لیا ہو۔ بادشاہ تو وہ بن ہی گیا تھا، سب اس کی تعریف کرنے لگے تھے اور یہ بات پورے کالج میں پھیل گئی

تھی انہی دنوں کلاس Representative کے الیکشن ہونے تھے، اختر نے جھٹ سے اپنا نام پیش کردیا۔طاہر بھی میدان میں کود پڑا تھا، بڑا سنجیدہ پُرجوش اور بلا کا مقرر تھا وہ، لیکن اس کا سارا جوش اور ساری مقررانہ صلاحیتیں دم توڑ گئیں۔جب بیشتر طلباء اور طالبات نے اختر کو کامیاب کرا دیا اور اگرچہ ایم اے لیول پر Class Representative کا کوئی رول تو نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ علامتی سا رول ہوتا تھا، بہرکیف ایک چھوٹی سی کوشش نے اسے ایک بڑی کامیابی دلوادی تھی۔پر بات یہاں کہاں ختم ہوئی، اختر ایم اے انگلش نہیں کرسکا تھا اس نے کوئی کاروبار شروع کر لیا تھا جس میں اسے واجبی سی کامیابی ہورہی تھی لیکن اس کی ماں اس کی شادی کرانے پر تُلی ہوئی تھی۔اس کا خیال تھا کہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا کہ وہ شادی کا بوجھ برداشت کرسکے، اس نے ماں کو لاکھ سمجھایا پر وہ نہیں مانی "بیٹا میں بہت بوڑھی ہوگئی ہوں، معلوم نہیں کب چل بسوں، میں مرنے سے پہلے تمہیں شادو آباد دیکھنا چاہتی ہوں، تمہی میری اولاد ہو، میں اپنے گھر میں ایک چاند سی دلہن لانا چاہتی ہوں" اختر کچھ نہ کہہ سکا مگر پوچھا کہ آپ کس سے شادی کرنا چاہتی ہیں، ماں نے کہا "میں نے دلہن تلاش کرلی ہے اور اس کے ماں باپ کو اگلے ہفتے مدعو بھی کرلیا ہے" اختر گو کہ شادی کے لئے تیار نہ تھا لیکن اس نے ماں کی ممتا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور دل سے اس کا فیصلہ قبول کرلیا۔اتوار کی شام کو مہمانوں کو آنا تھا، دروازے پر دستک ہوئی اور مہمان داخل ہوئے، اختر نے جھک کر سلام کیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ان کی خوب خاطر مدارت کی گئی، اختر نے کہا کہ خالو جان مجھے یہ رشتہ منظور ہے کیونکہ یہ میری امی کا انتخاب ہے وہ بولے "نہیں بیٹا یہ ہمارا بھی انتخاب ہے اور اس فوٹوگراف کا بھی۔ممتاز صاحب نے وہ فوٹوگراف اختر کو بھی تھمادی تھی، وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ اس کی کلاس فیلو شاہینہ تھی جو ایم اے انگلش کرکے ایک کالج میں لیکچرار ہو گئی تھی۔ممتاز صاحب نے کہا کہ تم ہماری بیٹی کا بھی انتخاب ہو کیونکہ وہ تمہیں ایک ہیرو سمجھتی ہے کہ تم نے ایک چڑیا کو کلاس سے باہر مار بھگایا تھا۔

☆☆☆☆☆

مِس ہیملٹ

اپریل کا مہینہ تھا، اچانک ٹھنڈی ہوا چل پڑی، ہلکے ہلکے بادل آسمان پر تیرنے لگے، بہار کی تمام رونقیں اور لطافتیں آسمان سے اترنے لگیں اور زمین بھی تازگی اور فرحت اگلنے لگی، پھولوں میں ایک نئی زندگی محسوس ہونے لگی ہر طرف بہاریں تھیں، تازگی، شگفتگی اور رعنائی تھی۔ سمیرا اپنے لان میں بیٹھی ہوئی تھی، بہت ہی خوش، ہر طرف ہریالی، رنگا رنگ پھول، تازہ شگوفے، خوشبو ہی خوشبو اور رنگ ہی رنگ۔ اس کے ہاتھ میں بیالوجی کی کتاب تھی اور وہ تخلیقی عمل کے بارے میں محوِ مطالعہ تھی، وہ کبھی سائنس کی طالبہ رہی تھی اس لئے بڑی حقیقت پسند تھی، وہ جانتی تھی کہ فطرت کی رعنائیوں اور رنگینیوں کا انسانی فطرت پر کیا اثر ہوتا ہے لیکن وہ اتنی خوش اور اتنی شاداں نظر نہیں آتی تھی جتنے کہ شاخوں پر کھلے ہوئے پھول۔ اگرچہ حسن اور زیبائی سے وہ کسی پھول سے کم نہ تھی لیکن اسے اپنی حقیقت اور زندگی کی ماہیت پر غور کرنے میں بڑا ہی لطف آتا تھا قدرت کا اس پر اس قدر احسان تھا کہ وہ سوچ بھی سکتی تھی اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کر سکتی تھی۔ وہ اشیائے ظاہری کو دیکھ کر بیک وقت خوش ہوتی تھی اور ملول بھی، بالکل ایک خواندہ اور سمجھدار فرد کی طرح۔ اس کی شادی کو چند ماہ گزرے تھے اور وہ بہت مطمئن دکھائی دیتی تھی اور کبھی کبھی سوچتی تھی کہ وہ کتنی خوش بخت ہے کہ اسے ایک ایسا ساتھی مل گیا ہے جو اسے سمجھتا ہے، اس سے پیار کرتا ہے، شوہر کے بارے میں جو خدشات اس کی سہیلیوں نے اس کے ذہن میں ڈال رکھے تھے وہ بہر حال موجود تھے لیکن اس کو یقین تھا کہ حسنِ سلوک اور طرزِ عمل بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہے، اسے بھرپور پیار دیتی ہے، اسے کمپنی دیتی ہے، اس کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہے تو یقیناً اس کا دل جیت سکتی ہے اور اس کا دماغ بھی۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوتی ہے اور اسے یوں لگتا ہے کہ جیسے اکمل آ گیا ہو۔ گھر کا دروازہ خاصا دور تھا

لیکن اس نے اپنی ملازمہ کو کہہ رکھا تھا کہ وہ دروازہ کھولنے نہ جائے خاص طور پر اس وقت جب اکمل کے آنے کی توقع ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ اکمل جب باہر سے آئے تو وہ ہی اسے خوش آمدید کہے چنانچہ وہ گیٹ کی طرف لپکی، دروازہ کھولا اکمل داخل ہوا۔ اس نے مسکراہٹ سے اسے خوش آمدید کہا اور پھر دونوں لان کی طرف چلنے لگے۔

"آج فیکٹری سے جلدی کیوں آ گئے ہو"

"موسم جو اتنا اچھا تھا" اس نے کہا

"ہاں مجھے بھی یہی توقع تھی کہ تم آ جاؤ گے، اتنا اچھا موسم روز روز تھوڑا ہی آتا ہے۔ کتنی گرمی تھی، کتنا حبس تھا اور آج کتنا خوشگوار دن ہے" سمیرا نے کہا۔

اکمل نے اس کی تائید کی اور پھر دونوں کچھ دیر گپ شپ لگاتے رہے اور پھر پکنک ڈرائیو کے لئے نکل گئے، ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے سمیرا نے خود چائے بنائی اور اسے پیش کی وہ چاہتی تھی کہ اکمل کو خود ہی چائے بنا کر پیش کرے۔ خود اس کا ہر کام کیا کرے، سمیرا پڑھی لکھی لڑکی تھی اسے اکمل نے کئی بار کہا تھا کہ وہ سارا دن گھر میں کم و بیش تنہا ہوتی ہے اسے کوئی جاب کر لینا چاہئے لیکن وہ جاب کرنا نہیں چاہتی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی اکمل نے سمجھایا تھا کہ ایسا نہیں ہے لیکن وہ کبھی جاب کرنے پر تیار نہیں ہوئی تھی، وہ کہتی تھی۔

"انتظار میں بڑا مزہ ہوتا ہے جانو! تمہارے آنے کے انتظار میں اور بھی زیادہ لطف آتا ہے، جب تم تھکے ہارے آؤ تو گھر میں مَیں تمہیں سکون نہ دے سکوں، یہ کیسی محبت ہوئی کہ شوہر تھکا ہارا آئے اور گھر میں دیکھ بھال کرنے والا بھی نہ ہو"

"پگلی زمانے بدل گئے ہیں، اب شوہروں کو سمجھدار ہو جانا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جاب کرو گی تو تمہارے لئے ٹھیک ہوگا اور یہ قومی خدمت ہوگی میری جان! تم بور بھی نہیں ہوا کرو گی"

لیکن سمیرا کسی دلیل پر کان نہیں دھرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گھر بڑی جنت ہوتا ہے

اگر گھر اچھا ہو اور شوہر بیوی میں اچھے مراسم ہوں ذہنی اور قلبی ہم آہنگی ہو تو یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے بلکہ قومی خدمت بھی کہ اس طرح شوہر اپنے فرائضِ منصبی کو خوشی خوشی سرانجام دے گا اور خواہ مخواہ اپنے Boss سے یا اپنے Subordinate سے نہیں الجھے گا۔ اس کے یہ دلائل کبھی اکمل کو بے بنیاد سے لگتے تھے لیکن وہ اس کی خوشی میں خوش تھا۔ وہ فیکٹری میں اسسٹنٹ منیجر تھا، اچھی سیلری تھی اس کی، گاؤں میں کچھ زمین بھی تھی اور لاہور جیسے شہر میں اور وہ بھی ماڈل ٹاؤن جیسے علاقے میں ایک اچھا مکان۔ اسے پیسے کا لالچ تھا نہیں لیکن وہ بہت سمجھدار اور روشن خیال انسان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سمیرا جاب کیوں نہیں کرتی اور کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچنے لگتا کہ وہ اس کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہے۔ اس طرح کئی ماہ اور گزر گئے۔ سمیرا نے گھر کو سچ مچ جنت بنا دیا تھا۔ اکمل بہت ہی خوش تھا، بہت ہی مطمئن۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ سمیرا کو ہر طرح کا سکون دے، سمیرا خاصی سلجھی ہوئی لڑکی تھی لیکن کبھی کبھی اکمل کو اس کی سمجھ نہیں آتی تھی، وہ باتیں کرتی کرتی تھم سی جاتی تھی اور اس کے فقروں میں ربط باقی نہیں رہتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اس خیال کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

سمیرا اور اکمل بچپن میں فیصل آباد کی ایک کالونی سمن آباد میں رہتے تھے اگرچہ ایک دوسرے کے رشتہ دار نہ تھے لیکن یہ دور ایسا تھا جب لوگ ایک دوسرے پر اعتبار کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سچ مچ قابلِ احترام اور قابلِ عزت سمجھتے تھے۔ سمیرا اور اکمل کی فیملی کے آپس میں اچھے مراسم تھے اکمل کا باپ ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا اور سمیرا کا والد بھی اچھی خاصی زمین کا مالک تھا لیکن چونکہ ان کی تعلیم و تربیت اچھے اداروں میں ہوئی تھی اس لئے ان پر دیہاتی زندگی کے وہ اثرات جو دقیانوسی بنا دیتے ہیں، جو فرسودہ خیالات کو جنم دیتے ہیں نہ تھے، ان کی فیملیز بڑی روشن خیال تھیں اسلئے اکمل اکثر و بیشتر سمیرا کے گھر چلا جاتا اور سمیرا، اکمل کے گھر چلی آتی تھی۔ ان کی عمر کوئی ۱۴۔۱۵ سال ہی کی تھی یہ آپس میں کھیلتے رہتے، مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کرتے رہتے اور آہستہ آہستہ لاشعوری طور پر ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے اور پھر لاشعوری تعلق شعوری

تعلق میں تبدیل ہو گیا تھا ان کے والدین کو ان کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر کوئی خاص اعتراض بھی تو نہ تھا چونکہ وہ خود بڑے روشن خیال اور کشادہ نظر تھے اس لئے وہ اپنے بچوں پر غیر ضروری قدغن نہیں لگانا چاہتے تھے چنانچہ یہ میل جول زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ دونوں کی منگنی ہو گئی لیکن اکمل کے والد کا خیال تھا کہ اس کے بچے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جانا چاہیے، وہاں سے کچھ سیکھنا چاہیے اور اسے زیادہ علم ہونا چاہیے کہ دنیا کے کیا رنگ روپ ہیں اور دنیا کیسے آگے بڑھ رہی ہے، اکمل کا بھی یہ خیال تھا لیکن سمیرا کے لئے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی، وہ نہیں چاہتی کہ اکمل بیرون ملک جائے لیکن وہ اسے جانے سے روک بھی تو نہیں سکتی تھی اور پھر اکمل نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ بیرونِ ملک اس کا ہی ہو کے رہے گا، اسے ہی اپنی دلہن بنائے گا، اس نے جاتے وقت کہا تھا۔۔۔۔۔ بہت ہی پیار سے کہا تھا

"دیکھو سمیرا تم بدل نہ جانا، یہ چاندنی راتیں، مسکراتے ہوئے دن، دلکش شامیں میری جان! میری معصوم سی محبت، کہیں تم بھول نہ جانا! میں بھی نہیں بھولوں گا، میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں، کون اپنے پہلے پیار کو بھول سکتا ہے، بھلا سوچو تو!۔۔۔۔ سوچو ناں!"

سمیرا نے اسے روتے روتے الوداع کہا اور اکمل اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن چلا گیا تھا اور سمیرا نے اپنی تعلیم جاری رکھی، اس نے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا اور بڑی دلچسپی سے تعلیم حاصل کرنے لگی اس نے ایف ایس سی کا ارادہ کیا تھا وہ سمجھتی تھی کہ سائنسی علم ہی انسانی شعور کو جلا بخشتا ہے لیکن سائنس کے Subjects خاصے مشکل تھے۔۔۔ جیسے تیسے اس نے ایف ایس سی کر لی تھی لیکن اس کے بہت اچھے نمبر نہیں آئے تھے۔ اس نے کئی سال پڑھائی چھوڑے رکھی، اکمل نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، اکمل کے والدین میں بھی کوئی اتنا جوش و خروش نہیں تھا۔ سمیرا حیران تھی کہ کیا اکمل بدل گیا ہو گا، وہ ایسا تو نہیں تھا، ان کی تو منگنی بھی ہو چکی تھی، اسے کچھ تو اپنی منگیتر کا خیال ہونا چاہیے تھا، اپنے پہلے پیار کی لاج رکھنی چاہیے تھی۔ ایک دو سال اور گزر گئے اکمل اور اس کے والدین نے سمیرا اور اس کے والدین سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، سمیرا بہت پریشان رہنے

گئی تھی اپنی پریشانی کو دور کرنے کے لئے اس نے کتابوں کا سہارا لینا چاہا اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ چار پانچ سال میں وہ بہت کچھ بھول چکی تھی لیکن اس نے ارادہ کیا کہ وہ بی ایس سی اور ایم ایس سی ضرور کرے گی۔ اپنے ارادے کا ذکر اس نے اپنے والد سے کیا وہ بہت خوش ہوئے۔ "تم اپنی پڑھائی شروع کر دو۔ وہ میرے دوست کا بیٹا ہے ماں شہزاد! وہ ایک کالج میں پڑھاتا ہے شاید وہ بیالوجی کا استاد ہے وہ تمہاری مدد کرے گا۔ بیالوجی ہی نہیں بلکہ سائنس کے ہر Subject میں تم اس سے رہنمائی لینا شروع کر دو وہ تمہاری اچھی خاصی رہنمائی کر سکتا ہے"۔

ثمیرا کئی سال اس سے رہنمائی حاصل کرتی رہی۔ وہ بڑا خوش اخلاق، خوش طبع اور خوش مزاج نوجوان تھا، وہ اس کے دکھ سکھ میں بھی شرکت کرنے لگا۔ ثمیرا اس سے بہت متاثر ہوئی، اتنی متاثر کہ وہ اپنا ماضی بالکل بھول گئی، اکمل بھی اسے یاد نہ رہا، وہ بہت دور نکل چکی تھی اور اس معاملے میں اس کا کوئی رہنمائی کرنے والا بھی نہ تھا، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کسی طرح بھی شہزاد کو حاصل نہیں کر سکے گی کیونکہ یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس کے والدین روشن خیال ہونے کے باوجود قول کے دھنی تھے چونکہ انہوں نے ایک دفعہ ہاں کر دی تھی وہ بھی اس کی اپنی مرضی سے۔ اس لئے وہ جانتی تھی کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل کریں گے نہ ہی اسے کرنے دیں گے۔ ثمیرا یہ بات خوب جانتی تھی لیکن وہ شہزاد کی ہوتی جا رہی تھی بلکہ بُری طرح اس کی ہو گئی تھی۔ وہ محبت کے معاملے میں بڑی جذباتی سی تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ جب وہ نارمل ہوتی تو پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگتا، اسے یوں لگتا کہ وہ غلط رستوں پر چل پڑی ہے لیکن اس کے پاس واپسی کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا، اسے اپنے ماں باپ سے بھی بے پناہ محبت تھی وہ معاشرے سے بھی دست و گریباں نہیں ہو سکتی تھی، وہ دو کشتیوں کی سوار تھی اور اسے یوں لگتا تھا کہ کوئی کشتی بھی اسے ساحل کی طرف نہیں لے جا سکے گی بلکہ وہ دونوں کشتیوں میں اپنے ہاتھوں سے سوراخ کر رہی تھی، اپنی زندگی سے کھیل رہی تھی، اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا رہی تھی، اپنے ماضی کا خون بہا رہی تھی، اسے رات بھر نیند نہیں آتی تھی، تڑپتی رہتی تھی لیکن اس کا تڑپنا، سلگنا اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا، اس نے اپنی ذہنی کیفیت کا

ذکر اپنی کچھ Friends سے کیا سب کو اس سے ہمدردی ہونے لگی لیکن سب کی یہ رائے تھی کہ وہ اکمل سے دست کش نہ ہو، وہ اس کا منگیتر ہے اور پہلی محبت ہے۔ تاہم اسے یہ ملال تھا بلکہ شدید دکھ تھا کہ اکمل نے باہر جا کر اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، کبھی نہیں پوچھا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے لیکن کبھی کبھی اسے بچپن کا اکمل اچھا لگنے لگتا تھا جب اسے اچھا لگنے لگتا تو اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگتی تھی اور بے ہوش ہو جاتی تھی، وہ کیا کرتی شہزاد بھی تو اس کے روئیں روئیں میں رچ بس گیا تھا، اس کی زندگی بن گیا تھا، اس کے سانسوں میں سما گیا تھا۔ ثمیرا سائنس کی طالب علم تھی، اسے ادب سے کوئی زیادہ لگاؤ نہ تھا لیکن اب وہ ادیب اور شاعر بھی بنتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید اس کی زندگی یونہی گھل گھل کر ختم ہو جائے گی، وہ مر مٹ جائے گی، friends اسے تسلیاں دیتیں، اسے سمجھاتیں وہ اپنی تنہائی اور شہزاد سے محفلوں کا ذکر اپنی friends سے بلا کم و کاست کر دیا کرتی تھی، اس کی friends اس سے بڑی محبت کرتی تھیں اور بظاہر انہوں نے اسے ٹوٹنے پھوٹنے سے بچانے کی کوشش کی اور اسے بھی یوں لگا کہ شاید اس طرح وہ بچ جائے گی، وہ سنبھل جائے گی، اس نے از خود ہی اکمل سے رابطے کرنا شروع کر دیے، اکمل نے اپنی بے اعتنائی پر افسوس تو نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کا انداز کسی روایتی محبت کرنے والے جیسا تھا وہ ہر بات عقل کے پیمانے پر پرکھنا چاہتا تھا، ثمیرا نے اسے کئی خط لکھے، ابھی وہ بیرونِ ملک ہی تھا، ادھر اس نے اپنے تعلقات، اپنا جذباتی رشتہ شہزاد سے بھی جاری رکھا، اسے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ اگر وہ اکمل کی ہو گئی تو شہزاد کا کیا بنے گا، شاید شہزاد جی نہیں پائے گا، یہ کتنا ظلم ہوگا، لیکن وہ بے بس تھی، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اکمل کی مانگ ہے اور اب یہ رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ہے خاندان کی روایات یہی تھیں، چنانچہ جذبہ بظاہر دم توڑنے لگا اور عقل کی فرمانروائی شروع ہو گئی اور وہ دن بھی آیا کہ وہ اکمل سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والی تھی، ادھر شہزاد کو جب یہ معلوم ہوا اس پر جو بیتی اس نے ثمیرا کو کبھی نہیں بتایا اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح اس کی ثمیرا مر جائے گی، ختم ہو جائے گی، اس نے سوچا کہ ثمیرا کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے اس کے نزدیک محبت ایک بہت بڑی

قربانی ہے اور کوئی محبت کرنے والا جس قدر قربانی دیتا ہے وہ اسی قدر عظیم ہوتا ہے، محبت اسے سلام کرتی ہے، عشق اسے گلے لگا لیتا ہے، زندگی اس کے پاؤں چومتی ہے، ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے، بے شک ایک کسک باقی رہ جاتی ہے لیکن یہ کسک حاصلِ زندگی ہوتی ہے، اس کسک سے زندگی جنم لیتی ہے، شعر تخلیق ہوتے ہیں افسانے تحریر ہوتے ہیں اور زندگی میں ایک ایسا لطف آنے لگتا ہے جس کا اندازہ عقل کے پجاریوں کو نہیں ہو سکتا اور مادیت کے پرستار جس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ شہزاد، سمیرا کی شادی کی رسوم میں بھی شریک ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو ٹوٹنے پھوٹنے نہیں دیا، مصنوعی مسکراہٹیں بھی اس کے ہونٹوں پر آئیں لیکن اندر ہی اندر وہ بڑا مضبوط ہو رہا تھا، بڑا توانا ہو رہا تھا، وہ سوچتا تھا کہ جسے کبھی اپنا کہا ہو وہ اپنا ہی تو ہوتا ہے چاہے وہ کہیں بھی ہو، پھول کسی بھی شاخ پر کھلے حسین ہوتا ہے، ٹھنڈی ہوا جہاں بھی چلے تازگی عطا کرتی ہے، ٹھنڈا میٹھا پانی ہر ایک کے لئے آبِ حیات ہوتا ہے، اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا اور شاید وہ سمجھ بھی گیا۔ سمیرا بھی اپنے آپ کو سمجھا چکی تھی لیکن شاید وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو نہیں سمجھا پائی تھی تاہم اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اکمل کو ہر طرح کی خوشی دے گی، وہ ایک مثالی شریک سفر بنے گی، وہ اکمل کو نظر انداز کیوں کرے گی؟ اکمل نے اس کا کیا نقصان کیا تھا؟ مانا کہ بیرونِ ملک جا کر اس نے اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا تھا۔۔۔۔۔ شاید اس کی کوئی مجبوری ہوگی، شاید وہ بہت معروف ہوگا، شاید اس کی خاندانی روایت کا تقاضا ہوگا، اس لئے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اکمل کو ہر خوشی دے گی، اکمل کو دل وجان سے چاہے گی اور جب دل وجان سے چاہے گی تو وہ بھی اس کا سہارا بنے گا، عقل نے اسے سمجھا دیا تھا کہ زندگی میں سب کچھ ممکن نہیں ہوتا اور اچھی بات یہی ہے کہ جو ملا اسے غنیمت تصور کیا جائے۔ غم دوش تو ہوش گنوا دیتا ہے اور زندگی یہی ہے کہ اسے برداشت کیا جائے، اسے خوبصورت بنانے کی ہر سبیل تلاش کی جائے۔ اس کی عقل اسے یہ سب کچھ سمجھا رہی تھی، سب کچھ بتا رہی تھی اور وہ اپنے شوہر کی ہر خوشی کو اپنا فرض سمجھ رہی تھی لیکن عقل راستہ تو دکھاتی ہے منزل نہیں سجھاتی، جسم کے زخموں کو بھر دیتی ہے مگر روح کے زخموں کو نہیں بھر سکتی، عقل زندگی کی بڑی نعمت ضرور ہے لیکن سب کچھ نہیں، یہ اسے

معلوم تھا۔ سائنس کی طالب علم ہوتے ہوئے بھی معلوم تھا اور اب اسے یقین سا تھا کہ زندگی وہی ہے جو نفس کھیل کر گزار دی جائے، بظاہر اس کی ذہنی کشمکش ختم ہو چکی تھی لیکن اکمل سے پیار کرتے ہوئے، اکمل کو گلے لگاتے ہوئے وہ کبھی کبھی سہم سی جاتی تھی، تھم سی جاتی تھی، اکمل جب کبھی اسے پیار سے پکارتا، محبت سے بلاتا اور اسے چندا کہتا تو اسے شہزاد کی یاد آ جاتی کیونکہ شہزاد بھی اسے چندا ہی کہا کرتا تھا۔ اسے ایسے لگتا کوئی آواز آ رہی ہے، شہزاد دور سے یہ جملہ بول رہا ہے وہ ان آوازوں کو جھٹک دیتی اور دوڑ کر اکمل کے پاس جاتی، اسے ٹوٹ کر چاہتی، اس سے پیار کرتی لیکن اکمل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید سمیرا ٹھیک نہیں ہے اسے کوئی الجھن درپیش ہے اسے کوئی مسئلہ لاحق ہے لیکن وہ اس پر شک بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا تھا کہ سمیرا نے وہ دس پندرہ سال کیسے گزارے ہوں گے جب وہ اس سے دور تھا لیکن اس نے اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ چونکہ گھر میں تنہا رہتی ہے اس لئے شاید تنہائی اسے پریشان کر رہی ہو، گھر میں ایک ملازمہ تھی، لیکن ملازمہ تو ساتھی نہیں ہوتی، چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بہن کو یہاں بلا لے تاکہ سمیرا کا دل بہلتا رہے، اس نے اپنی بہن طاہرہ کو بلا بھیجا۔ اتفاق سے ان دنوں گرمیوں کی تعطیلات تھیں، طاہرہ کیلئے لاہور آنا آسان تھا بلکہ وہ خوش تھی کہ لاہور میں وہ چھٹیاں گزارے گی اور پھر لاہور کے اپنے ہی مزے ہیں۔ کہتے ہیں ناں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا اور پھر جو لاہور میں رہتا ہو اس کے کیا کہنے، طاہرہ فوراً لاہور پہنچ گئی، طاہرہ کی آمد سے گھر میں کچھ چہل پہل بڑھ گئی لیکن سمیرا کے لئے مسائل میں اضافہ ہو گیا۔ اب اس کے پاس چھپ چھپ کر رونے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی، اب وہ اپنے تکیے سے باتیں بھی نہیں کر سکتی تھی بلکہ خود کلامی بھی دشواری ہو گئی تھی اور اسے یوں لگا تھا کہ جیسے اس کا ذہنی تناؤ بڑھتا جا رہا ہو لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر ممکن کوشش کرے گی کہ وہ خوش رہے۔ طاہرہ آ کر اس کے پاس رہنے لگی چنانچہ وہ طاہرہ سے گپ شپ کرتی رہتی اس کا اور اپنا دل بہلاتی رہتی اور باتوں باتوں میں کچھ وقت کٹنے لگا۔ طاہرہ نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں اسے بتایا کہ وہ شہزاد سے پڑھنے جاتی ہے۔

"کیسے ہیں سر شہزاد! ٹھیک تو ہیں ناں!۔۔۔۔وہ کیسے پڑھاتے ہیں۔۔۔ان سے کون کون پڑھتا ہے۔۔۔۔تم کس وقت پڑھنے جاتی ہو۔۔۔۔۔تمہیں اچھے لگے ناں سر!"

اس کے سوال تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے، طاہرہ ابھی بچی تھی اور تھی بھی بڑی ہی معصوم۔اس نے اپنی بھابھی کو بتایا کہ

"سر شہزاد بہت اچھے استاد ہیں... پر بھابھی کبھی کبھی وہ اداس ہو جاتے ہیں۔۔۔بہت ہی اداس۔پتا نہیں کیوں"

"اچھا طاہرہ تم نے پوچھا نہیں کہ کیوں"

"بھلا بھابھی سر سے بھی کوئی ایسے سوال کرتا ہے"

بہت سی باتیں طاہرہ کرنا چاہتی تھی لیکن جان بوجھ کر بیمرا نے موضوع بدل دیا۔شاید اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ شہزاد کے بارے میں زیادہ گفتگو کر سکتی لیکن اسے یہ جان کر کہ کبھی شہزاد بہت اداس ہو جاتا ہے بہت دکھ ہوا۔۔۔۔بہت ہی دکھ!۔۔اندر سے وہ پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اب اس کی ٹوٹ پھوٹ اور بڑھنے لگی تھی،اس نے اللہ سے دعا کی

"اے اللہ میری مدد کر۔۔۔۔مجھے حوصلہ دے۔۔۔میں جانتی ہوں کہ میں نے کسی کا دل توڑا ہے۔۔۔۔پر میرا اپنا بھی تو دل ٹوٹا ہے۔۔۔تو دلوں کے راز جانتا ہے۔۔۔تو ہی حوصلہ دینے والا ہے"۔

طاہرہ بڑی ہنس مکھ اور خوش باش لڑکی تھی۔اسے اپنے بھائی سے بھی بہت پیار تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بھابھی کو خوش رکھے وہ یونہی چٹکلے چھوڑ دیا کرتی،بڑے مزے کی باتیں کرتی تھی،بیمرا بے ساختہ ہنس دیا کرتی تھی لیکن ہنستے ہنستے یک دم رک جایا کرتی تھی جیسے ہنسی اس کا مقدر نہ ہو،جیسے مسکراہٹیں اس کے حصے میں نہ آئی ہوں۔اس کی پوری خواہش ہوتی کہ دل کی بات زبان پر نہ آ جائے اسے معلوم تھا کہ دل کی بات زبان پر آ جانے سے کیا کیا قیامتیں ٹوٹتی ہیں۔کیا کیا حشر بپا ہوتے ہیں۔۔۔۔کیسے کیسے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔اسے یہ بھی معلوم

تھا کہ اکمل بڑا روشن خیال اور مثبت سوچ رکھنے والا نوجوان ہے اور اس سے بہت پیار کرتا ہے،اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا تھا،جب وہ فیکٹری سے واپس آتا تھا تو اس کا دل لگانے کی کوشش کرتا،لیکن بد قسمتی سے پیار کا جو اسلوب وہ تراشتا،محبت کے جو بول وہ بولتا،چاہ کا جو طریقہ وہ اختیار کرتا وہ بیمرا کو شہزاد کی یاد دلاتا۔شہزاد بھی تو ایسے ہی پیار کیا کرتا تھا یونہی چاہتا تھا یہی الفاظ ہوتے تھے اس کے،یہی انداز ہوتا تھا اس کا،کیوں نہ ہوتے محبت کی زبان جو ایک ہوتی ہے،محبت کا رنگ جو ایک ہوتا ہے۔یوں اکمل کا پیار اسے سکون نہ دے پاتا،وہ اور بے قرار ہو جاتی،کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آنے لگتا۔

"میں کتنی بد قسمت ہوں۔۔۔کتنی بد بخت! کہ مجھے پیار سازگار نہیں۔۔کیا مجھ سے پیار چھن گیا؟میرے حصے کا سبھی پیار لٹ گیا ہے؟۔کیا ہوا اسے۔۔۔اے خدا! مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔۔۔ٹوٹ پھوٹ جاؤں۔۔۔مٹ جاؤں اور تماشا بن جاؤں"۔

کبھی کبھی بیمرا یہ سوچتی کہ اس کی حالت تو شیکسپیئر کے کردار ہیملٹ جیسی ہے شاید ہیملٹ جیسے کردار سے اس کا کوئی لاشعوری رشتہ ہے تبھی تو وہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائی تھی،نہ اب کر پا رہی تھی گویا وہ ہیملٹ کی مجسم مؤنث صورت ہے،"مس ہیملٹ" کہہ لیجئے۔

کئی دن گزر گئے اچانک بیمرا کی ایک friend کا فیصل آباد سے ٹیلی فون آیا اس کی یہ friend اس کی مکمل صورتحال سے واقف تھی،بیمرا نے بھی اسے اپنا سب حالِ دل کہہ سنایا۔تہمینہ نے اسے بتایا کہ شہزاد نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا اور یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ وہ کبھی تمہارے لئے مشکل کا باعث نہیں بنے گا،تمہارے لئے دعائیں کرتا رہے گا،اس نے بتایا کہ شہزاد نے کئی بار اس سے بات چیت کی ہے،وہ بہت دکھی ہے۔۔۔وہ نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کون سی مجبوری ہوتی ہے جو سب عہد و پیماں توڑ دیتی ہے۔۔۔۔۔وہ کون سا جبر ہوتا ہے جو سب کچھ ملیا میٹ کر دیتا ہے۔۔۔۔راکھ کر دیتا ہے۔۔۔۔انسان اتنا مجبور کیوں ہے۔۔۔۔ہمارا زمانہ ابھی

قبائلی رسوم کے شکنجے میں کیوں ہے؟

تہمینہ بہت دیر باتیں کرتی رہی اس نے دکھی سمیرا کو اور دکھی کر دیا۔ کہتے ہیں نا جب مصیبتیں آتی ہیں اکیلی نہیں آتیں، ہجوم در ہجوم آتی ہیں۔ سمیرا کا ٹوٹا ہوا دل اور چور چور ہو گیا، اس کی روح کو اور کچوکے لگے، ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی،

"اے میرے خدا میری مدد فرما، مجھے اپنے پاس بلا لے، میری ہمت کو اتنا نہ آزما کہ میں چیخ پڑوں، گلیوں کوچوں میں دیوانہ وار گھومنا شروع کر دوں، دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں اور رسوا اور بدنام ہو جاؤں، مجھے بچا۔۔۔ مجھے بچا، میں نے شہزاد سے کوئی خودغرضانہ محبت نہیں کی تھی، کوئی غرض پنہاں نہیں تھی وہ تھا ہی اتنا اچھا، اتنا ہمدرد، اتنا دل آویز، دکھ سکھ بانٹنے والا اور لطیف جذبات کا مالک کہ میں اس سے پیار نہ کرتی تو کیا کرتی!"

وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اور چلا رہی تھی کہ طاہرہ کمرے میں داخل ہو گئی

"بھابھی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔۔ میری اچھی بھابھی۔۔۔ مجھے تو بتائیں، کیا بھیا تنگ کرتے ہیں یا امی یاد آ رہی ہے۔۔۔ کیا؟ آخر میں بھی آپ کی بہن ہوں۔۔۔ آپ کی اپنی بہن۔۔۔ چھوٹی سی بہن۔۔"

"میری پیاری بہن۔۔۔ میری پیاری طاہرہ! تم کیا جانو کہ انسان کو کون کون سے روگ لگ جاتے ہیں، کون کون سی بیماری لاحق ہو جاتی ہے، اللہ تمہیں بچائے، تمہیں محفوظ رکھے"

طاہرہ نے یہ سارا واقعہ اکمل کو بتا دیا اکمل پہلے ہی پریشان تھا اس کا خیال تھا کہ سمیرا کو کوئی ذہنی بیماری لاحق ہے، کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش ہے، سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ اسے کبھی کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں، دوہری آوازیں۔ اکمل کا خیال تھا کہ شاید وہ سکذوفرینیا کی مریض ہے جس میں آوازیں دوہری سنائی دیتی ہیں، عجیب عجیب شکلیں دکھائی دیتی ہیں، عجیب عجیب خوشبوئیں اور ذائقے محسوس ہوتے ہیں اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر جواد بہت اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں اس نے ان سے Appointment لے لی اور طاہرہ سے کہا کہ وہ اپنی بھابھی کے ساتھ ڈاکٹر

کے پاس جائے۔ سمیرا پہلے تو چونک گئی

"نہیں اکمل میں نہیں جاؤں گی، میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ میری جان! وہ میرا کچھ بھلا نہیں کر سکے گا۔۔ ہرگز نہیں کر سکے گا۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔"

"نہیں سمیرا۔۔ چندا تم جاؤ گی۔۔ جاؤ گی نا!۔۔ دیکھو ضرور جاؤ۔۔ وہ تمہیں کوئی اچھا سا مشورہ دیں گے۔۔۔ بھلا چنگا کر دیں گے"

اور یوں سمیرا ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

سمیرا طاہرہ کے ساتھ کلینک پر پہنچ گئی ہے اور کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر نے سمیرا کو بلا لیا اور اس سے کچھ گفتگو کرنے لگا اور چند ٹیسٹ اپنے ہی کلینک سے کروائے اور طاہرہ کو باہر جانے کو کہا تا کہ وہ علیحدگی میں اس سے گفتگو کر سکے اور صورتحال کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

"جی آپ کا اصل مسئلہ ہے کیا؟"

"ڈاکٹر مسائل ہی مسائل ہیں اور سارے اصل مسائل ہیں اور ان میں سب سے بڑا مسئلہ میں خود ہوں، مجھے خود علم نہیں کہ میں صحت مند رہنا چاہتی ہوں یا بیمار۔۔۔ جینا چاہتی ہوں یا مرنا"

"دیکھئے میڈم یوں نہیں سوچتے!۔۔۔ زندگی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اس کی اہمیت سے انکار کرنا کفر ہے اور پھر آپ جانتی ہیں کہ کوئی صرف اپنے لئے نہیں جیتا بلکہ دوسروں کیلئے بھی جیتا ہے"

"میں جانتی ہوں ڈاکٹر!۔۔۔ مگر میں جاننا نہیں چاہتی، جاننے کا اب کوئی فائدہ نہیں،"

"کیا آپ اپنی روداد سنانا پسند کریں گی"

"ڈاکٹر میری کوئی روداد نہیں، میری کوئی کہانی نہیں۔۔۔ میں نے غلط کہا میری کہانی تھی لیکن پھر میں کہانی بن گئی، میں شہزاد کے پاس پڑھنے گئی تھی لیکن جو پڑھا ہوا تھا وہ بھی بھول گئی، استاد کو اتنا دل آویز، اتنا جاذب نظر اور اتنی زیادہ سحر انگیز شخصیت کا مالک نہیں ہونا چاہیے،

ڈاکٹر میں کچھ بتانا چاہتی ہوں، کچھ کہنا چاہتی ہوں، آپ ڈاکٹر ہیں، آپ سے سب کچھ کہا جا سکتا ہے میں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ پھر اور کہنے کی ضرورت نہ رہے ۔۔۔۔ ڈاکٹر میں شہزاد کے پاس پڑھنے گئی تھی لیکن پھر کیا ہوا؟ ۔۔۔ معلوم نہیں کیا ہوا ۔۔۔۔ میں صرف اور صرف اس کی ہو گئی اور اسے بھی اپنا بنا لیا اور اسے اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ کسی اور کا بن سکے، کون سی قسم تھی جو میں نے نہیں کھائی تھی، کونسا وعدہ تھا جو میں نے نہیں کیا تھا، میں چیختی تھی، چلاتی تھی اور کئی کئی گھنٹے بالخصوص ہفتے کو میری چیخیں نکل جاتی تھیں، میں کہا کرتی تھی، یہ ہفتہ کیوں آتا ہے اس کے بعد اتوار کیوں ہوتا ہے میں اتوار کو آپ سے کیوں نہیں مل سکتی صرف صبح ہی کو کیوں ملتی ہوں، شام کیوں نہیں ملتی، رات کو تم کہاں ہوتے ہو! ۔۔۔۔ میں رات کو جائے نماز بچھا لیتی، دعا کرتی کہ خدا کرے اکمل کسی حادثے میں مارا جائے، وہ ختم ہو جائے، میں کبھی کبھی تو کہا کرتی ۔۔۔ کتنی سنگ دل تھی میں ۔۔۔ کہ میرے ماں باپ مر جائیں جو میری راہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ۔۔ جانے کیا کیا کہتی، کیا کیا کہا کرتی ۔۔۔ لیکن پھر ڈاکٹر جانے کیا ہوا ۔۔۔ کیسے ہوا ۔۔ میں نے اپنے سارے وعدے، ساری قسمیں بھلا ڈالیں، ہاں بھلا ڈالیں ۔۔۔۔ میری Friends نے جانے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا ۔ وہ کہتی تھیں شہزاد تمہارا نہیں ہو سکتا، اکمل تمہارا پہلا پیار ہے تمہارے دل کی پکار ہے دیکھو! اپنے حالات کی طرف دیکھو اپنی فیملی کی طرف دیکھو، چنانچہ میں نے شہزاد کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔۔ اپنا گلا دبا لیا ۔۔ اکمل کو اپنا لیا ۔ میں نے پوری کوشش کی کہ میں اکمل کو جو میرا اب شوہر تھا پورا پیار دے سکوں لیکن ڈاکٹر! میں ایسا نہیں کر پائی، میں پیار اکمل سے کرتی رہی ہوں لیکن لگتا یہ رہا ہے کہ میں شہزاد کو پیار کر رہی ہوں، مجھے سب کچھ جھوٹا لگنے لگا ہے، میں فریب دے رہی ہوں اکمل کو، اپنے آپ کو جیسے میں نے شہزاد کو فریب دیا ہے"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بے ہوش ہو گئی ۔ ڈاکٹر نے نرس کو بلایا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی، ڈاکٹر نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے ۔ اسے اپنا سارا علم بے کار نظر آنے لگا ۔ اسے اتنا مشکل کیس پہلی بار ملا تھا ۔ سمیرا ہوش میں آ گئی،

"معاف کرنا ڈاکٹر میں نے جانے کیا کیا کہہ دیا"

"گھبرایئے نہیں! دنیا میں بڑے دکھی لوگ ہیں، آپ سے بھی زیادہ دکھی ۔ میرے علم سے بھی زیادہ ۔ زندگی برداشت کا نام ہے، حوصلے کا نام ہے، دوائیاں تو محض کھلوا ہوتی ہیں میڈم علاج تو ہمیں اپنا خود کرنا ہوتا ہے، جب ہم میں حوصلہ ہی نہ ہو تو کوئی دوائی کارگر نہیں ہو سکتی"

"ڈاکٹر شاید آپ سچ ہی کہتے ہیں"

ڈاکٹر نے ادویہ کی ایک لمبی لسٹ اس کو تھما دی اور وہ گھر لوٹ آئی ۔ ابھی اکمل فیکٹری سے نہیں آیا ۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی

"طاہرہ مجھے ذرا آرام کرنے دو"

طاہرہ باہر آ گئی، اکمل کچھ دیر کے بعد فیکٹری سے واپس آیا، طاہرہ نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے اور سمیرا اب آرام کر رہی ہے شاید ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہو ۔

گھنٹے گزر گئے، سمیرا باہر نہیں آئی ۔ اکمل کو تشویش ہوئی اور اس نے دروازے پر دستک دی، دروازہ نہیں کھلا، دروازہ اندر سے بند تھا کوئی آواز بھی نہیں آئی ۔ اکمل نے دروازہ بار بار کھٹکھٹایا ۔ اکمل نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اور توڑنے میں کامیاب ہو گیا، جب اندر گیا تو سمیرا بستر پر لیٹی ہوئی تھی اس نے اسے بلایا کوئی آواز نہیں آئی، وہ اس کے بہت قریب گیا، اسے چھوا، لیکن وہ بے حس پڑی تھی، اس کے سرہانے ایک تحریر تھی، اکمل اسے اٹھا کر پڑھنے لگا

"اکمل میں نہ تمہاری ہو سکی ۔۔ نہ اپنی ۔۔ اور نہ اس کی ۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا"۔

دل خستہ جو لہو ہو گیا کہ بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا

☆☆☆

بات پہنچی تیری جوانی تک

وہ اپنی تنہائیوں میں دست بہ گریباں تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی سے گفتگو کرے، کسی کو اپنا حال سنائے کہ اس کا غبارِ خاطر چھٹ جائے، لیکن اس معروف دنیا میں، بھاگتے دوڑتے زمانے میں کسے فرصت تھی کہ اس کے دل کا درد بٹا سکے، ہاں اس پر اللہ کا اتنا کرم ضرور تھا کہ وہ حرفوں سے کھیل سکتا تھا، جذبوں کو مصرعوں کے سپرد کر سکتا تھا، یہی جذبے، یہی حرف، اس کی کل کائنات تھے، وہ سوچ رہا تھا کہ وہ آزاد ہے یا غلام، اسے اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے یا کوئی اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی ڈوری تھامے ہوئے ہے۔ اسے تقدیر پر تو کوئی یقین نہیں تھا کیونکہ وہ عہد جدید کا پروردہ تھا اور بیسویں صدی کے نت نئے بدلتے ہوئے علوم وفنون سے بڑی حد تک بہرہ ور تھا، لیکن پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ آزاد نہیں غلام ہے، کسی کے تابع ہے، کوئی چیز ہے جو اس پر حکمران ہے اور اسے ہلنے نہیں دیتی، موسم بہت خوشگوار تھا لیکن موسم کی خوشگواری اس کے مزاج کو خوشگوار نہیں بنا سکی تھی، برسات کی رم جھم جاری تھی، اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ بارش کے ننھے ننھے قطرے آزاد ہیں، جہاں چاہیں برستے ہیں، جب چاہیں برستے ہیں، ٹھنڈی ہوا اس کے جسم کو چھو رہی تھی مگر وہ جذبوں کی آگ میں جل رہا تھا یہ ہوا کتنی آزاد ہے یہ بادل کتنے آزاد ہیں جہاں چاہتے ہیں برستے ہیں جب چاہتے ہیں چھٹ جاتے ہیں مگر وہ اشرف المخلوقات ہو کر بھی غلام ہے پابند ہے۔

دراصل وہ ایک طویل سفر سے لوٹا تھا، یہ سفر اس کے لئے بڑا اذیت ناک ثابت ہوا تھا جانے کیوں وہ واپس لوٹ رہا تھا تو ماضی نے اسے دبوچ لیا، چلچلاتی دھوپ تھی، لگتا تھا کہ وہ پگھل جائے گا، وہ ویگن میں بیٹھ گیا پھر وہ جانے کیوں سفر کرتا کرتا تھم سا گیا، ویگن چل رہی تھی مگر وہ ایک جگہ منجمد تھا، رک سا گیا ویگن ایک شہر میں رکی، اس نے چاہا کہ وہ اتر جائے کیونکہ یہاں اسی شہر میں اس کا ماضی تھا، دلکش ماضی، دل فریب ماضی۔ اس ماضی کا تعلق اس کے بچپن سے تھا، اس سکول

میں اس کے کئی ہم جماعت تھے لیکن ایک ہم جماعت اس کیلئے سکول بن گیا تھا۔ وہ ہم جماعت اسی شہر میں موجود تھا، جسے ملے ہوئے اسے سالہا سال ہو گئے تھے، سکول میں تو یوں لگتا تھا کہ اس کی ساری زندگی اسی دوست کے ساتھ گزرے گی مگر اسے لگتا کہ یہ ممکن نہیں۔ مگر یہ تو ممکن تھا کہ وہ آپس میں ملتے رہتے لیکن ۔۔۔ یہ بھی تو نہ ہوا۔ آج موقع تھا کہ وہ سفر چھوڑ کر شہر چلا جائے لیکن اسے تو آگے جانا تھا، وہ ٹکٹ لے چکا تھا تو پھر کیا ہوا؟ ٹکٹ بہت قیمتی نہ تھا، چند روپوں کی تو بات تھی، وہ بعد میں بھی تو سفر جاری رکھ سکتا تھا، وہ ویگن سے اتر گیا اور شہر کی طرف چلنے لگا تو ویگن نے ہارن دیا، وہ جانے کیوں مڑا اور ویگن میں بیٹھ گیا، ویگن چلنے لگی اپنی پوری رفتار کے ساتھ، وہ رک گیا وہیں معلق ہو گیا ۔۔۔ لیکن وہ تو اس ویگن میں تھا، اس کے رکنے کے ساتھ ویگن کیسے رک سکتی تھی، پھر ایک شہر آیا جہاں اس کی جوانی کی یادگار تھی، رنگوں میں بھری خوشبوؤں سے معطر، اس کا دل بے تاب ہوا کہ وہ پھر اس گلشن حیات کی طرف لوٹے، زندگی کو باغ و بہار بنا لے۔ چند لمحوں کے لئے ہی سہی اسے یاد تھا کہ وہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتا تھا زندگی کے بارے میں، علم کے بارے میں حقائق کے بارے میں، گھنٹے لمحوں میں بدل جایا کرتے تھے وہ اس سے جانے کس کس موضوع پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ ہنستے مسکراتے ہوئے کبھی اس کے سوالوں کے جواب دے دیا کرتی تھی، اسے اس سے بے پناہ محبت تھی مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس سیدگل نے کبھی محبت کا اظہار کیا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں کسی اور کو چاہنا ہوگا اور کسی اور کا ہونا ہوگا، پھر بھی وہ چاہتے تھے جیسے چاہنا ان کی مجبوری ہو، ویگن چلنے کے قریب تھی پھر اس نے سوچا کہ اب وہ غلطی نہیں کرے گا ویگن چلنے لگی تو اس نے ڈرائیور سے کہا ذرا روکو مجھے یہاں کچھ کام ہے (جانے وہ کیوں نہ کہہ سکا کہ اب اسے یہیں اترنا ہے)

ڈرائیور نے کہا پہلے بتاتے اب وقت نہیں ہے، اسے لگا شاید واقعی وقت نہیں ہے، اسے تو دور جانا تھا وہ ٹکٹ لے چکا تھا ویگن تیز رفتاری سے چلنے لگی اور وہ اسی رفتار سے رک گیا مگر وہ رُک نہیں سکتا تھا، اس کا سفر ماضی کا سفر تھا، وہ جاری تھا جب بھی کوئی شہر آتا تو اسے یوں لگتا کہ یہاں

اس کے جسم،اس کی روح کا کوئی حصہ پڑا ہے، جو اس کے ساتھ مل جانا چاہتا ہے، جانے کون کون تھے جو اس کی زندگی میں آئے اور پھر کہاں کہاں کے ہو رہے،وہ پھیل گیا تھا،منتشر ہو گیا تھا،بکھر گیا تھا۔اب اس نے سوچا کہ وہ اب ویگن سے نہیں اترے گا وہ رک سکتا ہی نہیں اسے کوئی روکتا ہے، جانے کون اسے روکتا ہے اندر سے روکتا ہے یا باہر سے۔اسے H.G Wells کی کہانی The Door in the Wall یاد آ گئی کہ کس طرح بچپن میں ایک دروازہ ایک بچے کے سامنے ظاہر ہوا وہ اس میں داخل ہو گیا،خوب کھیلا،کھیلتا گیا،پھر باہر نکل آیا اور پھر اسے وہ دروازہ کئی بار نظر آیا لیکن اس کے پاس اس کے اندر جانے کا وقت نہیں تھا،وہ Frost کی یہ لائنز پڑھنے لگا۔

The woods are lovely, dark and deep,

But I have promises to keep,

And miles to go before I sleep,

And miles to go before I sleep.

اسے اب ان اشعار کی سفاکی کا احساس ہوا کہ دلکش جنگل کتنے دلکش ہوتے ہیں اور وعدے نبھانا کتنا جان لیوا ہوتا ہے وہ سوچ میں گم تھا کہ اس کا اپنا شہر آ گیا۔اپنا جیل خانہ ایک کرسی ایک قلم ایک کاغذ یہی اس کی کائنات تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ غلام ہے یا آزاد۔

☆☆☆☆

وہ ایک جھوٹ سہی اعتبار کتنا تھا

حیرت ہے کہ کبھی کبھی بلکہ اکثر و بیشتر ہمیں جھوٹ سچ سے بھی کہیں زیادہ اچھا لگنے لگتا ہے۔میں دروغ مصلحت کی بات نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی میری مراد دروغ فتنہ انگیز سے ہے اور نہ ہی اس دروغ سے جو ایک کاروباری انسان دن رات بولتا ہے۔سیاستدان اپنی دل پذیر اور شعلہ بیاں تقاریر میں استعمال کرتا ہے سرکاری افسر کام کو نمٹانے کے سلسلے میں سینکڑوں حاجت مندوں سے بولتا ہے۔بلکہ میری مراد اس جھوٹ سے ہے جو ہماری مسند دل پر متمکن ہو کر ہم پر حکمرانی کرتا ہے۔ہماری فکر لاکھ کہے کہ یہ جھوٹ ہے۔دانش بھی سمجھائے کہ یہ فریب ہے علم بھی گواہی دے اور تجربہ بھی قسمیں کھا کھا کر کہے کہ یہ جھوٹ ہے، پھر بھی منچلا دل، پاگل دل نہ مانے اور کہتا چلا جائے نہیں یہی سچ ہے اور اس سے بڑا کوئی سچ نہیں اور یہ جھوٹ سچ کے تمام اوصاف جذب کر لے۔کتنا ظالم ہوتا ہے یہ جھوٹ! مشرقی شاعری کے محبوب کی طرح کج ادا، ستم پیشہ، مغرور اور نخوست سے معمور! لیکن پھر بھی اپنے چاہنے والوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے، سجدہ ریز کر دے اور پھر انہیں اسکی مالا جپنے کے علاوہ کچھ بھی نہ سوجھے، اس کی دل فریب اداؤں میں کھو جائیں، اس کی زلفوں کے اسیر ہو جائیں، یہ جھوٹ جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے اور ہم بے بس سے ہو جاتے ہیں گنگ اور مبہوت زندگی کے کسی پہلو پر غور کر لیجئے یہ ستم پیشہ حقیقت اپنی گواہی دیتی ہوئی نظر آتی ہے شاید ہم اپنے وہم اور خیالات کے بت تراش لیتے ہیں اور وہ بت ہمیں سچائیوں سے زیادہ پیارے لگتے ہیں اور یہ ہمیں وقتی طور پر زندگی کی تلخیوں سے نجات دلا کر اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔شاید یہی بات ملٹن کے ابلیس نے کہی تھی کہ ذہنی کیفیات کا اپنا مقام ہوتا ہے، وہ جنت کو جہنم اور جہنم کو جنت بنا دیتی ہے۔اسی کا اظہار شیکسپیئر کے کردار ہیملٹ نے کیا کہ یہاں نہ کوئی چیز سچ ہے نہ جھوٹ! ہمارا تخیل جسے چاہتا ہے اسے بنا لیتا ہے، نوجوان انگریزی رومانی شاعر جون کیٹس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ جس شئے کو ہمارا تخیل خوبصورت کہے اسی کو سچ جانو۔جان ڈن جیتا

اور چلاتا ہے، اسے اپنی محبوبہ کے جور وستم کھائے جاتے ہیں مگر وہ پکار اٹھتا ہے میرے لئے تو وہی صداقت ہے کیونکہ وہ مجھے مارے جا رہی ہے۔ ہم کتنے بڑے مفکر ہیں، کتنے بڑے نکتہ داں، سقراط ہوں یا افلاطون، جھوٹ کی اس بالا دستی سے، جبر سے قہر سے نجات نہیں پا سکتے، کیونکہ ہماری ساری زندگی ہمارے احساسات سے تعبیر ہے۔ ڈیکارٹے نے کہا تھا کہ میں اس وقت تک ہوں جب تک میں سمجھتا ہوں کہ میں ہوں اگر وقت مرگ یہ ثابت ہو بھی جائے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تو بھی کیا فرق پڑتا ہے کوئی لاکھ کہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

لیکن یہ حلقۂ دامِ خیال تارِ عنکبوت کی طرح ہمیں گھیرے رہتا ہے اور ہم بڑے سے بڑے سچ کو بھی دل کے ہاتھوں جھوٹ کہہ دیتے ہیں۔

کہتے ہیں جس کو جنت فقط اک جھلک ہے تیری

سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

حالانکہ شاید ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ادا دلکش سہی مگر یہ کب تک رہے گی حسن زوال پذیر ہے، ختم ہو جاتا ہے مگر دل کہتا کہ حسن میں بڑی صداقت ہے اور یہ کافر دل ہمارے دماغ کو کچھ کہنے ہی نہیں دیتا اور ہم کبھی کسی کی جھیل سی آنکھوں میں کھو جاتے ہیں کسی کی زلفوں کے اسیر ہو جاتے ہیں، لب ورخسار کی جنت آباد کر لیتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہی جنت ازلی اور ابدی ہے۔ کبھی کبھی تو ہم ایک لمحے پر صدیوں کا خون بہا دیتے ہیں اور ایک جذبے کیلئے زندگیاں لٹا دیتے ہیں۔ ایسے جذبے یا ایسے لمحے جب وارد ہوتے ہیں تو سب علم ودانش کافور ہو جاتا ہے بلکہ خود علم ودانش گرفتار حسن دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ حقیقتیں پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہیں کہ سچ کچھ اور ہے حقیقت کچھ اور ہے لیکن ہمیں سنائی کہاں دیتا ہے۔ ہمارے کانوں میں شیریں کہانیاں رس گھولتی

ہیں ہمارے جذبوں کو نیند آنے لگتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں۔

نہ سہی حقیقتوں پر میرا خواب پہ تو حق ہے

میں کچھ اور دیر سو لوں مجھے دیر سے جگانا

کسی کی بات کیا کرنی، جگ بیتی کیا کہنی ہم تو خود اس جھوٹ کے ہاتھوں جانے کتنی صداقتوں کا خون کرتے آئے ہیں۔ گو خود بھی لہولہان ہو گئے لیکن پچھتائے نہیں۔ ہمیں یاد ہے، حرف حرف یاد ہے کہ نور ونکہت کا یہ چمن زار ہمیں اپنا دکھائی دینے لگا ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے جیسے ہمارے لئے ہی چلتے تھے، ساری صبحیں اور شامیں سارا حسن ہمارے قدموں میں ڈھیر کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، بلبلوں کے نغمے، کوکوں کی کوکو، پپیہے کی پیہو، گویا ہمارے لئے ہی تھا، ہم بھول گئے تھے کہ یہ باغ تو کسی اور کی ملکیت ہے، ہم تو محض چند روز کے لئے یہاں مقیم ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں خیال آتا تھا مگر ہم اس خیال کو جھٹک دیتے، فاسٹس کا نیک فرشتہ ہمیں بتاتا تھا کہ یہ پائیں باغ تمہارا نہیں، اس کے جلوے تو کسی زردار کی میراث ہیں، اس کے خاکے بھی تمہارے پاس نہیں رہ سکتے، پر ہم کہاں سنتے تھے اور کون سنتا تھا، ہمیں اس باغ کے اس ارضی جنت کے ہر پھول سے محبت ہو گئی تھی یوں لگتا تھا کہ ہر پتے پر ہمارا ہی نام لکھا ہے اور باغ کا ہر گوشہ قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ ہمارے لئے ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ دلکش گھٹائیں، یہ دلربا مناظر، ہماری کسی نیکی کے اعتراف میں ہمیں تفویض ہو گئے ہیں لیکن ہم نے کون سی نیکی کی تھی اس کا ہمیں کبھی خیال نہیں آیا یہ جھوٹ اتنا سچ تھا۔

وہ ایک جھوٹ سہی اعتبار کتنا تھا　　　　دل ونظر کو میسر قرار کتنا تھا

لیکن پھر ایچ جی ویلز کی طرح جانے کیسے ہم پھر چلتی ہوئی شاہراہوں پر گامزن ہو گئے، سب ختم ہو گیا، آنکھ کھل گئی، خواب ٹوٹ گیا، آس چھوٹ گئی، لیکن جانے کیوں پھر بھی سچ کی بجائے جھوٹ ہمیں کتنا پیارا لگتا ہے، کتنا دلکش، کتنا کومل، کتنا سندر اور ہم ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ پھر کوئی جھوٹ ہمیں سچ سے نجات دلا دے۔

قصہ ایک شام کا

میں کیا کوئی بھی سمجھ نہیں پایا اور شاید کبھی کسی کو یہ بات سمجھ آئے کہ اشکبار لمحے کبھی کبھی کیوں کر مسکرانے لگتے ہیں؟ اور ہنستی ہوئی گھڑیوں کی آنکھوں میں آنسو کیوں آجاتے ہیں؟ چلیئے چھوڑیئے! واماوبیا اس صورتحال پر سوچنے کے لئے کیا کم ہیں! کہ ہم مغز خوری کرتے رہیں، ہاں اتنا ضرور ہے جب ایسی کوئی کیفیت ہم پر طاری ہوتی ہے تو اگر کوئی سوچ اور فکر جاگتی رہ جائے تو سوچنا ضرور پڑتا ہے، لیکن سوالوں کی دھند میں کھو کر بھی کیا حاصل! چھوڑو بھئی ہم کس بحث میں الجھ گئے، یوں لگتا ہے سورج خاموشی کی گود میں محوِ استراحت ہوا چاہتا ہے، تھکی ہاری زندگی عافیت کی تلاش میں سرگرداں ہے، ہوگی! ہم تو اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے قلم کی مدد سے کاغذ سے محو گفتگو ہیں۔ جب کاغذ روٹھ جاتا ہے یا قلم کو غصہ آجاتا ہے تو اپنے آپ سے دل لگا لیتے ہیں لیکن ہم بھی اپنے کب ہیں جانے کون کون ہمیں چرا لے گیا ہے، اڑا لے گیا ہے، ہم پہ غاصب ہے۔ پھر بھی اس وہم میں ہیں کہ ہم ہیں، اپنے آپ سے دل بہلا لیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے رب سے محو کلام ہونے کی فرصت اب بھی میسر نہیں۔ ایک میلہ سا لگا ہے یادوں کا، باتوں کا، تلخ اور شیریں لیکن ہم اس محفل سے اٹھ نہیں سکتے، آداب کے خلاف ہے، سلیقہ اور قرینہ بھی کوئی بات ہے، جانے در ذہن پر کون کون دستک دیتا ہے؟ کبھی ہم دروازہ کھولتے ہیں کبھی نہیں کھولتے، کبھی کھولنے اٹھتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں کچھ منہ زور یادیں اتنی زور سے دستک دیتی ہیں کہ در کھولے ہی بنتی ہے اور پھر جانے ہم کہاں کھو جاتے ہیں ایسے لمحوں میں جہاں رنگوں کی حکومت ہے، جہاں پھولوں کی فرمانروائی ہے جہاں ساز اور آواز کا جادو ہے، خوابوں کی رم جھم ہے اور خیالوں کی دھنک کتنی خوبصورت دنیا جس میں وہ ہے، جس کا کوئی نام نہیں جس کا کوئی وجود نہیں لیکن اس کے سوا بھی تو کسی کا نام نہیں، کسی کا وجود نہیں۔ ہم اس سے باتیں کرتے ہیں وہ ہم سے محوِ کلام ہے۔ محبت کی باتیں، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے وعدے، دل خوش کن وعدے، ہوشربا باتیں باتیں ہی باتیں،"

ہمیں کون جدا کر سکتا ہے؟ بھلا کوئی کسی کو جدا کر سکا ہے جدائی فریب ہے"

محبت حقیقت ہے دنیا کی کیا مجال، صدیاں بیت گئی ہیں مگر محبت کرنے والے اس طرح زندہ ہیں۔ کتابوں میں خیالوں میں اشعار میں خوشبوؤں میں، رنگوں میں، ساز و آواز میں، ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، اُف! سب کچھ کافور، ہیلو "افتخار صاحب ہوں گے" جی بول رہا ہوں" آپ سے ملنا ہے، "معافی چاہتا ہوں، بہت معروف ہوں، پھر کسی وقت فون کیجئے گا" ٹیلی فون بھی عذاب ہے، کتنا بڑا عذاب! سائنس نے ہمیں کیا دیا؟ تنہائیاں بھی چھین لی ہیں۔ خواب بھی ہمارے نہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، ہیلو" آپ بول رہے ہیں "شیریں آواز جی بول رہا ہوں۔ کیسی ہو" آپ کیسے ہیں؟ اُف پھر بات کروں گی" عجیب بات ہے انسان فون پر بھی بات نہیں کر سکتا۔ ٹیلیفون تو بہت بڑی نعمت ہے ہمیں تو سائنس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ گھنٹی بجتی ہے ہیلو ہیلو "افتخار صاحب ہوں گے" جی بول رہا ہوں۔ "صاحب نے آپ کو اسی وقت بلایا ہے فوراً آجایئے۔" ضروری امور پر گفتگو کرنا ہے" خدا حافظ، عجیب دنیا ہے، صاحب کو شام کے وقت کیا سوجھی، اب شامیں بھی ہماری نہیں عجیب زندگی ہے۔

☆☆☆☆☆

کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

ایسا لگتا تھا کہ تمام شاموں کی تمام اداسیاں، لمحوں کی تمام محرومیاں اور ایام کی تمام تلخیاں ایک نقطے پر یکجا ہو گئی تھیں، ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں، وہ نقطہ وہ مرکز، اسکا دماغ تھا، وہ سوچوں میں گم محرومیوں سے نڈھال، حسرتوں سے سرشار، اپنے گھر کے لان میں بیٹھا تھا۔ کچھ پھول کھلے ہوئے تھے، لیکن اسے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ پھولوں کا کھلنا، کلیوں کا مسکرانا، شاخوں کا بار آور ہونا محض خیال و خواب ہیں، کتابی باتیں ہیں، شاعرانہ تخیل ہے وہ یہ شعر بار بار دہرا رہا تھا۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جب انسان اپنی آمد و رفت میں ہی آزاد نہیں تو پھر وہ آزاد کس چیز میں ہے؟ وہ کتنے بڑے بڑے فیصلے کر لیتا ہے، کتنے مصمم ارادے اس کے ذہن میں ہوتے ہیں، وہ سوچتا ہے کہ جو چاہے گا کر لے گا، بالخصوص اس وقت جب خواہشوں تمناؤں اور پھر آرزوؤں کا کوئی ایک مرکز بن جائے، لیکن پھر کیا ہو جاتا ہے انسان اس طرح بے بس، مجبور اور بے سہارا کیوں ہو جاتا ہے، اس کی تمام دانائی، اختیار اور قوتِ ارادی کہاں کھو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ سوچنے والا وہ پہلا شخص نہیں تھا، جانے اس سے پہلے کتنے ہوں گے جنہوں نے اسی طرح آرزوؤں کے ایوان سجائے ہوں گے، پھر دیکھتے دیکھتے ان کے سامنے مسمار ہو گئے ہوں گے، جانے کتنے ہوں گے جن کے چہرے اعتماد سے دمکتے ہوں گے لیکن پھر وہ حسرتوں اور مایوسیوں کا شکار ہو کر جانے کہاں کھو گئے ہوں گے؟ لیکن اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ شاید وہ پہلا اور آخری شخص ہے جس پر آسمان نے اپنا سارا غیض نازل کر دیا ہے۔ جس کے خلاف زمین نے اپنی ساری قوتیں صرف کر دی ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے وہ نہیں اٹھاتا، گھنٹی بجتی چلی جاتی ہے کوئی ہوگا؟ جانے کون ہوگا؟ لوگوں کو ٹیلی فون

کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں یوں ہی بار بار ڈسٹرب کرتے رہتے ہیں۔ گھنٹی بجنا ختم ہو جاتی ہے، شاید یہ ٹیلی فون اس نے کیا ہو؟ وہ سوچنے لگتا ہے نہیں! ایسا ممکن نہیں جانے وہ کہاں ہے اور کس کی ہو گئی ہے؟ اب اسے کچھ بھی تو یاد نہیں رہا ہوگا، کس کو یاد رہتا ہے؟ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے، سب کچھ وقت کی گرد میں کھو جاتا ہے، ہمارے وعدے ہماری قسمیں، ہمارے ارادے، سب وقت نگل جاتا ہے، لیکن وہ پھر بھی یہ سب کچھ کیوں نہیں بھلا سکا۔ ماہ و سال اسکی زندگی میں بھی تو گزرے ہیں۔ جانے کتنی صبحیں آئیں اور اس نے اس کے نام کر دیں۔ جانے کتنی شامیں آئیں جن کو تحفتاً اس نے اس کی نذر کر دیا۔ کتنی راتیں، کتنے دن، سب اس ایک یاد کے نام جو بس ایک یاد تھی۔ وہ یاد کے سوا اور کیا تھی، ہوا کا ٹھنڈا جھونکا چلتا ہے، پتے، پھل، پھول ہلنے لگتے ہیں لیکن اسے یوں لگتا ہے کہ وہ برابر گھٹن کا شکار ہے۔ اب کوئی جھونکا تسکین نہیں دے سکتا۔ یہ جھونکا یہ ہوا کا ٹھنڈا جھونکا کیوں چلتا ہے؟ فطرت اب مسکراتی ہے اسے کسی کے دکھوں کا احساس نہیں ہے، کسی جھونکے کی ضرورت نہیں، کسی ٹھنڈی ہوا کی ضرورت نہیں۔

دروازے پر ایک دستک ہوتی ہے۔ وہ پرواہ نہیں کرتا، اب وہ کس کے لئے دروازہ کھولے گا۔ ایک بار وہ اچانک اٹھتا ہے، شاید وہی ہو اور پھر ایک طنزیہ ہنسی اس کے ہونٹوں پر تیرتی ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ یہاں کون آ سکتا تھا۔ دروازہ کھولنا بیکار ہے۔ ٹیلی فون ریسیور بے مصرف، ہوا کا ٹھنڈا جھونکا بے کار، لیکن سوچنے کی بات ہے سب کچھ تو بیکار نہیں ہوتا۔ زندگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے زندگی واپس لوٹا سکتے ہیں، ٹیلی فون پر کوئی آواز دلکش ہو سکتی ہے۔ کوئی آشناء ہاتھ دستک دے سکتا ہے لیکن اسے یہ سب دیوانے کا خواب دکھائی دیتا تھا۔ فضول بے معنی اور لایعنی۔ زندگی میں دمکتے ہوئے لمحے بار بار نہیں آتے اور سارے دمکتے ہوئے لمحے دلکش نہیں ہوتے۔ آہ! کیا دلکش تھا وہ وقت! کتنے حسین تھے وہ لمحے، زندہ لمحے، جب اسکی ملاقات ریحانہ سے ہوئی تھی، ایک ہنستی مسکراتی نوجوان لڑکی، یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی طالب علم، وہ کتنی عمدہ گفتگو کیا کرتی تھی، اسے شیکسپیئر ملٹن اور کیٹس کی کتنی لائنیں

یاد تھیں۔اسے تو ان شعراء سے کچھ عشق تھا،اسے زندگی سے عشق تھا،اپنے آپ سے عشق تھا اور راشد سے بھی۔راشد اس کا کلاس فیلو تو نہیں تھا لیکن اسے ادب سے بہت دلچسپی تھی۔وہ ایک دفتر میں کام کرتا تھا۔شام کو واپس لوٹ کر ادب کا مطالعہ کیا کرتا۔ریحانہ کے والدین اس کے محلے میں آبسے تھے، وہ روشن خیال لوگ تھے۔راشد کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ریحانہ راشد سے بہت متاثر ہوئی۔اس کی ادب دوستی سے اور طرزِ حیات سے اسلوبِ زندگی سے خلوص سے، ریحانہ کبھی کبھی ادبی موضوعات پر بحث کرنے کے لئے اس کے گھر چلی جاتی اور وہ گھنٹوں ادب پر گفتگو کرتے رہتے۔

ریحانہ کا خیال تھا کہ ادب زندگی ہے،ادب کے ذریعے زندگی کا انشراح ہوتا ہے، زندگی کا پتہ چلتا ہے لیکن راشد کا خیال تھا کہ لوگ ادب کو محض لطف اٹھانے کے لئے پڑھتے ہیں، وقت گزارنے کے لئے ،دل خوش کرنے کے لئے،ادب میں جو کچھ ہوتا ہے وہ زندگی تو ہوتی ہے لیکن لوگ اسے زندگی سمجھتے نہیں،خوبصورت باتیں کرتے ہیں،ادب کا سہارا لے کر اپنی عظمت کا سکہ بٹھاتے ہیں لیکن ادب ان کی زندگی میں بوجوہ داخل نہیں ہوسکتا۔اس طرح کی بحثیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ویسے دونوں کے نظریات میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ریحانہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نا آشنا تھی۔وہ صرف یہ جانتی تھی کہ زندگی کی مشکلات کوئی اتنی بڑی مشکلات نہیں ہوتیں۔وہ روشن خیال ماں باپ کی بیٹی تھی جس پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھی،انہیں یقین تھا کہ ان کی بیٹی درست فیصلے کرتی ہے،احمق نہیں ہے،وقت گزرتا گیا، راشد اور ریحانہ ملتے جلتے رہے، ملاقاتیں بڑھتی رہیں اور پھر یوں لگنے لگا کہ جیسے وہ بہت دور نکل آئے ہیں، بہت دور جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی ، ریحانہ کو اس کا اندازہ تک نہیں ہوا، وہ ہنستی کھیلتی راشد کے ساتھ زندگی کی پگڈنڈیوں پر چلتی رہی،اسے معلوم اس وقت ہوا جب وہ ایم اے کر چکی اور اس کے والدین نے اس کی شادی کا ارادہ ظاہر کیا،اب وہ راشد کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ راشد عمر میں اس سے کہیں بڑا تھا،اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن بوجوہ وہ جاری نہیں رہ سکی تھی اور خاندانی

چپقلشوں کی وجہ سے ان کا رشتہ ازدواج قائم نہیں رہ سکا تھا، گو اس بات کو بھی کئی سال بیت چکے تھے اس نے یہ بات کبھی راشد سے پوچھی تھی نہ راشد نے بتائی تھی۔شاید دونوں ادب کے حوالے سے ایک دوسرے سے منسلک تھے لیکن ادب کو زندگی سے جدا کون کر سکا ہے حقیقت اور افسانے بعض اوقات کچھ اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے اکٹھی صبحیں اور اکٹھی شامیں گزارنے والے خواہ کسی حوالے سے بہت مختلف ہوں لیکن جانے کیوں اس طرح منسلک ہو جاتے ہیں جیسے وہ کبھی علیحدہ ہی نہ تھے۔یہ عمل شعوری بھی ہوتا ہے اور لاشعوری بھی،لیکن ریحانہ اور راشد کے حوالے سے یہ عمل بالکل لاشعوری تھا۔وہ تو ادبی موضوعات پر بحث کیا کرتے تھے لیکن ادب پر بحث زندگی پر بحث میں کب تبدیل ہو گئی اس کا احساس تک نہیں تھا اور اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ بہت دور نکل چکے تھے، ریحانہ کے والدین بڑی سنجیدگی سے اس کے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھے ریحانہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار اپنے والدین کے سامنے کیسے کرے،انہیں کیسے بتائے کہ خیال کی ہم آہنگی رکھنے والے جذبوں میں اشتراک پیدا کرنے والے،ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، یہی تو زندگی ہے یہی تو ملاپ ہے شاید یہی رشتہ ازدواج ہے، وہ یہ بات والدین سے کس طرح کرے اسے معلوم نہیں تھا۔بے شک وہ بہت روشن خیال تھے، ہر بات اس سے کر لیتے تھے زندگی کے نشیب و فراز سے واقف تھے، زندگی سے واقف تھے لیکن بعض جذبے بہت لطیف ہوتے ہیں ان کا اظہار بہت مشکل ہو جاتا ہے ریحانہ نے اشاروں کنایوں سے اپنی والدہ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر ہی دیا اور پھر وہی کچھ ہوا جو ہونا تھا۔تم جیسی ذہین لڑکی اپنے مستقبل کا فیصلہ نہیں کر سکتی تو اور کون کرے گا؟ تم جانتی ہو کہ راشد پڑھا لکھا سہی مگر دفتر میں ایک معمولی سا کلرک ہے اپنا گزر اوقات کس طرح کرتا ہے۔ریحانہ کچھ دیر تو خاموش رہی جیسے اس پر بجلی سی گر گئی ہو، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماں بھی اس انداز سے سوچ سکتی ہے۔پھر ریحانہ نے ہمت کر کے کہا کہ امی مسئلہ دل کی خوشی کا ہوتا ہے جب دل خوش ہو تو راہیں خود بخود خوشگوار ہو جاتی ہیں۔راشد کلرک سہی لیکن وہ ایک ذہین اور محنتی انسان ہے۔لیکن روشن خیال

ماں کم ازکم اس نقطے پر متفق نہیں ہو سکتی تھی وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس قدر تعلیم یافتہ نہیں تھی کہ جانتی کہ دولت کی ریل پیل ہی سب کچھ نہیں ہوتی اور یہ کہ خوشی جب دل سے پھوٹتی ہے تو زندگی کو کس قدر خوشگوار بنا دیتی ہے۔اپنی تمام تر تعلیم کے باوجود وہ روایتی شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی، وہ اپنی بیٹی کو کلرک سے کس طرح منسلک کر دے لوگ کیا کہیں گے۔ Social Status کی بھی تو کوئی بات ہوتی ہے چلو وہ عمر میں ریحانہ سے بیس سال بڑا سہی، اس سے فرق نہیں پڑتا۔جس بات سے فرق پڑتا ہے وہ اسکا معاشرے میں مقام ہے۔ریحانہ کی والدہ نے جو کچھ کہا اس سے ریحانہ بہت پریشان ہوگئی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، بہت سے دلائل اس کے پاس تھے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے تو چپ سی لگ گئی تھی۔جب یہ بات ریحانہ کے والد تک پہنچی جو ایک تعلیم یافتہ بزنس مین تھا تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔راشد کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اس حد تک بڑھ گیا اور ریحانہ اس قدر احمق کیونکر ہو سکتی تھی یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔یہ کس طرح ممکن ہے، وہ گرج کر کہنے لگا، اس کی گرج میں اتنی شدت تھی کہ ریحانہ کا دل بیٹھ گیا، اسے یوں لگا کہ وہ اب زندگی کے اس موڑ پر آ گئی ہے جہاں اسے اپنا اختتام کر لینا چاہیے۔اس نے یہ سب کچھ راشد کو بتایا۔راشد پر ایک بجلی سی گر گئی۔وہ اپنی تمام تر دانش کے باوجود نہیں جانتا تھا کہ سوچ کے اس پہاڑ سے جوئے شیر کیسے نکالے، پتھروں کو کیسے گداز کرے۔وہ اس کے والدین سے کوئی بات بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔سمجھا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ریحانہ اور راشد دونوں قدرت کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھے۔قدرت ان سے کھیل رہی تھی وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں، ریحانہ میں بغاوت کی قوت نہیں تھی اور راشد بھی اس سیلِ بے پناہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ دونوں نے دکھوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔اور ریحانہ اپنی مرضی کے خلاف رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئی۔آسمان دیکھتا رہا اور زمین بھی شق نہیں ہوئی۔ستارے بدستور چمکتے رہے پھول کھلتے رہے صرف دو دل ٹوٹ گئے، راکھ ہوگئے، راشد چند روز کے بعد دفتر گیا مگر دفتر میں اس کا دل نہیں لگتا تھا، اسے یہ مکان جس میں وہ رہتا تھا ترکے میں ملا تھا اور کوئی زرعی زمین بھی۔اس

نے دفتر جانا چھوڑ دیا طویل رخصت لے لی اور پھر استعفیٰ دے دیا۔یوں وقت گزرنے لگا ریحانہ اور راشد کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔کوئی فون نہیں آیا، کوئی خط نہیں ملا، راشد صبح کو شام کر دیتا اور شام کو صبح۔زندگی میں اس کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا لیکن جانے اسے کون روک دیتا تھا۔آج اس بات کو تین سال ہو گئے تھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس نے ٹیلی فون نہیں اٹھایا اب وہ کبھی ٹیلی فون نہیں اٹھائے گا۔شاید کبھی نہیں وہ بے ہوش سا ہو گیا۔دروازے پر دستک سنائی دی، دستک شدید تر ہوتی گئی۔بہت شدید اور چونکا وہ دروازہ نہیں کھولے گا مگر دستک کی شدت بڑھتی گئی۔راشد دروازے کی طرف بڑھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا، ریحانہ سامنے تھی ”میں آ گئی ہوں! راشد تمہاری ریحانہ آ گئی ہے۔میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی تھی“ راشد یہ سب کچھ دیکھ کر سکتے میں آ گیا، اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور پھر رک گیا ہمیشہ کے لئے، ریحانہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا وہ چیخ اٹھی اور بے ہوش ہو گئی۔اس کے شوہر نے اس کا یہ رویہ دیکھ کر اسے طلاق دے دی۔وہ اپنے شوہر کی خدمت بھی کرتی تھی، سارے کام کرتی تھی لیکن وہ اسے اپنا نہیں سکی تھی۔ایک رشتہ تھا جو دونوں میں برقرار رہا۔ریحانہ جب ہوش میں آئی تو چیختی چلاتی اپنے گھر پہنچی۔ماں باپ کو صورت حال کا کچھ اندازہ تھا وہ خوش تو تھے کہ ان کی بیٹی کی شادی ایک مل اونر کے بیٹے سے ہو گئی ہے۔لیکن آہستہ آہستہ انہیں یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ وہ غلطی پر تھے۔ریحانہ کو دیکھ کر وہ چونک سے گئے ریحانہ نے پوری کہانی جانے کس کرب سے بیان کی، کس دکھ سے سنائی، ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ سب راشد کے گھر گئے اس کے چند رشتہ داروں کو اطلاع دی اسے سپرد خاک کر دیا گیا محبت منوں مٹی تلے دب گئی۔

ریحانہ کے لئے اب کیا رہ گیا تھا۔وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن وہ ایک خیال پر اٹک سی گئی۔خودکشی مجھے کرنی چاہیے یا اس معاشرے کو، جو نوجوان روحوں کو خودکشی پر مجبور کرتا ہے، ان ماں باپ کو جو جذبوں کی زبان نہیں سمجھتے، کھنکتے ہوئے سکوں کو جذبات پر ترجیح دیتے ہیں۔اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس اندھیر نگری میں

محبت کا چراغ روشن کرے گی۔اس نے اپنے والدین کو بھی باور کرادیا کہ اس پورے المیے کے وہ ذمہ دار ہیں۔ریحانہ اس کی ماں اور اس کا باپ اب ایک تحریک کے علمبردار ہیں۔ایک پرچہ نکالتے ہیں جس میں زندگی کی ایسی سچی کہانیاں تحریر کرتے ہیں جو زندگی کو روشنی عطا کرتی ہیں۔انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب وہ ایک تنظیم بنائیں گے جو زندگی سے تعصبات ختم کرنے کیلئے وقف ہوگی،وہ یہ بات عام کردیں گے کہ محبت کرنے والے دل سچ بولتے ہیں۔

تعلیم یافتہ نوجوان اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرسکتے ہیں۔ریحانہ نے خودکشی تو نہیں کی لیکن اس کی کوشش سے جانے کتنے حساس دل اور حساس روحیں زندگی کی نامرادیوں سے نجات حاصل کر رہے ہیں۔جہاں کہیں ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔یہ تینوں اور ان کے ساتھی فریقین کو زندگی کے حقائق سے روشناس کراتے ہیں،مذہب کی من پسند تعبیر کرنے والوں کو مذہب کی اصل روح سے روشناس کراتے ہیں اور تعصبات کے لات ومنات کو پاش کرتے ہیں شادی دو دلوں کی ہم آہنگی کا نام ہے سوداگری نہیں۔شادی خوشیوں کی شمع کی لو کو تیز کرنے کا نام ہے۔کوئی مصلحت کیشی نہیں۔شادی بہ رضا و رغبت فیصلے کا نام ہے۔خاندانی وجاہت کی تشہیر نہیں،یہ وہ نعرے ہیں یہ وہ حقیقت ہے جو ریحانہ اور اسکے والدین اپنے پرچے میں شائع کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ریحانہ راشد کی موت کا کفارہ ادا کرتی ہے۔کیا اسے بھی خودکشی کرلینا چاہیے تھی یا کہ یہ اس کا طرزِ عمل راشد کی روح کو تسکین عطا کرنے کا بہترین اسلوب ہے۔یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب سے میں قاصر ہوں قارئین خود فیصلہ کریں۔

☆☆☆

آہ!۔۔وہ یاد

کبھی تو ہوش کے ناخن لے لیا کرو،عقل کی بات کرلیا کرو،جذبے اور احساسات ٹھیک سہی مگر میاں کوئی زمینی حقائق بھی ہوتے ہیں۔سنا ہے یہ لفظ آج کل بہت استعمال ہونے لگا ہے میاں”جس تن لاگے وہ تن جانے“،”تمہیں کیا خبر کبھی کسی سے پیار کیا ہو تو پتہ چلے،زندگی ختم ہو کر رہ جاتی ہے،“”پھر تو عاشق لوگ اور بھی پاگل ہیں،زندگی ختم کرنے کے لئے عشق کرتے ہیں۔یہ کیا منطق ہوئی؟زندگی جینے کے لئے ہوتی ہے میاں“،”تمہیں کیا پتہ اس موت میں کتنی زندگی ہوتی ہے،کتنی لذت ہوتی ہے اس میں؟یہ زندگی ایک پل کی ہی سہی پر صدیاں سمٹ آتی ہیں اس میں،ہر منظر میں زندگی دھڑکنے لگتی ہے،ماحول ہی بدل کر رہ جاتا ہے،اس کی حلاوت محسوس کی ہو تو جانو“”پھر روتے دھوتے کیوں ہو،زندگی سے اتنا لطف اٹھالیا ہے،کچھ کسی اور کے لئے بھی رہنے دو،ایسا ہی ہوتا ہے سب کچھ سمیٹ لینا لالچ ہے لالچ!اور لالچ بہت بڑا پاپ ہے“

”شاید تم سچ کہتے ہو اور اس لئے بھی کہ تم نے شاید سچ سنا ہے،کبھی جھوٹ نہیں سنا،کبھی کبھی جھوٹ سچ سے زیادہ سچا ہوتا ہے،کتنا دلکش ہوتا ہے لاکھ اعتبار نہ ہو،اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے،خیالی بت تراشنے میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے کہ کیا کسی سنگ تراش کو ہوتی ہوگی“

”کہاں بت تراش لئے ملطف اٹھالیا،صدیوں جی لئے،خود ہی جیتے رہو گے یا کسی اور کو بھی جینے دو گے،ویسے یار وہ تھی کون؟وہ جس نے تمہیں زندگی سے آشنا کر کے نا آشنا کردیا کوئی بھی ہو اب بات بے معنی ہے میرے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی،تھی ویسے بڑی دلکش چیز، قسمیں کھانے پہ آتی تو کوئی قسم نہیں چھوڑتی تھی،رونے پہ آتی تو روتی ہی چلی جاتی،جب مسکراتی تو ماحول مسکرانے لگتا،مجھے یوں لگتا کہ شاید زندگی انہی مسکراہٹوں میں ہے،انہی قہقہوں میں مسکراتے مسکراتے رو پڑتی،کچھ اس طرح ٹوٹ کر روتی کہ لگتا زندگی درہم برہم ہو جائے گی ماحول آنسوؤں

میں ڈوب جائے گا، کتنے وعدے کئے تھے اس نے! کتنی قسمیں کھائی تھیں! یار سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے باتیں کرتی تو کرتی ہی چلی جاتی، کہانیاں تراشنے میں وہ بے مثال تھی، اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑی خوبصورتی سے اس کا دفاع کرتی، مجھے یوں لگتا تھا کہ غلطی اس نے نہیں کی تھی میں نے کی تھی۔ بڑی چیز تھی وہ! قسمیں کھاتی تو گمان یقین میں بدل جاتا، اس کے وعدے اتنے سچے لگتے تھے کہ یقین کئے ہی بنتی تھی۔ ایسے میں اگر عقل و دانش سے انسان ہاتھ دھو بیٹھے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے، وہ محبت کو مذہب کی روح، انسانیت کا کمال اور فرد کی واحد خوشی گردانتی تھی"

"سنو! قریب آؤ، اور قریب آؤ دوست یہ قسمیں یہ وعدے بالکل سچے ہوتے ہیں تم کہتے ہو نہ کہ محبت میں کوئی جھوٹ نہیں بولتا، مجھے تمہاری باتیں سچی لگنے لگتی ہیں، خدا نہ کرے کہ تم جیسا کوئی تجربہ مجھے ہو لیکن تمہارا تجربہ بھی تو میرا اپنا تجربہ ہے نا! یار جو ہوئے یار! تمہیں نے تو کہا تھا نا کہ چچا شیکسپیئر نے اپنے ایک ڈرامے میں ایک کردار سے کہلوایا تھا کہ ارادے ہمارے اپنے ہوتے ہیں لیکن ان کا پورا ہونا ہمارے بس میں نہیں ہوتا، ہم جس وقت جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں وہ اسی وقت کہہ رہے ہوتے ہیں اور پھر سب کچھ ہماری طاقت سے باہر ہو جاتا ہے ہم لاکھ قسمیں کھائیں، بڑے بڑے ارادے کریں، بس! ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں"۔

"یہ تم فلسفی کب سے بن گئے"

"جب سے تمہاری محبت حاصل ہوئی، جانتے ہو محبت کا کتنا اثر ہوتا ہے"

"ہاں یار، ہم بھی تو اسی محبت کے گزیدہ ہیں"

"ہاں کہو نا وہی تو پوچھ رہا ہوں، کس کی محبت، کون سی محبت؟ کہاں کی محبت یار"

"یار برا ہو ان کتابوں کا عذاب ٹوٹے ان شاعروں اور ادیبوں پر، بجلی گرے ان فلم سازوں پر، جہنم رسید ہوں یہ دلکش موسم، ہوشربا فضائیں اور ہوائیں، جن کی محبت نے دماغ میں خلل پیدا کر دیا تھا، اور چچا غالب نے کہا تھا نا

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

"ہاں تو پھر کیا ہوا! کچھ کتابیں تو ہم نے بھی پڑھ رکھی ہیں، شعر ہمیں بھی اچھے لگتے ہیں، ایک آدھ فلم ہم بھی دیکھ لیتے ہیں، تو تم پہ کیا افتاد آپڑی تھی کہ تجربے کرنے نکل گئے، میاں بہت سی چیزیں تو صرف دل بہلانے کے لئے ہوتی ہیں، دل لگی کے لئے ہوتی ہیں، دل کو گھائل کرنے کے لئے نہیں"

"یار جان بوجھ کر گڑھے میں کون گرتا ہے، لیکن اگر آنکھیں ہی بند ہو جائیں یا کوئی کر ڈالے"

"تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا"

"ارے یار! کہنا کچھ اور ہوتا ہے اور ہونا کچھ اور ہوتا ہے۔ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ جب ہم قسمیں کھاتے ہیں تو سچے ہوتے ہیں اسی لئے تو وہ سچی لگتی تھی، اپنے آپ سے بھی زیادہ سچی! سب سے زیادہ سچی ویسے بھی اس کے حسن نے اس کی محبت نے اور خلوص نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا"

"یار یونہی مجبور نہیں ہو جایا کرتے، ایسی حسینائیں تو ہمیں بھی بہت ملی ہیں، ہم دو گھڑی ہنس دیئے، مسکرا دیئے، اور خدا حافظ کہا" "شاید تم سچ کہتے ہو لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اگر کوئی خوشبو سانس کا حصہ بن جائے، اگر کوئی رنگ آنکھ کے آنگن میں اتر آئے، کسی سورج کی کرنیں مساموں میں پیوست ہو جائیں کوئی چاندنی ہر طرف نور بکھیر دے، کوئی سُر سماعتوں کو زندگی عطا کر دے، کوئی لمس بجلی بھر دے، کوئی وعدہ یقین بن جائے، کوئی آہ پگھلا کے رکھ دے، بس یار چھوڑو کچھ اور کہو کیا حال ہیں تمہارے!"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن اتنا بھی ٹھیک نہیں تمہیں بیمار دیکھ کر یار اپنی بیماری کا کیا ہے یہ دائمی روگ ہے اور یہی زندگی بن گئی ہے ہاں تو تمہارا آج کیا پروگرام ہے"

"نہیں کچھ بھی تو نہیں، تم سے باتیں کرنا اور بس باتیں کرنا"

"اتنے فارغ کب سے ہو گئے ہو"

"جب سے تمہیں عشق ہوا ہے"

"یہ بھی خوب، میرے عشق سے تمہارا کیا تعلق"

"تعلق ہے نا! میں بھی تو تم ہی ہوں اور تم بھی میں ہی ہو"

"ہاں یار ٹھیک ہے تم کہاں ہو۔۔۔تم تم۔۔۔میں میں۔۔۔تم تم۔۔یا خدایا! یہاں کوئی تھا بھی یا نہیں۔۔۔یا میں خود اپنے آپ سے بول رہا تھا۔ بہت اونچی آواز میں بول رہا تھا۔۔کسی نے سن نہ لیا ہو۔ کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔۔چلو سن لینے دو۔۔اس کی یاد تو تازہ ہو گئی۔۔۔اس کی بات تو ہو گئی۔۔"

☆☆☆

تراجم

Love is a Fallacy: (Max Shulman)

محبت:ایک مفروضہ

مجھے منطق میں یدِطولیٰ حاصل تھا گر مزاجاً میں بہت نرم خو اور شائستہ تھا میں ہر شے کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، میرے سامنے ہر چیز واضح ہوتی تھی۔ استدلال میری فطرتِ ثانیہ تھی، ہاں ہاں مجھ میں یہ تمام اوصاف تھے، میرا دماغ ڈائنمو کی طرح تیز طرار تھا اور ریز ربلیڈ کی طرح تیکھا اور ذرا سوچئے میری عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس قسم کا دیو قامت ذہن ہوتا ہے کسی کا! مگر پیٹی بیلوز کے بارے میں غور فرمایئے۔ ویسے تو ہم دونوں یونیورسٹی میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ وہ میرا ہم عمر بھی تھا اور ہمارا خاندانی پس منظر بھی ایک ہی جیسا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ جیسے کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ تھا بہت شریف مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ نرا جذباتی، متلون مزاج، دوسروں سے بہت جلد متاثر ہو جانے والا اور اس کا سب سے بُرا وصف یہ تھا کہ تھا وہ نرا خبطی، عقل و خرد سے کوسوں دُور۔ وہ ہر نئے فیشن پر مرتا تھا، وہ ہر وہ کام کرتا تھا جو دوسرے کرتے تھے۔ میری نظر میں یہ حماقت کی انتہا تھی لیکن پیٹی کو اس کی کوئی پروا تک نہ تھی۔ ایک شام وہ اپنے بستر پر اس طرح سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا کہ مجھے لگا کہ وہ اپنڈیکس کے شدید درد میں مبتلا ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ ٹھہرو! حرکت مت کرو تمھیں کسی سکون آور دوا کی حاجت تو نہیں، میں ابھی کسی ڈاکٹر کو بلوائے دیتا ہوں۔ لیکن وہ چیخا "مجھے ایک ریکون کوٹ چاہیے" مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا روگ جسمانی نہیں ذہنی ہے۔ "تمھیں ریکون کوٹ کیوں چاہیے؟" وہ اپنا سر پیٹنے لگا "" میں ریکون کوٹ لے کر رہوں گا" میں نے دیوانہ وار ساری دولت کتابوں کی نذر کر دی اور اب میں ریکون کوٹ نہیں لے سکتا" میں نے بے یقینی کی حالت میں کہا تمہارا مطلب کیا ہے۔ وہ بولا یونیورسٹی میں جتنے امیر لوگ ہیں سب کے پاس ریکون کوٹ ہے۔ وہ بستر سے اٹھا اور کمرے میں دیوانہ وار گھومنے لگا۔ "میں ریکون کوٹ لے کر رہوں گا" پیٹی، ذرا ہوش کے ناخن لو۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ کوٹ بڑے غلیظ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بدبو آتی ہے، یہ بڑے بھاری بھرکم ہوتے ہیں، یہ کسی کو ایک نظر نہیں بھاتے۔ وہ چلایا ۔۔۔ ریکون کوٹ ہی سب کچھ ہے۔ میں زمانے کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں اور سنو میں کوٹ کے بدلے کچھ بھی قربان کر سکتا ہوں۔ "تم کوٹ کے بدلے کچھ بھی قربان کر سکتے ہو" میرا دماغ کچھ سوچنے لگا۔ "ہاں، کیوں نہیں، ہر چیز ۔۔۔ ہر ایک چیز" مجھے معلوم تھا کہ ریکون کوٹ کہاں سے ملے گا۔ میرا والد کالج کے دنوں میں یہ کوٹ پہنا کرتا تھا اور اب یہ اس کے کسی صندوق میں پڑا ہوا تھا۔ پیٹی کے پاس ایسی شے تھی جو میں لینا چاہتا تھا۔ وہ اس شے کا مالک تو نہیں تھا لیکن اس شے پر اس کا پہلا حق ضرور تھا۔ میں نے اس کی محبوبہ پولی ایسپی کا نام لے دیا۔ میں ایک عرصے سے پولی ایسپی کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا لیکن میرا اس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والی حسینہ تھی لیکن میرا حال یہ تھا کہ میرا دل میرے ذہن پر کبھی غالب نہیں آ سکا تھا۔ میرا تعلق اس سے کوئی جذباتی نہیں تھا بلکہ کچھ ضرورتیں تھیں جو اس کے ذریعے پوری ہو سکتی تھیں۔ وہ حسین تو تھی ہی لیکن اس کے نین نقش کوئی اتنے تیکھے نہیں تھے لیکن بظاہر وہ بڑی باوقار دکھائی دیتی تھی۔ میں پولی کو کچھ اور وجوہات کے پیشِ نظر اپنانا چاہتا تھا، میں قانون کا طالب علم تھا اور بہت جلد قانون کے پیشے سے منسلک ہونے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پیشے کے لئے کس طرح کی بیوی درکار تھی۔ گو وہ ذہین نہیں تھی لیکن میرا خیال تھا کہ میری راہنمائی میں وہ بہت نکھر جائے گی بس کوشش شرط تھی، ایک حسین سیدھی سادی لڑکی کو تیز طرار بنایا جا سکتا ہے۔ پیٹی نے سوال داغ دیا کہ کیا تمھیں اس سے محبت ہے؟ میں نے کہا کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن میں اپنے جذبے کو محبت نہیں کہہ سکتا۔ میں نے پیٹی سے پوچھا کہ کیا وہ پولی ایسپی سے ازدواجی تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا نہیں لیکن ہم اکثر و بیشتر ملتے جلتے رہتے ہیں، میں نے دریافت کیا چلو یہ بتاؤ کہ وہ کسی اور شخص سے محبت تو نہیں کرتی؟ "جہاں تک مجھے علم ہے ۔۔ نہیں!" ۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا "دیکھو اگر تم راستے سے ہٹ جاؤ تو میرے لئے میدان خالی ہو جائے گا ٹھیک ہے ناں" ۔ اس

نے کہا کہ تمہارا مطلب کیا ہے؟ میں نے بڑی معصومیت سے کہا "کوئی خاص مطلب نہیں"۔یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا اور کہا کہ میں اختتامِ ہفتہ پہ گھر جا رہا ہوں اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا سنو! گھر جا کر اپنے ابو سے کچھ روپے میرے لئے لے آنا تا کہ میں ایک ریکون کوٹ خرید لوں۔میں نے کہا "فکر نہ کرو میں کچھ نہ کچھ اس سے بہتر ہی کروں گا"۔میں نے یہ بات بڑے پراسرار انداز میں کی۔سوموار کو میں واپس آیا میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور بھاری بھر کم بالوں والا اپنے باپ کا ریکون کوٹ اس کے سامنے رکھ دیا اس نے اپنے ہاتھ کوٹ میں دھنسا دیئے اور پھر چہرہ بھی اس میں چھپا لیا۔اس نے کوئی پندرہ بیس بار واہ واہ کہا "تمہیں یہ پسند ہے ناں" میں نے پوچھا "کیوں نہیں کیوں نہیں" اس نے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔"مجھے پولی چاہیے! وہ سہم سا گیا "تمہیں پولی چاہیے ٹھیک ہے"۔اس نے کوٹ پھینک دیا "ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا" اس نے بڑی جوانمردی سے کہا۔"چلئے ٹھیک ہے" میں نے کہا۔"تم نہیں چاہتے کہ تم بڑے لوگوں جیسے ہو جاؤ" پھر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی کتاب پڑھنے لگا مگر وہ کوٹ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی غریب بچہ بیکری کی کھڑکی سے اندر پڑی ہوئی اشیاء کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنے آپ پر قابو پا لے لیکن کوٹ اس کے سامنے پڑا تھا۔لگتا تھا کہ کوٹ کی خواہش اسے کھائے جا رہی ہے بالآخر وہ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار کوٹ کی طرف دیکھنے لگا۔اس میں کوٹ کی خواہش سلگنے لگی اور پولی کے بارے میں اس کی مستقل مزاجی جواب دینے لگی۔میں نے کہا "دیکھو مجھے پولی سے کوئی پیار نہیں ہے، پولی میری لگتی کیا ہے، بس میں تو کچھ دیر کے لئے اس کے ساتھ گپ شپ کرنا چاہتا ہوں، دل بہلانا چاہتا ہوں، کچھ مسکرانا چاہتا ہوں، اس کے سوا اور کچھ نہیں، تم کوٹ پہن کر دیکھو" اور اس نے کوٹ پہن لیا، کوٹ اس کے کانوں اور جوتوں تک پھیلا ہوا تھا لگتا تھا کہ وہ خود ریکون میں ڈھل گیا ہے، ہاں یہ عین میری جسامت کے مطابق ہے، میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور کہا لاؤ ہاتھ سودا ہو گیا ناں۔اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا لیا۔

پولی سے میری پہلی ملاقات اگلی ہی شام کو ہوئی دراصل یہ اس کو جھنے بوجھنے کی ملاقات تھی مجھے دیکھنا تھا کہ اسے اپنے معیار تک لانے میں مجھے کتنی محنت کرنا ہو گی میں نے اس کے ساتھ کھانا کھایا اور فلم دیکھی۔جب ہم وہاں سے اٹھے تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ فلم بہت اچھی تھی، پھر میں نے اسے اس کے گھر پہنچا دیا۔اس نے رخصت ہوتے وقت کہا میرا وقت بہت ہی پر جوش گزرا ہے۔میں اپنے کمرے میں بوجھل دل کے ساتھ داخل ہوا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتنی بڑی مہم ہے جو مجھے سر کرنا ہو گی۔پولی کی معلومات صفر کے برابر تھیں۔مجھے لگا کہ مجھے تو اسے بہت کچھ سکھانا پڑے گا اور یہ کام بہت ہی مشکل دکھائی دیتا تھا، پہلے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے پھر پیٹی کے حوالے ہی کر دوں لیکن پھر مجھے اس کی بھرپور جوانی کا خیال آیا، مجھے یاد آیا کہ وہ کس خوبصورتی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور کس نفاست سے اس نے چھری کانٹوں کا استعمال کیا تھا، یوں میں نے عہد کر ہی لیا کہ اس مجسمۂ حسن کی تربیت کر ہی لی جائے، میں نے یہ کام بڑے قرینے اور سلیقے سے شروع کیا، پہلے تو میں نے اسے منطق کے بارے میں تفصیل سے بتایا کیونکہ ان دنوں میں خود قانون کا طالب علم تھا اور منطق کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور تمام حقائق مجھے معلوم تھے۔دوسری ملاقات میں، میں نے اس سے منطق کے بارے میں بہت سی باتیں کیں "یہ تو بہت بڑا وبال ہے" وہ کہنے لگی۔اس حسینہ کے بارے میں ایک بات کہہ دوں کہ اس جیسی کوئی اور ملنا مشکل تھی ہم کیمپس میں پہنچے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

اس نے میری طرف مشتاق نگاہوں سے دیکھا "آج ہمیں کس موضوع پر گفتگو کرنا ہے" وہ کہنے لگی۔میں نے بتایا کہ ہم منطق پر بات کریں گے، اس نے قدرے سوچا اور پھر سیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔میں نے اسے بتایا کہ منطق سوچنے کے علم کو کہتے ہیں، ہمیں درست سوچ پیدا کرنے کے لئے منطق کے عام مفروضوں کو سمجھنا پڑے گا اور ایک ایک کر کے ان پر غور کرنا ہو گا۔وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی "آؤ پہلے اس مفروضے پر غور کریں جسے منطق میں "سادہ اصول" (Dicto Simpliciter) کہتے ہیں۔اس سے مراد ایسی دلیل ہے جو بے بنیاد مفروضے پر

منی ہوتی ہے مثال کے طور پر ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ "ورزش بہت اچھی چیز ہے اس لئے ہر ایک کو ورزش کرنی چاہیے"۔ پولی نے کہا ہاں مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن میں نے کہا کہ اس مفروضے میں کوئی وزن نہیں کیونکہ ورزش ہر ایک کے لئے مفید نہیں ہوتی مثلاً اگر کسی کو دل کا عارضہ لاحق ہو تو اس کے لئے ورزش مفید نہیں ہوگی اور طبیب ورزش کا مشورہ نہیں دیں گے اس لئے ضروری ہے کہ عام بیان دیتے وقت اس کے ہر پہلو پر غور کر لیا جائے ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ورزش عام طور پر اچھی ہوتی ہے یا یہ کہ بہت سوں کے لئے ورزش مفید ہوتی ہے، اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو اسے "سادہ اصول"(Dicto Simpliciter) کہا جائے گا، کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا "بالکل نہیں، لیکن یہ ہے بڑی مزیدار بات۔ کچھ اور بتاؤ۔ میں نے کہا، کوشش کرو تمہیں سب کچھ سمجھ آجائے گا۔ چلو اب ایک اور مفروضے کا ذکر کرتے ہیں اسے "جلد بازی کا نتیجہ"(Hasty Generalization) کہتے ہیں۔ دیکھو تم فرانسیسی نہیں بول سکتی مجھے فرانسیسی نہیں آتی، بچی بھی فرانسیسی نہیں جانتا اس لئے یہ نتیجہ نکال لینا کہ مین سوٹا کی یونیورسٹی میں کوئی فرانسیسی نہیں بول سکتا "جلد بازی کا نتیجہ"(Hasty Generalization) کہلائے گی۔ پولی نے حیرت زدہ ہو کر کہا بالکل ٹھیک ہے۔ میں بہت جھنجلایا۔ میں نے کہا "پولی یہ مفروضہ بڑی جلدی میں قائم کیا گیا ہے" اس نے ہانپتے ہوئے کہا کوئی اور مفروضہ اور کہا منطق تو رقص سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ میں کچھ دیر پریشان ہوا مجھے لگا کہ میں پولی کو سکھا نہیں سکوں گا۔ لیکن پھر بھی مجھے کوشش کرتے رہنا چاہیے اور میں نے اپنی کوشش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا کہ اگلا مفروضہ ہے Post Hoc(دلیلِ باطل)۔ مثال کے طور پر ہم کہیں کہ ہمیں "بل" کو سیر پر اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہیے کیونکہ جب کبھی بھی ہم اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں بارش ہو جاتی ہے اس نے کہا ہاں میں بھی ایک لڑکی کو جانتی ہوں جس کا نام "یولا بیکر" ہے جب بھی ہم اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو بارش آتی ہے۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ یولا بیکر بارش نہیں برساتی اس کا بارش سے کوئی تعلق نہیں، میں اب ایسا نہیں کہوں

گی" اس نے کہا۔ کیا تم پاگل ہو گئی ہو، میں نے ایک گہری آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس نے کہا مجھے کچھ اور مفروضے بتاؤ۔ میں نے کہا آؤ ایک اور مفروضے پر گفتگو کرتے ہیں جسے Contradictory Premises(متضاد منطق) کہتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئی، میں جھنجلا سا گیا، پھر بھی میں نے اپنی بات جاری رکھی، میں نے اس مفروضے کی ایک مثال دی مثلاً "اگر خدا ہر چیز بنا سکتا ہے تو کیا وہ ایسا بھاری پتھر نہیں بنا سکتا جو وہ خود نہ اٹھا سکے" اس نے کہا ہاں! ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے بتایا کہ "اگر وہ ہر چیز پر قادر ہے تو وہ بھاری سے بھاری پتھر بھی اٹھا سکتا ہے" پھر وہ سنجیدہ ہو گئی جیسے اسے کچھ سمجھ آ گیا ہو۔ وہ اپنا سر کھجلانے لگی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ کہنے لگی۔

میں نے اسے بتایا کہ اگر کسی چیز کو بنایا جا سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سامنے کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہلایا نہ جا سکتا ہو۔ اس نے کہا "ہاں مجھے سمجھ آ گئی ہے" مجھے کچھ اور بتاؤ۔ میں نے کہا کہ بہت وقت ہو گیا ہے اب میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا تاکہ تم ان اسباق کو دہرا سکو۔ پھر ہم کسی اور دن ان پر گفتگو کریں گے میں نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔

اس نے مجھے کہا کہ یہ شام بڑی پریشان کن شام تھی پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں بچی سویا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ ریکون کوٹ اسکے پاؤں میں پڑا تھا میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اسے جگاؤں اور اسے کہوں کہ وہ اپنی محبوبہ کو واپس لے لے، مجھے لگ رہا تھا کہ میرا سارا منصوبہ خاک میں مل رہا ہے۔ لڑکی کا دماغ منطق سمجھنے سے بالا ہے پھر میں نے سوچا کہ اگر میں نے ایک شام ضائع کر ہی دی ہے تو چلو ایک اور سہی۔ شاید اسے کچھ سمجھ پڑنے لگے، اس کے دماغ میں شاید چنگاریاں سوئی ہوں جو شعلہ بن جائیں، مجھے امید تو نہیں تھی لیکن میں نے کوشش کرنے کی ٹھان لی، ہم پھر اکٹھے ہوئے اور اسے کہا کہ آج کا مفروضہ ہے Admisericodiam(سوال گندم جواب چنا) وہ خوشی سے اچھل پڑی، میں نے کہا غور سے سنو، ایک آدمی ملازمت کے لئے درخواست دیتا ہے جب اس کا افسر اس کی تعلیمی استعداد کے

بارے میں پوچھتا ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ اس کی بیوی اپاہج اور چھ بچے ہیں۔ بچوں کے پاس کھانے کیلئے کچھ بھی نہیں، نہ تن پہ کپڑے ہیں اور نہ پاؤں میں جوتے۔ گھر میں کوئی بستر بھی نہیں، سردیاں آنے والی ہیں ہمارے پاس کوئی کوٹ بھی نہیں۔ اس منطقی مفروضے کو سن کر پولی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس کی رخساروں تک ڈھلکنے لگے وہ کہنے لگی بے بس بے چارہ! میں نے کہا ہاں یہ خوفناک بات ہے۔ لیکن یہ اس سوال کا جواب نہیں جو افسر نے پوچھا تھا۔ درخواست دہندہ اپنی صلاحیتوں کی تو کوئی بات کرتا ہی نہیں بلکہ اپنے دکھ سنا کر افسر کی ہمدردیاں جیتنا چاہتا ہے۔ اسے کہتے ہیں (Ad Misericodiam) سوال گندم جواب چنا۔ کیا تمہیں کچھ سمجھ آئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

کہنے لگی تمہارے پاس کوئی رومال ہے میں نے اسے ایک رومال دیا وہ بہت افسردہ ہو گئی تھی، پر وہ چاہتی تھی کہ اس کے بعد ہم ایک اور منطقی مفروضے پر گفتگو کریں۔ میں نے کہا کہ اگلا مفروضہ False Analogy (قیاسِ باطل) ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ امتحان میں طلباء کو کتابیں دیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے، دیکھو، سرجن بھی تو اپریشن کرتے وقت ایکسریز کی مدد لیتے ہیں، اسی طرح معمار مکان بناتے وقت نقشے کی مدد لیتے ہیں تو پھر طلباء کو بھی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ امتحان میں نصابی کتب سے مدد لے سکیں، اس نے کہا، ''کیا ہی عمدہ خیال ہے'' میں نے کہا پولی مگر تمہیں سوچنا چاہیے، یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی۔ ڈاکٹرز اور معمار امتحان نہیں دے رہے ہوتے، یہ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں اور تم ایک دلیل کو دوسری صورتحال میں استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ یہ مثال ہی غلط ہے۔ اس نے کہا مجھے تو یہ خیال اچھا لگتا ہے میں نے کہا چلیئے اب کسی اور مفروضے پر گفتگو کر لیتے ہیں، جسے Hypothesis Contrary to Fact (حقائق کے برعکس مفروضہ) کہتے ہیں۔ پولی نام سن کر بہت خوش ہوئی، سنو اگر میڈم کیوری اپنی پلیٹ میں معدنی یونیورینم آکسائیڈ کا ٹکڑا دراز میں رکھ کر بھول جاتی تو آج دنیا ریڈیم سے محروم ہوتی ٹھیک ہے پولی نے کہا۔

''یہ بیان درست نہیں'' میں نے کہا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میڈم کیوری کبھی بعد میں ریڈیم دریافت کر لیتی یا کوئی اور شخص دریافت کر لیتا۔ چنانچہ آپ ایک مفروضے کو آفاقی حقیقت نہیں کہہ سکتے اور کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے، میں نے کہا اسے ایک اور موقع دیا جائے، لیکن میری بے صبری کی انتہا ہو رہی تھی۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی، بہر حال میں نے کہا ایک اور مفروضہ ہے جسے Poisoning the Well (کنویں کو زہر آلود کرنا) کہتے ہیں۔ ''بہت عمدہ''۔ اس نے کہا۔ میں نے کہا اس مفروضے کا مطلب یہ ہے کہ دو آدمی آپس میں گفتگو کر رہے ہیں ان میں سے ایک اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا مخالف بدمعاش اور جھوٹا ہے اور تمہیں اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے پولی نے کہا یہ تو بہت بُری بات ہوئی۔۔۔ پھر مجھے یوں لگا کہ اسکی آنکھ میں کوئی ذہانت کی چمک آ گئی ہے اس نے کہا یہ طریقہ کار درست نہیں یہ بالکل غلط ہے دوسرے آدمی کے پاس اب کیا بچے گا جب پہلا شخص اس پر اتنے الزام تھوپنے لگ گیا ہے، مجھے بہت خوش ہوئی میں نے کہا کہ پہلے آدمی نے ماحول ہی خراب کر دیا ہے۔ اور اپنے مخالف کو بولنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ پولی مجھے تم پہ فخر ہے، میں نے کہا، پولی بہت خوش ہوئی۔ اس نے کہا، یہ تمام مفروضے سمجھنا مشکل ہیں۔ پھر میں نے اس کے سامنے ایک ایک کر کے سارے مفروضے دہرائے اور مثالیں دیں۔ میں نے پانچ شامیں خرچ کیں لیکن ٹھیک ہی خرچ کیں۔ اب وہ منطق کو سمجھ چکی تھی میں اسے منطقی بنا چکا تھا۔ میرا کام ختم ہوا، اب وہ میرے لئے بہت مناسب تھی، وہ میری بیوی بننے کی اہل تھی، وہ میرے مہمانوں کی اچھی طرح میزبانی کر سکتی تھی، میرے بچوں کی اچھی ماں بن سکتی تھی، آپ یہ سمجھئے کہ مجھے اس سے کوئی محبت نہ تھی بلکہ میرا حال پگ ملین جیسا تھا جسے اپنے مجسمے سے ٹوٹ کر محبت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا پولی اب ہم مزید مفروضوں کی بات نہیں کریں گے وہ کچھ آسودہ سی ہو گئی میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی دیکھو ہم نے پانچ شامیں خرچ کر لی ہیں اور ہم نے یہ سب کچھ نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ دیکھو ہم اب شادی کر سکتے ہیں! پولی نے جواب میں یہ منطقی

مفروضہ پیش کیا۔Hasty Genralization(بہت جلد نتیجہ خیزی) میں نے کہا کیوں !اس نے کہاتم کیسے کہہ سکتے ہو کہ پانچ شاموں میں یہ فیصلہ ممکن ہے کہ ہم ازدواجی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔میں خوشی سے مسکرادیا۔میری پیاری پولی نے سبق اچھی طرح یاد کرلیا تھا میں نے اسے تھپکی دی اور کہا پانچ شامیں بڑی ہوتی ہیں دیکھو کسی کیک کی شناخت کے لئے پورے کیک کو کھا لینا ضروری نہیں ہوتا۔پولی نے بڑی پھرتی سے اس کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا کہنے لگی۔(False Analogy)"غلط تشبیہ" میں کوئی کیک نہیں ہوں۔میں ایک لڑکی ہوں۔میں پھر ہنس دیا اور مجھے بڑی خوشی سی ہوئی، بچے نے اسباق یاد کر لیئے ہیں بلکہ بڑی اچھی طرح یاد کر لئے ہیں ۔میں نے طریقہ کار بدلنے کا فیصلہ کیا میں نے سیدھے سادے انداز میں بولنا شروع کر دیا، میں نے کہا پولی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔تم میرے لئے ایک دنیا ہو، چاند جیسی ہو، چمکتے ہوئے تاروں جیسی ہو،اے میری پیاری محبوبہ کہہ دو کہ تم مجھ سے شادی کروگی،اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میرے لئے جینا حرام ہوجائے گا۔میں تڑپوں گا، میں نہ کھاؤں گا نہ پیئوں گا اور میں بالکل ختم ہو کر رہ جاؤں گا میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے باندھ دیئے، جواب میں اس نے کہا یہ تو Ad Misericodiam(سوال گندم جواب چنا) ہے، میں نے اپنے دانت پیسے، میں پگ ملین نہیں تھا، میں فریک انسٹائن نہیں تھا اور میرا اپنا بھوت مجھے نگل گیا، میں نے اپنا درد اور دکھ اور کرب چھپانے کی کوشش کی، دیکھو پولی میں نے ہنسنے کی کوشش کی ،تم نے سارے مفروضے یاد کر لیئے ہیں اور تم بالکل صحیح ہو لیکن دیکھو تمہیں یہ سب کچھ کس نے سکھایا؟اس نے کہا تم نے، میں نے کہا تو پھر میرا تم پر کچھ تو حق ہے اگر میں تمہیں نہ ملتا تو تم یہ سب کچھ نہ سیکھ پاتی، جواب میں اس نے کہا "یہ مفروضہ حقائق کے خلاف ہے"Hypothesis Contrary to Fact۔مجھے پسینہ آگیا دیکھو یہ سب کچھ لفظ بلفظ اپنانا نہیں چاہیئے۔دیکھو یہ کلاس روم کی باتیں ہیں، دیکھو جو کچھ ہم سکول میں سیکھتے ہیں اس پر زندگی میں کہاں عمل کرتے ہیں،اس نے بڑی بدجنگی سے کہا "یہ تو سادہ سا اصول ہوا"Dicto Simpliciter میں نے کہا "چلو بتاؤ مجھ سے شادی کرو

گی یا نہیں"اس نے کہا"بالکل نہیں"، میں نے کہا"اس کی کوئی وجہ"،اس نے جواب میں کہا"آج ہی شام میں نے پیٹی بلوز سے اپنا رشتہ جوڑلیا ہے اور میں اس پر قائم بھی رہوں گی"،میرا سر چکرا گیا میں نے کہا یہ کیا ہوا تم اس سے شادی نہیں کر سکتی، وہ جھوٹا ہے،وہ دغاباز ہے، وہ ایک چوہا ہے، پولی نے کہا کہ یہ تو "کنویں کو زہر آلود کرنے"(Poisoning the Well)والی بات ہوئی۔میں نے کہا"خاموش خاموش!تم ایک فلسفے کی طالب علم ہو تمہیں فلسفیانہ انداز سے سوچنا چاہیے تم پیٹی کو مجھ پر کیسے ترجیح دے سکتی ہو دیکھو میں کتنا ذہین فطین ہوں، میرا مستقبل روشن ہے اور پیٹی!وہ کچھ بھی نہیں اسے یہ تک معلوم نہیں کہ اس کا اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔کیا تم کوئی منطقی دلیل دے سکتی ہو کہ تم اسے مجھ پر کیوں ترجیح دے رہی ہو"اس نے کہا" کیونکہ اس کے پاس "ریکون کوٹ" ہے۔

☆☆☆☆

Three Days to See :(Helen Keller)

بارِ الٰہ! بینائی کے صرف تین دن

ہم سب نے ایسی سنسنی خیز کہانیاں سن رکھی ہیں جن میں ہیرو کے پاس جینے کے لئے مختصر سا وقت ہوتا ہے، کبھی صرف ایک برس ہوتا ہے اور کبھی صرف ۲۴ گھنٹے۔ ہماری دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ سزا یافتہ، تختہ دار پر چڑھنے والا ہیرو ان باقی دنوں کو کیسے گزارے گا اور اس کا آخری لمحہ کتنا اذیت ناک ہوگا۔ میں ان اشخاص کی دلچسپی کی بات کر رہی ہوں جو آزاد ہوتے ہیں اور انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہوتا اور ان کے پاس جینے کے لئے وقت ہی وقت ہوتا ہے۔

جب ہم ایسی کہانیاں پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اگر ہم اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے تو بھلا کیا کرتے۔ ہمارے ذہن میں کیسے کیسے خیالات آتے اور بچے دنوں کو ہم کس طرح یاد کرتے، کن لوگوں کی یادیں ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں براجمان ہو جاتیں اور ہمیں ماضی کو یاد کر کے کتنی خوشی ہوتی اور کتنا دُکھ!

کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ کتنا اچھا ہو کہ ہم اپنے ہر ایک دن کو ایسے گزارنا سیکھ جائیں جیسے کہ یہ آخری دن ہو۔ اس سے ہمارے دل و دماغ میں زندگی کی اہمیت کا احساس جاگزیں ہو جائے گا اور پھر ہم ہر ایک دن کو نہایت متانت اور سنجیدگی سے گزارنا سیکھ جائیں گے اور مظاہرِ فطرت کا زیادہ دلچسپی سے مطالعہ کرنے لگیں گے اور ہمیں یہ احساس نہیں ہوگا کہ ہمارے پاس تو ابھی کئی دن، کئی مہینے اور کئی برس پڑے ہیں اور ایسی صورت میں یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ منچلے عیاشی کو اپنا مطمعِ نظر بنا لیتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں "کھاؤ پیؤ اور خوشی مناؤ" کیونکہ مر تو جانا ہی ہے لیکن جب یہ صورتحال نہ ہوگی اور وقت کے محدود ہونے کا احساس ہوگا تو لوگوں کو موت کا خیال آئے گا اور ان میں دل ودماغ کی پاکیزگی جنم لے گی۔ کہانیوں میں یوں بھی ہوتا ہے کہ سزا یافتہ تختہ دار پر چڑھنے والا ہیرو معجزانہ طریقے سے آخری لمحے بچ نکلتا ہے لیکن ان دونوں صورتوں میں

چاہے وہ بچ نکلے یا نہ بچ نکلے وہ زندگی کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھنا ضرور سیکھ لیتا ہے اس میں زندگی کی اہمیت کا احساس زیادہ بیدار ہو جاتا ہے اور وہ روحانی طور پر زیادہ قوت حاصل کر لیتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ لوگ جن پر موت کا خوف سوار رہتا ہے ان میں ایک طرح کی نرم خوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اس دنیا کو مختصر ٹھکانہ تو مانتے ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی گردش کرتا رہتا ہے کہ ہمیں ایک دن تو بالآخر مرنا ہی ہے لیکن جانے کیوں ہمیں موت کا دن بہت دور نظر آتا ہے، جب ہم کسی بیماری سے پوری طرح صحت یاب ہو جاتے ہیں تو موت کا تصور ہی سرے سے کافور ہو جاتا ہے اور ہم موت کے بارے میں شاذ و نادر ہی سوچتے ہیں، یوں لگنے لگتا ہے کہ ابھی تو ہمیں جانے کب تک زندہ رہنا ہے یوں ہم اپنے چھوٹے موٹے کام سرانجام دیتے رہتے ہیں اور زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہی نہیں۔

اس طرح کی شانِ بے نیازی ہم اپنی تمام حیات کے بارے میں برتتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سماعت سے محروم ہی سماعت کی اہمیت سے آگاہ ہوتا ہے اور بصارت سے محروم ہی بصارت کی نعمتوں کا اِدراک کر سکتا ہے۔ یہ بات بالخصوص ان پر زیادہ منطبق ہوتی ہے جن کی سماعت و بصارت جوانی میں ختم ہو جائے، وہ لوگ جنہیں بصارت اور سماعت کی محرومی کا حادثہ پیش نہیں آتا وہ ہرگز سمعی اور بصری صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ نہیں کرتے۔ وہ دیکھتے تو ہیں مگر نہایت سطحی طور پر اور سنتے تو ہیں مگر بڑی ہی بے اعتنائی سے۔ گویا ہم اس چیز کی قدر ہی نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہے۔ ہم صحت کی بھی اس وقت تک قدر نہیں کرتے جب تک کہ ہم بیمار نہ پڑ جائیں۔ کبھی کبھی تو میں یوں بھی سوچتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہوگی کہ اگر ہر شخص کچھ دنوں کے لئے اپنی جوانی کے دنوں میں بینائی اور سماعت کھو بیٹھے تو پھر اسے اندھیرے اجالے، خاموشی اور آواز کا فرق معلوم ہو سکے گا۔ اکثر و بیشتر میں جاننے کی کوشش کرتی ہوں کہ میرے بینا احباب بینائی سے کس قدر مستفید ہوں گے، ابھی حال ہی کی بات ہے کہ میری ایک دوست جنگلوں کی سیر کر کے میرے پاس آئی میں نے پوچھا کہ اس نے اس طویل سیر میں کیا کیا دیکھا اور اس نے فٹ

سے جواب دیا "کچھ خاص نہیں"

میں بہت حیران ہو جاتی اگر میں نے پہلے بھی اس طرح کے جوابات نہ سنے ہوتے لیکن مجھے اس کا یقین ہو گیا ہے کہ دیکھنے والے بہت ہی کم دیکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں سوچتی ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی جنگلوں اور بیابانوں میں ایک گھنٹے تک گھومتا پھرتا رہے اور اسے کوئی قابلِ ذکر منظر دکھائی ہی نہ دے۔ مجھے جسے نظر ہی نہیں آتا میں اپنی قوتِ لامسہ سے ہزاروں دلچسپ چیزیں محسوس کر لیتی ہوں، مجھے ایک پتے کے لطیف بانکپن کا احساس ہوتا ہے۔ میں بڑے پیار سے اس کی ہموار سطح پر اپنی انگلی پھیرتی ہوں کبھی درختوں کے چھلکے کو چھوتی ہوں موسمِ بہار میں درختوں کی شاخوں کو ٹٹولتی ہوں کہ کوئی کلی چھولوں اور یہ دیکھوں کہ فطرت موسمِ سرما کے بعد نیند سے کیسے بیدار ہوتی ہے میں پھولوں کی مخملی ساخت محسوس کر لیتی ہوں اور ان کی حیرت انگیز تہیں میرے دل کو موہ لیتی ہیں اور یوں فطرت کے معجزات مجھ پر منکشف ہوتے رہتے ہیں اور اگر کبھی مجھے موقع مل جائے تو میں بڑی نرمی سے درختوں کو چھوتی ہوں اور پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور تھرتھراہٹ ایک نغمے کی صورت محسوس کرتی ہوں مجھے ندیوں میں سرسراتا ہوا ٹھنڈا پانی بہت بھلا لگتا ہے میں اسے انگلیوں سے چھوتی ہوں اسی طرح شاہ بلوط کے درخت مخملی محسوس ہوتے ہیں اور گھاس اسفنج کی طرح سے نرم ولطیف ہوتی ہے ایرانی قالین بھی میری قوتِ لامسہ کو تسکین دیتے ہیں، موسموں کے مناظر مجھے قوت عطا کرتے ہیں اور میری انگلیوں کی پوریں ندیوں کی روانی کو محسوس کر سکتی ہیں۔ کبھی کبھی میں بڑی شدت سے خواہش کرنے لگتی ہوں کہ کاش میں ان سب مناظرِ فطرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ اگر صرف ان کو چھو لینے سے مجھے اس قدر فرحت محسوس ہوتی ہے تو ان کی ایک جھلک میرے لئے کس قدر راحت و تسکین کا باعث ہو گی، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ جو بینائی کی دولت سے مالا مال ہیں وہ بھی تو کچھ نہیں دیکھتے، رنگ و روپ اور سارے کا سارا حرکی منظر نامہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے شاید یہ انسانی فطرت ہے کہ جو کچھ پاس ہو اس کی قدر نہ کی جائے اور جو کچھ نہ مل سکے اس کی آرزو تڑپاتی رہے لیکن مجھے یہ سوچ کر بہت

افسوس ہوتا ہے کہ رنگ و نور کی دنیا میں نظر کی نعمت کی کس قدر بے قدری کی جاتی ہے صرف وہی چیزیں دیکھی جاتی ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر میں کسی یونیورسٹی کی سربراہ ہوتی تو میں ایک کورس لازمی قرار دیتی جس میں یہ سکھایا جاتا کہ آنکھوں کا استعمال کیسے کرنا چاہیے۔ اساتذہ یہ سکھاتے کہ جن چیزوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ کتنی اہم ہوتی ہیں اور وہ ان کی دیکھنے کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتے۔ میں اس صورتِ حال کا اظہار کچھ اس طرح سے کر سکتی ہوں کہ اگر مجھے صرف تین دن کے لئے بینائی مل جائے۔ ہاں! صرف تین دن کے لئے ـــــ تو میں بینائی کو کیسے استعمال کروں گی اور آپ کو بھی تصور کر لینا چاہیے کہ اگر آپ کے پاس دیکھنے کے لئے صرف تین دن ہوں تو آپ اپنی بینائی کا استعمال کیسے کریں گے اور آپ پر تیسری رات یہ حقیقت منکشف ہو کہ آپ اب سورج کو طلوع ہوتے نہیں دیکھ سکیں گے تو پھر آپ ان تین دنوں کو کیسے گزاریں گے، کس چیز پر آپ کی نظریں خاص طور پر جم کر رہ جائیں گی؟ میں تو ان چیزوں کو دیکھنا پسند کروں گی جو مجھے اندھیروں میں عزیز رہی ہیں اور آپ ان اشیاء پر آنکھیں جمائیں گے جو اجالوں میں آپ کا دل موہ لیتی رہی ہیں کہ ان کی یادیں آپ کے دل میں محفوظ رہ سکیں۔

اگر معجزاتی طور پر مجھے دیکھنے کے لئے تین دن مل جائیں اور پھر مجھے اندھیروں میں ڈوب جانا ہو تو میں ان تین دنوں کو مختلف مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے وقف کر دوں گی۔

پہلے دن میں ان اشخاص کے چہروں پر اپنی نظریں گاڑ دوں گی جن کی نوازشات نے میری زندگی کو کامیاب بنایا۔ سب سے پہلے میں اپنی معلّمہ Mrs. Anne Sulivan Macy پر نگاہیں گاڑ دوں گی جو میری زندگی میں اس وقت داخل ہوئی تھیں جب میں ایک بچی تھی اور ان کی مدد سے میں تمام دنیا سے واقف ہوئی میں ان کے خدوخال ہی دیکھنا پسند نہیں کروں گی کہ میں انہیں اپنی یادداشتوں میں محفوظ رکھ سکوں بلکہ میں ان کے چہرے میں وہ ہمدردی، لطافت، مستقل مزاجی تلاش کرنے کی کوشش بھی کروں گی جن کے باعث انہوں نے میری تعلیم کا

نہایت مشکل فریضہ سرانجام دیا۔ میں ان کی آنکھوں میں اس کردار کی روشنی محسوس کروں گی جس کے باعث وہ مستقل مزاج رہیں اور میں اس ہمدردی اور انسان دوستی کو بھی تلاش کروں گی جس کا اظہار انہوں نے اکثر و بیشتر کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوست کے دل میں جھانکنے کا مطلب کیا ہوتا ہے یہ آنکھ ہوتی ہے جسے ہم روح کی کھڑکی سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں تو صرف اپنی انگلیوں کے پوروں سے چہروں کے خدوخال دیکھ سکتی ہوں، میں تو چند ظاہری علامات جیسے مسکراہٹ، غم اور اس طرح کے دیگر جذبات کا اندازہ لگا سکتی ہوں۔ میں چھو کر اپنے دوستوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس طرح ان کی شخصیت کا ادراک کرتی ہوں، ان کے خیالات سے ان کا اندازہ لگاتی ہوں اور ان کے رویے سے ان کے بارے میں نتائج اخذ کرتی ہوں مگر مجھے وہ سہولت حاصل نہیں کہ میں بہت گہرائی سے انہیں سمجھ سکوں یہ تو صرف بینائی ہی سے ممکن ہے۔ آنکھوں سے ان کے عمل اور ردِعمل کا اندازہ ہوتا ہے اور انکے تمام ردِعمل ان کے چہروں پر مرتسم ہوتے ہیں۔

جو احباب میرے قریب تر ہیں میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ سالہا سال سے وہ مجھ پر منکشف ہو رہے ہیں لیکن جو احباب کبھی کبھار ملتے ہیں ان کے بارے میں میری معلومات نہایت ادھوری ہوتی ہیں، جو محض مصافحہ کرنے، ان کے الفاظ سننے اور ان کے ہونٹوں کو اپنی انگلیوں سے چھونے سے حاصل ہو سکتے ہیں یا جو کچھ میری ہتھیلی پر وہ تھپتھپاتے ہیں۔ جو لوگ دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے کس قدر آسان ہوتا ہے کہ وہ کسی کو دیکھ کر اس کی خصوصیات کو جان لیں، ان کے طرزِ اظہار سے نتائج اخذ کر لیں۔ ان کے اعضاء کی حرکتوں سے اور ان کے ہاتھ کی جنبش سے نتائج اخذ کر لیں۔ لیکن کیا ان کے دلوں میں کبھی یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی نظر کو استعمال کر کے اپنے احباب کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا لیں، کیا وہ چہروں کو محض سرسری طور پر نہیں دیکھتے؟ کیا وہ چہروں سے اپنے پانچ دوستوں کے ہو بہو حلیے بیان کر سکتے ہیں؟ ہاں کچھ لوگ کر بھی سکتے ہیں، بہت سے نہیں کر سکتے۔ میں نے کچھ شوہروں سے ان کی بیویوں کی آنکھوں کی رنگت کے بارے میں پوچھا لیکن وہ صحیح جواب نہ دے پائے۔

بیویوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ ان کے شوہر ان کے نئے ملبوسات، نئی ٹوپیوں اور گھر میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انہی بینا لوگوں کی آنکھیں ماحول کی کچھ اس طرح عادی ہو جاتی ہیں کہ انہیں اس میں چونکا دینے والی کوئی شے نظر آتی ہی نہیں یہاں تک کہ بہت چونکا دینے والے مناظر بھی انہیں متاثر نہیں کرتے۔ عدالتی دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ گواہان کتنے غلط انداز سے شہادتیں پیش کرتے ہیں، کسی واقعے کو دیکھنے والے کس قدر مختلف انداز سے بیان کر دیتے ہیں کچھ کو کچھ نظر آتا ہے اور کچھ کو کچھ اور۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کی نظر ہر چیز پر ہوتی ہے، کاش کہ تین دن کے لئے میں بھی ان مناظر کو دیکھ سکتی اگر ایسا ہو جائے تو میرا پہلا دن بہت معروف گزرے گا۔ میں اپنے تمام پیارے دوستوں کے چہروں میں ڈوب جاؤں گی اور جو کچھ نظر آ رہا ہو گا اور جو کچھ حسن ان کے اندر ہو گا اسے اپنے دماغ پر مرتسم کر لوں گی۔ میں ایک بچے کو غور سے دیکھوں گی تاکہ میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ ایک معصوم بچہ کس طرح آگہی کے عمل سے گزرتا ہے۔ میں بہت سوں کی وفادارانہ آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈال کر دیکھوں گی میں اپنے سنجیدہ تیز طرار سکائی ڈارا اور سٹال ورٹ کو دیکھوں گی اور ڈین پر توجہ دوں گی اور ہیلڈا کی گرم جوشی، نرم خوئی اور چلبلے پن کا مشاہدہ بھی کروں گی۔ اپنے پہلے معروف دن میں میں چھوٹی چھوٹی گھریلو اشیاء پر نظر ڈالوں گی اپنے پاؤں کے نیچے بچھے نمدے کے گداز رنگوں کو محسوس کروں گی اور ان تصویروں کو بھی جو دیواروں پر آویزاں ہیں اور ان اشیاء کو بھی جو ایک مکان کو گھر بناتی ہیں اور میں اپنی ڈھیروں کتابوں پر بھی بڑے احترام سے نظر ڈالوں گی جنہیں میں چھو کر پڑھتی رہی ہوں اور شائع شدہ کتب کو بھی جنہیں بینا لوگ پڑھتے ہیں، میں اپنی اندھیری رات کے دوران جتنی کتابیں پڑھتی رہی ہوں یا سنتی رہی ہوں ان سب کو ایک ایک کر کے دیکھوں گی کیونکہ انہوں نے مجھے زندگی کے معانی سمجھائے ہیں۔ اس شام کو میں جنگلوں میں گھوموں گی اور اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاؤں گی، فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہوں گی اور اس حسن کو جذب کرنے کی کوشش کروں گی۔ گھر لوٹتے وقت میں کھیتوں اور کھلیانوں سے گزروں گی تاکہ میں گھوڑوں کو کھیت میں کام کرتے دیکھ

سکوں اور ڑیکٹروں کا مشاہدہ کر سکوں اور ان لوگوں کو دیکھ سکوں جو یہاں پر سکون زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور پھر رنگین غروبِ آفتاب کے لئے دعا کروں گی جب اندھیرا طاری ہو جائے گا تو مجھے کتنا اچھا لگے گا کہ میں مصنوعی روشنی کو بھی دیکھ سکوں گی جو انسانی ذہنوں کی پیداوار ہے اور جو اندھیروں کو اجالوں میں تبدیل کر دیتی ہے اس رات میں بالکل نہیں سو سکوں گی، میرا دماغ ان اشیاء کی یادوں سے منور رہے گا جو میں دن بھر دیکھتی رہی ہوں گی۔

اپنی بینائی کے دوسرے دن میں علی الصبح اُٹھوں گی اور اس مسحور کن معجزے کا مشاہدہ کروں گی جو رات کو دن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ زندگی کے عظیم منظر کو دیکھوں گی جو نیند کو بیداری میں بدل دیتا ہے میں بینائی کے دوسرے دن پھر سے دنیا کا مشاہدہ کروں گی اور اس کے ماضی اور حال کو جاننے کی کوشش کروں گی اور یہ جاننے کی کوشش کروں گی کہ دنیا نے کن منازل سے گزر کر ارتقاء حاصل کیا ہے۔ یہ سب کچھ میں ایک دن میں کیسے دیکھ سکوں گی ہاں یہ عجائب گھر میں جا کر ممکن ہو گا میں اکثر نیو یارک کے عجائب گھر جاتی رہی ہوں اور اشیاء کو چھو چھو کر دیکھتی رہی ہوں۔ میری خواہش رہی ہے کہ میں اس جامع تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ زمین پر رہنے والے سب انسانوں اور جانوروں اور زمین کے ماحول کا اندازہ کر سکوں بڑے بڑے ڈائنا سار جو زمین کو روندتے رہے ہیں اور قوی الجثہ ہاتھی جو زمین پر انسان کی پیدائش سے بہت پہلے موجود رہے ہیں کو دیکھ سکوں اور یہ دیکھ سکوں کہ کیسے چھوٹے سے انسان نے اپنے بہت بڑے ذہن سے ان جانوروں کو سدھایا ہے اور سلطنتوں کو فتح کیا ہے اور کس طرح زمین کو اپنا محفوظ گھر بنا لیا ہے اور ہزاروں تاریخی حقائق کا مشاہدہ کروں گی، میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ وہ لوگ جو بینائی رکھتے ہیں کیا انہوں نے کبھی ان اشیاء کا مشاہدہ کیا ہے جو اس حیرت انگیز عجائب گھر میں موجود ہیں۔ بہت سوں کو تو موقع ہی نہیں ملا ہو گا اور جن کو موقع ملا بھی ہو گا وہ نہ ملنے کے مترادف ہو گا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آنکھیں استعمال ہونی چاہئیں، اے وہ لوگو! جو دیکھ سکتے ہو اپنے دنوں کو یہاں گزارو، میں اپنی تخیلاتی سہ روزہ بینا زندگی میں صرف ایک

اچٹتی نظر ڈال سکتی ہوں۔

اس کے بعد میں وقاتی فنونِ لطیفہ کے عجائب گھر میں توقف کروں گی بالکل قدرتی تاریخ کا مطالعہ کروں گی، یہ عجائب گھر انسانی روح کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتا ہے تاریخ انسان ثابت کرتی ہے کہ انسان میں ہمیشہ فنکارانہ اظہار کی اس طرح خواہش رہی ہے جیسے کہ خوراک، گھر اور بچوں کی پیدائش کی خواہش۔ اس عجائب گھر کے بڑے بڑے کمروں میں مصر، یونان اور روم کی روح فن پاروں میں پیش کر دی گئی ہے۔ میں نے اپنی انگلیوں سے پتھر، قدیم مصر کے مجسم دیوتاؤں اور دیویوں کو چھوا ہے اور Parthenon کو بھی چھوا ہے، میں نے Athens کے جنگ جوؤں کی جنگی موسیقی کے حسن کو بھی محسوس کیا ہے۔ Apollo, Venus اور Samothrace کو بھی میری انگلیوں نے محسوس کیا ہے۔ مجھے ہاتھ مُڑے بارلیش پیارے Homer کی شکل بھی بھلی لگی کیونکہ وہ خود بھی بینائی سے محروم تھا۔

میری انگلیوں نے روما اور اس کے بعد کی نسلوں کے فنِ سنگتراشی کو بھی محسوس کیا ہوا ہے۔ میں نے Michel Angelo کے حضرت موسیٰؑ کے خوبصورت مجسمے کو بھی چھوا ہے۔ میری دنیائے محسوسات میں Rodin اور پرانے گوتھک مجسمے بھی ہیں۔ ان فنون کو چھوا جا سکتا ہے اور ان سے مطالب بھی اخذ کر سکتی ہوں، میں یونان کے مرتبانوں کی سادگی کا بھی ادراک کر سکتی ہوں لیکن ان کی تصویریں میرے سامنے نہیں ہوتیں۔

اپنی بینائی کے دوسرے روز میں فن کے ذریعے انسانی روح کے اندر جھانکنے کی کوشش کروں گی۔ جو چیزیں میں نے چھوئی ہیں انہیں دیکھوں گی میں مصوری کی دنیا کا مشاہدہ بھی کروں گی اور اطالیہ کے قدیم مذہبی نمونوں کو بھی دیکھوں گی، میں Raphael، Leonardo-da-Vinci اور Titian کے شاہکاروں کا بھی مشاہدہ کروں گی میں Veronese پر بھی اپنی نگاہیں گاڑھ دوں گی، کیا کہیے اس فن میں کتنا حسن ہے جو زمانوں سے موجود ہے اور جسے اے آنکھوں والو تم دیکھ سکتے ہو اس فن کا میں بس سطحی سا مشاہدہ

ہی کرسکوں گی ۔فنون کے ماہرین سے میں نے سنا ہے کہ فن سے لطف اندوز ہونے کے لئے آنکھوں کی تربیت ناگزیر ہے، یہ سیکھنا پڑتا ہے کہ رنگ اور ہیئت کی لکیروں میں کیا جادو ہوتا ہے مگر میں دیکھ سکوں تو میں کتنے ذوق اور شوق سے ان فنون کا مطالعہ کروں گی لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم جو آنکھیں رکھتے ہو تمہارے لئے فن کی دنیا اندھیروں میں لپٹی ہوئی ہے۔

مجھے Metropolitan عجائب گھر کو چھوڑتے وقت بڑی دقت ہو رہی ہو گی، صد افسوس کہ جو حسن فن کی صورت میں یہاں موجود ہے اسے کس قدر نظر انداز کیا گیا ہے جنہیں نظر آتا ہے انہیں ضرورت ہی نہیں کہ وہ حسن کے اس خزانے سے بہرہ ور ہو سکیں، چھوٹے عجائب گھروں میں بھی حسن بکھرا ہوا ہے کہیں کتابوں کی شکل میں جو مختلف الماریوں میں سجی ہوئی ہیں لیکن کوئی ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے والا ہے ہی نہیں لیکن میں اپنی تصوراتی بینا زندگی میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دیکھنے کی کوشش کروں گی اور فنون کے خزانوں سے مستفید ہوں گی۔

اس دوسرے دن کی شام کو میں تھیٹر میں چلی جاؤں گی اور Movies دیکھوں گی ہاں میں تو اب بھی تھیٹروں میں جاتی ہوں اور ہر طرح کے ڈرامے دیکھتی ہوں میرے ساتھی ہتھیلیوں پر لکھ کر مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں لیکن میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہوں گی، میں ہیملٹ کی دل کش تصویر دیکھوں گی اور رنگین دو پالر بتھ کے لباسوں میں Falstaff کا مشاہدہ کروں گی میں دیکھوں گی کہ کس طرح پُروقار انداز سے ہیملٹ چل پھر رہا ہے۔ میں Falstaff کے دل میں اتروں گی لیکن اس قلیل وقت میں میں صرف ایک ہی ڈرامہ دیکھ پاؤں گی ویسے تو سینکڑوں ڈرامے ہیں جنہیں میں دیکھنا چاہوں گی۔

اے آنکھوں والو تم کیا کچھ نہیں دیکھ سکتے، لیکن تم میں سے کتنے ہیں جو ڈرامہ دیکھتے ہیں اور پھر ان میں موجود معجزات کے لئے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ میں موسیقیت کے عمل کو محسوس کر سکتی ہوں اور Pavlova کی تصویر کو سامنے لا سکتی ہوں میں سُر اور تال کو سمجھ سکتی ہوں اور موسیقی کے زیر و بم کو محسوس کر سکتی ہوں میں تال کے حسن کو جذب کر سکتی ہوں، میں نے پتھر کے

بنے مجسموں پر اپنی انگلیاں پھیر کر بہت کچھ محسوس کیا ہے اگر یہ غیر متحرک پتھر مجھ میں اتنی دل کشی پیدا کر سکتے ہیں تو پھر حرکت میں آئی ہوئی اشیاء کتنی بھلی لگیں گی۔

میری یادوں میں ایک یاد یہ بھی ہے کہ Joseph Jefferson نے مجھے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو چھونے کی اجازت دی تھی، جب وہ کچھ اشارے کر رہا تھا اور کچھ بتا رہا تھا میں اس کی خفیف سی جھلک محسوس کر سکتی تھی جو ڈراموں میں موجود ہوتی ہے لیکن میں یہ دل خوش کن لمحات کبھی بھلا نہیں پاؤں گی، مجھے وہ لمحات بہت یاد آتے ہیں جب آواز اور عمل میں کمال ہم آہنگی کا مظاہرہ ہو رہا تھا، وہ کتنا بھلا تھا۔ اگر میں صرف ایک ڈرامہ دیکھ سکوں تو میں اس کی تصویر اپنے ذہن میں محفوظ کر لوں گی اور پھر میں وہ ہزاروں ڈرامے جو میں نے پڑھے ہیں ان کے عمل کو بھی محسوس کر سکوں گی۔ اپنی خیالی بینائی کے دوسرے دن کی شام کو میں ڈرامائی ادب کے کرداروں کی تصویروں کو دیکھوں گی اور تمام رات نہیں سو سکوں گی۔

اس سے اگلے دن میں پھر صبح کو خوش آمدید کہوں گی اور نئی خوشیاں میرے سامنے ہوں گی مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جو دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے صبح کا منظر روشنی کے کتنے رنگ پیش کرتا ہوگا یہ میری خیالی بینائی کے دنوں کا آخری دن ہوگا، میں کسی تاسف میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گی کیونکہ دیکھنے کے لئے میرے پاس بہت قلیل وقت ہوگا۔ میں نے اپنا پہلا دن اپنے دوستوں میں گزارا تھا۔ دوسرے دن میں نے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا اور فطرت کو پڑھا۔ تیسرا دن میں کاروباری انداز سے گزاروں گی کاروباری مقامات پر جاؤں گی جہاں بہت سی کاروباری گہما گہمی ہوگی، میں دیکھوں گی کہ نیویارک میں کیا ہو رہا ہے۔ میں اپنے گھر جو Forest Hills میں ہے سے سفر شروع کروں گی اس کے چاروں طرف سبزہ ہے، درخت ہیں اور پھول ہیں اچھے اچھے گھر ہیں جن میں سے آوازیں آ رہی ہیں خواتین کی، بچوں کی، یہ میرے لئے سکون کی جگہ ہے جب میں تھک کر شہر سے گھر لوٹوں گی تو میں یہاں سے آگے بڑھوں گی اور انسانی ذہنوں کا مطالعہ کروں گی، دریا سے گزروں گی، کشتیوں کا مشاہدہ کروں گی اگر میرے پاس دیکھنے کے لئے زیادہ دن

ہوتے تو میں دریا پر کھڑی ہو کر ان مناظر کا بڑی دیر تک مشاہدہ کرتی، لیکن اب میں نیو یارک کے میناروں کا مشاہدہ کروں گی جن کی بے شمار منازل ہیں ان کو دیکھ کر آنکھ حیرت اور استعجاب میں مستغرق ہو جاتی ہے، چمکتے ہوئے پتھر اور آہنی معجزات گویا دیوتاؤں نے اپنے لئے تیار کئے ہوں یہاں لاکھوں لوگ بستے ہیں پر کتنے ہیں جو ان مناظر پر دوسری نظر ڈالتے ہوں گے، شاید بہت کم، ان کی آنکھیں ان مناظر کو نہیں دیکھ پاتیں کیونکہ یہ مناظر ان کے لئے معمول کی بات ہیں۔

میں جس قدر ممکن ہو گا ان میں سے ایک دیو ہیکل عمارت پر چڑھ جاؤں گی اور تمام عمارات کا مشاہدہ کروں گی مجھے اپنے نیچے شہر نظر آئے گا اور پھر میں ان نادیدہ مناظر کا حقیقت سے موازنہ کروں گی مجھے یقین ہے کہ مجھے زیادہ ناامیدی نہیں ہو گی کو کہ مجھے دوسری دنیا نظر آئے گی۔ پھر میں شہر میں ادھر ادھر گھوموں گی کسی معروف کونے پر کھڑی ہو جاؤں گی لوگوں کو دیکھتی جاؤں گی اور انہیں سمجھنے کی کوشش کروں گی میں لوگوں کو مسکراتے دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھوں گی مجھے کام میں معروف اور ارادوں سے سرشار لوگ بہت ہی بھلے لگیں گے۔ مجھے کچھ لوگ مشکل میں بھی نظر آئیں گے اور میرا دل ان کے لئے ہمدردی محسوس کرے گا پھر میں Fifth Avenue پر چلی جاؤں گی اور میں پورے منظر کو یکجا دیکھوں گی۔ مجھے رنگین کپڑوں میں ملبوس خواتین کا ہجوم نہایت دل کش لگے گا میں انہیں دیکھتے ہوئے بھی تھکن محسوس نہیں کروں گی لیکن کاش اگر میرے پاس مستقل بینائی ہوتی تو میں بھی دوسری خواتین کی طرح رنگوں میں کھو جاتی۔ دکانوں پر سے طرح طرح کی دیدہ زیب اشیاء کے کیا کہنے! Fifth Avenue سے میں شہر میں داخل ہوں گی Park Avenue جاؤں گی اور پھر جھونپڑیوں کا رخ کروں گی کارخانوں میں جاؤں گی اور ان پارکس میں جاؤں گی جہاں بچے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ جب میں اپنے گھر پہنچوں گی تو ساری دنیا کے مناظر میرے سامنے ہوں گے سارے دُکھ سکھ میں محسوس کر رہی ہوں گی، میرا دل مناظر سے لبریز ہو گا، کبھی میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھنے لگوں گی، کبھی کوئی منظر مجھے اپنی طرف کھینچ لے گا جب کبھی کوئی بُرا منظر آئے گا تو میں اپنی آنکھیں بند نہیں کرلوں گی کیونکہ آنکھیں بند کرنا گویا دل

کو بند کرنا ہوتا ہے۔ لو میرا تیسرا دن بھی ختم ہونے کو آیا بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو ابھی مجھے دیکھنا ہے لیکن میں اس شام پھر تھیٹر میں بھاگ جاؤں گی اور کوئی مزاحیہ ڈراما دیکھوں گی تاکہ مجھے طربیہ ڈراموں کا بھی اندازہ ہو سکے کہ خوشی انسانوں کی روحوں میں کیسے اترتی ہے۔ آدھی رات ہو گئی ہے اب میری عارضی بینائی کا وقت ختم ہو رہا ہے اور اب میرے سامنے ایک مسلسل رات ہو گئی ہے یقیناً میں ان تین دنوں میں سب کچھ نہیں دیکھ پائی ہوں گی، یہ احساس مجھے اس وقت پیدا ہو رہا ہے جب اندھیرا مجھ پر طاری ہو گیا ہے میں نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا لیکن کچھ اچھی یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہو گئی ہیں جو میرے غم کو کم کر دیں گی۔ پھر میں دیکھی ہوئی چیزوں کو دوبارہ چھو کر دیکھوں گی۔

شاید یہ مختصری روداد اس سے مختلف ہو گی جو آپ اپنے لئے پسند کرتے۔ اگر آپ کو یہ گمان ہو کہ آپ کی بینائی چھن جاتی ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ صورتحال آپ کو درپیش ہوئی تو آپ کو یہ لگے گا کہ جیسے آپ کے پاس کبھی بینائی تھی ہی نہیں اور جو کچھ بھی آپ دیکھیں گے وہ آپ کو زیادہ دلکش اور دلپذیر لگے گا۔ میں جسے نظر نہیں آتا، بینا لوگوں کو ایک نصیحت کر سکتی ہوں وہ یہ کہ اپنی آنکھوں کو اس طرح استعمال کیجئے کہ جیسے کل آپ کو بینائی سے محروم ہو جانا ہے اور دوسری حسیّات کے بارے میں بھی یہی تصور قائم کیجئے، آوازوں کی موسیقی سنیئے، پرندوں کے چہچہوں سے فیض یاب ہو جایئے ۔۔۔۔ اس طرح سنیئے جیسے کل ہی آپ کی سماعت چھن جانی ہے ہر چیز کو اس طرح چھو کر دیکھئے جیسے کل آپ کے پاس چھونے کی صلاحیت باقی نہ رہے گی، پھولوں کی خوشبو سونگھئے، چیزوں کو چکھئے، روٹی کے ہر نوالے کی لذت محسوس کیجئے، جیسے کل آپ سونگھ نہ سکیں گے، نہ ہی چکھ سکیں گے، ہر حس سے پورا پورا فائدہ اٹھایئے، ہر پہلو سے لطف اندوز ہویئے، حسن میں کھو جایئے جو دنیا میں بکھرا پڑا ہے مگر یاد رکھئے کہ تمام حسیات میں سب سے زیادہ فرحت بخش حس قوتِ بینائی ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

Tell Tale Heart (E.A.Poe)

دل بتی

سچ تو یہ ہے کہ میں پریشان تھا، بہت ہی پریشان، میں پریشان تھا بھی اور اب بھی ہوں، لیکن کیوں! شاید آپ مجھے دیوانہ کہیں، شاید مجھے بیماری لاحق تھی، جس نے نقصان دینے کے بجائے میری حسیات کو تیز کردیا تھا، میری سننے کی قوت حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی تھی، مجھے ہر چیز جو زمین و آسمان میں ہے سنائی دینے لگی تھی، یوں لگتا تھا جیسے میں جنت اور جہنم کی تمام آوازیں سننے لگا تھا۔ تو کیا میں دیوانہ ہوں لیکن میں تو آپ کو ساری کہانی بڑے سکون سے سنا سکتا ہوں۔

مجھے معلوم نہیں، بالکل معلوم نہیں کہ یہ خیال مجھے کیسے آیا۔ میں نے ایک بار سوچا اور پھر یہ خیال دن رات مجھ پر غالب ہوگیا۔ کوئی مقصد بھی نہیں تھا اور نہ کوئی جذباتی واقعہ۔ مجھے تو بوڑھا آدمی بہت پسند تھا، اس نے مجھے کبھی ذرا بھر تکلیف بھی نہ دی تھی۔ نہ کبھی میری بے عزتی کی تھی، مجھے اس کی دولت سے کوئی سروکار نہ تھا، ہاں مجھے یوں لگتا ہے سارا مسئلہ اس کی آنکھ کا تھا، ہاں! ایسی بات تھی، مجھے اس کی آنکھ گدھ جیسی لگتی تھی۔ زرد نیلی آنکھ جس پر جھلی چڑھی ہوئی تھی، جب کبھی مجھ پر اٹھتی تو میرا خون منجمد ہوجاتا۔ آہستہ آہستہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اس بوڑھے کو جان ہی سے ماردوں اور یوں مجھے اس کی آنکھ سے نجات مل جائے گی۔

یہ بات تھی، تم مجھے پاگل کہو گے، پاگلوں کو تو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا، آپ مجھے دیکھیں گے کہ میں نے کس چابک دستی سے سارا منصوبہ بنایا، کتنی دوراندیشی کا ثبوت دیا اور کس طرح اسے عملی جامہ پہنایا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے لئے میری ساری ہمدردیاں ختم ہوگئی تھیں، ہر رات، ہر آدھی رات میں اس کے دروازے کی چٹخنی کو توڑتا اور دروازہ کھول لیتا، میں یہ سب کچھ بڑی آہستگی سے کرتا اور جب میں نے اس میں ایک سوراخ بنالیا، اس میں سے میں اندر جھانک سکتا تھا۔ میں نے ایک لالٹین تھام لی، اس لالٹین سے روشنی ادھر ادھر نہیں پھیلتی تھی اور پھر میں اپنا سر بھی اندر لے جاسکتا تھا۔ اگر آپ دیکھتے تو ہنسنے لگتے کہ میں کتنی پھرتی سے اندر گھس جایا کرتا تھا

اور بوڑھے آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور وہ سوتا رہتا تھا، سوراخ میں سر ڈالنے میں مجھے کوئی گھنٹہ لگ جاتا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ بوڑھا کیسے سویا ہوا ہے اور اس نے اپنا سر کیسے رکھا ہوا ہے۔ آپ ہی کہیے! کہ سب باتیں کسی دیوانے کو سوجھ سکتی تھیں؟ یا ایک دیوانہ اتنا فرزانہ ہوسکتا تھا؟ جب میرا سر کمرے کے اندر گھس جاتا تو میں لالٹین کو ڈھانپ دیتا اور ایک مہین سی روشنی بوڑھے کی گدھ جیسی آنکھ پر ڈالتا، میں ایسا مسلسل سات راتیں کرتا رہا اور ہر رات کو جب آدھی رات گزر جاتی تو اس کی آنکھیں بند ہوجاتیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا، میں نے کہا نا مجھے بوڑھے آدمی سے کوئی دشمنی نہیں تھی بس اس کی آنکھ سے بیر تھا۔

ہر صبح کو میں کمرے میں چلا جاتا اور بوڑھے آدمی سے باتیں کرتا اور پوچھتا کہ اس نے رات کیسے گزاری۔ بوڑھا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیا چال چل رہا ہوں۔ جب آٹھویں رات آئی تو میں کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوگیا، میں نے دروازہ کھولا اور میں نے یہ سب کچھ بڑی پھرتی سے کیا، یارو مجھے اس وقت تک معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کتنا با صلاحیت ہوں، کتنا زیرک ہوں، میں بہت ہی خوش تھا، میرا انداز فاتحانہ تھا، میں سوچ کر ہنسنے لگا، مجھے لگا کہ جیسے اس نے میری ہنسی سن لی ہو کیونکہ بستر پر اس نے کچھ حرکت سی کی تھی جیسے وہ چونک گیا ہو، میں ذرا پیچھے ہٹ گیا لیکن کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ دروازے پوری طرح بند تھے کیونکہ بوڑھا چوری چکاری سے ڈرتا تھا۔ اچانک میرا انگوٹھا ایک بٹن پر لگا، بوڑھا آدمی اپنے بستر پر چونک کر بیٹھ گیا اور چیخا "کون ہے" میں خاموش رہا، کچھ بھی نہیں بولا، ایک گھنٹے تک میں نے اپنے تمام اعصاب کو بے حس رکھا۔ وہ ابھی بستر پر بیٹھا تھا کہ مجھے ایک کراہنے کی آواز سنائی دی، مجھے لگا کہ یہ کوئی خوف زدہ انسانی آواز ہے، یہ کوئی درد کی آواز نہیں تھی یہ تو روح سے بیدار ہونے والی چیخ تھی، میں آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ تو بوڑھے کی آواز تھی، میں بھی کچھ خوف زدہ سا تھا لیکن میں مسکراتا رہا، مجھے لگتا تھا کہ وہ بہت دیر سے جاگ رہا تھا، اس کا خوف بڑھتا جارہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا "یہ تو ہوا کی آواز ہے" یا کسی چوہیا کے چلنے کی آواز یا کسی جھینگے کی آواز، وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا اسے تسلی نہ

ہوئی، اسے معلوم نہ تھا کہ موت اس کے بہت قریب تھی، یہ ان دیکھے خوف کا پرتو تھا۔ اگرچہ نہ اس نے اس کو سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ میں نے بہت دیر انتظار کیا، بڑے صبر و سکون کے ساتھ۔ مجھے لگا کہ شاید وہ لیٹ گیا ہے، میں نے لالٹین کو ذرا سا کھولا آپ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے یہ سب کچھ کس طرح چپکے چپکے کر لیا۔ ایک تھوڑی سی شعاع باہر آئی اور بوڑھے کی آنکھ پر پڑی۔

یہ بالکل کھلی ہوئی تھی میرا غیض اس کو دیکھ کر اور بڑھ گیا، میں نے اسے دیکھا ایسا لگا کہ اس کے اوپر ایک پردہ ہے۔ میری ہڈیاں لرز اٹھیں، مجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ میں نے بوڑھے کا چہرہ دیکھا نہ جسم، بس میری لالٹین کی شعاع اسی "ملعون دھبے" پر پڑی، میں آپ کو بتا چکا ہوں نا کہ حسیات کی بہت زیادہ پھرتی ہی تو دیوانگی ہوتی ہے، مجھے لگا کہ میرے کانوں کو ایک دھیمی، بے کیف اور نحیف سی آواز چھو رہی ہے، جیسے کہ کسی کپڑے میں لپٹی گھڑی کی ٹک ٹک ہو، میں اس آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ یہ بوڑھے کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ مجھ میں جوش بیدار ہو گیا میرا غیض و غضب اور بڑھنے لگا۔ لیکن پھر بھی رُکا رہا اور خاموش رہا، میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ میں نے لالٹین بھی ہلنے نہ دی اور لالٹین کی شعاع باقاعدہ اس کی آنکھ پر پڑتی رہی اور اس کے دل کی دھڑکن اور زیادہ بڑھنے لگی۔ اور تیز ـــــ اور تیز ـــــ اور بلند ـــ اور بلند"۔

یقیناً بوڑھا بہت خوف زدہ ہو گیا ہو گا، مجھے یوں لگا کہ اس کے دل کی دھڑکن ہر لحہ بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میری پریشانی بھی اور بڑھتی چلی جا رہی تھی، یہ آدھی رات کا وقت تھا اور گھر میں موت کی سی خاموشی تھی لیکن دل کی دھڑکن کا شور مجھ میں ناقابلِ برداشت خوف پیدا کر رہا تھا، میں جامد و ساکت کھڑا رہا۔ دل کی دھڑکن اور تیز ہوتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا، اس سے میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ آواز اہلِ محلّہ نہ سن لیں۔ بوڑھے کی موت کا وقت قریب آ چکا تھا میں نے لالٹین پھینک دی اور کمرے کے اندر زقند لگا دی بوڑھے کی چیخ بلند ہوئی، صرف ایک بار ہی وہ چیخا۔ میں نے کھینچ کر اسے فرش پر پھینک دیا اور چارپائی اس کے اوپر گرا دی اور پھر فاتحانہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔ میں نے

کارنامہ سرانجام دے دیا تھا لیکن کئی منٹ تک میرا دل دھڑکتا رہا، میں پریشان نہیں تھا بوڑھے کا دل دھڑکتا رہا اس کی دھڑکن دیوار کے پار نہیں جا سکتی تھی۔ آخر کار یہ دھڑکن بند ہو گئی۔ میں نے بستر ہٹایا اور اس کی لاش کو غور سے دیکھا۔ وہ پتھر بن چکا تھا، میں نے ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا اور کئی منٹ رکھے رکھا اس میں کوئی حرکت نہ تھی، وہ مر چکا تھا، میں خوش تھا کہ اس کی آنکھ اب مجھے پریشان نہیں کرے گی۔

اگر آپ مجھے اب بھی پاگل سمجھیں تو یہ غلط بات ہو گی کیونکہ میں نے پوری احتیاط سے کام لیا اور اس کے جسم کو چھپا دیا۔ رات بڑھتی گئی اور میں تیزی سے اور چپ چاپ اپنے کام میں جُتا رہا۔ پہلے تو میں نے لاش کے ٹکڑے کئے میں نے اس کا سر کاٹا، بازو کاٹے اور پھر ٹانگیں۔ پھر میں نے خوشی سے تین تختے اٹھائے اور ان ٹکڑوں کو ان کے اندر ڈال کر بند کر دیا۔ میں نے تختوں کو اتنی مہارت سے اپنی جگہ پر رکھا کہ کوئی انسانی آنکھ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس دھونے کیلئے بھی کچھ نہیں تھا، ہاتھ پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔ لیکن میں بری طرح تھک گیا تھا، جب میری یہ مشقت تمام ہوئی تو صبح کے چار بج چکے تھے لیکن ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا پھر ایک گھنٹی بجی، ایک دستک ہوئی میں نیچے گیا۔ بڑے ہشاش بشاش انداز میں، میں نے دروازہ کھولا۔ تین آدمی داخل ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پولیس کے افسر ہیں انہوں نے بتایا کہ کسی اہلِ محلّہ نے ایک چیخ سنی تھی اور انہیں اطلاع دے دی تھی چنانچہ وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے آئے ہیں۔ میں مسکرا کر انہیں ملا، مجھ میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا، میں نے انہیں خوش آمدید کہا، میں نے کہا یہ چیخ تو میری اپنی تھی جو سوتے میں بلند ہوئی ہو گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ بوڑھا آدمی تو گاؤں گیا ہوا ہے۔ میں نے انہیں سارے گھر کا چکر لگوایا۔ میں نے کہا تلاش کر لو، خوب تلاش کر لو۔ میں انہیں اس کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے انہیں اس کی تمام چیزیں دکھائیں جو محفوظ تھیں، کسی نے چھیڑی تک نہیں تھیں۔ جوش ہی جوش میں میں کرسیاں بھی اندر لے آیا اور انہیں بیٹھنے کو کہا اور میں نے اپنی کرسی اس جگہ پر رکھ لی جس کے نیچے بوڑھے کی لاش کے ٹکڑے مدفون تھے۔

پولیس آفیسر مطمئن ہو گئے۔ میرا اندازِ گفتگو ہی ایسا تھا کہ انہیں مطمئن ہونا پڑا۔ میں بھی پرسکون تھا وہ بیٹھ گئے اور ان کے سوالوں کا ہنس ہنس کر جواب دیا پھر وہ اپنی گھریلو باتوں میں لگ گئے۔ لیکن پھر کیا ہوا میرا رنگ از خود اڑنے لگا۔ میں نے چاہا کہ وہ چلے جائیں میرے سر میں درد ہونے لگا مجھے لگا کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہیں لیکن وہ بیٹھے رہے، خوش گپیوں میں مصروف رہے، میرے کانوں میں گھنٹیاں اور تیز ہو گئیں، میں نے چاہا کہ میں خوب باتیں کروں تا کہ میرا انجانا خوف ختم ہو جائے لیکن یہ خوف بڑھتا گیا۔ بڑھتا ہی گیا اور پھر مجھے یوں لگا کہ شور میرے کانوں کے اندر نہیں تھا بلکہ باہر تھا، میرا چہرہ اور زرد پڑ گیا میری باتوں کی آواز اور تیز ہو گئی۔ میں بلند آواز میں بولنے لگا، آواز تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میں بے بس ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر مجھے یوں لگا کہ یہ آواز کسی ایسی گھڑی کی آواز ہے جو کپڑے میں بند ہو، میں ہانپنے لگا، میرا سانس بند ہوتا جا رہا تھا لیکن پولیس والوں کو کوئی اندازہ ہی نہیں تھا کیونکہ میں بڑی تیز اور زوردار آواز میں باتیں کرتا جا رہا تھا مگر شور تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، بڑھتا ہی جا رہا تھا میں کھڑا ہو گیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی وضاحتیں کرنے لگا۔ اشارے کرنے لگا، ہاتھ پاؤں ہلانے لگا لیکن شور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا آخر یہ پولیس والے کب تک بیٹھے رہیں گے؟ کب جائیں گے؟ میں اٹھ کر ادھر ادھر چکر لگانے لگا اور مجھے ایسا لگا کہ میرا خون کھولتا جا رہا تھا، شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ''اے میرے مولا میں کیا کروں'' میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگی میں دیوانہ وار قسمیں کھانے لگا، میں نے وہ کرسی اٹھا دی جس پر میں براجمان تھا لیکن شور بڑھتا جا رہا تھا، گھنٹیوں کا شور زیادہ سے زیادہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا پولیس آفیسر آرام سے بیٹھے ہنس رہے تھے مسکرا رہے تھے، میں نے سوچا کیا یہ آواز انہیں سنائی نہیں دے رہی۔ میرے رب! وہ ضرور سن رہے تھے۔ شاید وہ مجھ پہ شک کر رہے تھے، شاید وہ سب کچھ جانتے تھے اور صرف میرا مذاق اڑا رہے تھے، میں سوچنے لگا میں نے کہا کہ اس کرب سے بہتر تو یہ ہے کہ جو قیامت ٹوٹنی ہے ٹوٹ جائے، اس بوڑھے مذاق سے بڑے سے بڑا دکھ بھی کم ہوگا، میں ان مکاروں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، مجھے یوں لگا کہ مجھے

چیخ اٹھنا چاہیئے اور مر جانا چاہیے، سنو! آوازیں کتنی تیز ہیں، بڑھتی جا رہی ہیں، میں چیخ اٹھا ''بدمعاشو! زیادہ مکار مت بنو، میں اعترافِ جرم کرتا ہوں کہ میں نے بوڑھے کو قتل کیا ہے، ان تختوں کو اٹھاؤ یہاں سے، یہاں سے'' ۔یہ سارا شور اس کے دل کی دھڑکن کا ہے۔

☆☆☆

Araby: (James Joyce)

آربی

شمالی رچمنڈ کی ایک بند گلی جو ہر طرح کے ہنگاموں سے بے نیاز تھی ہاں کچھ چہل پہل اس وقت دکھائی دیتی تھی جب کرچین برادرز سکول کے بچوں کو چھٹی ملتی تھی۔وہاں ایک ایسا گھر بھی تھا جس میں کوئی آباد نہیں تھا مگر یہ دومنزلہ مکان بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔گلی کے دوسرے مکان جن میں قدرے متمول لوگ آباد تھے بھی وہاں موجود تھے۔ہمارے گھر میں ایک پادری کرائے دار تھا جو عقبی ڈرائنگ روم میں رہتا تھا۔اور وفات پا چکا تھا جس کمرے میں وہ رہتا تھا اس کی آب وہوا بہت مرطوب تھی وہاں باورچی خانے کے نیچے ایک کباڑ خانہ بھی تھا،کیونکہ یہ اکثر بند رہتا تھا پادری کی وفات کے بعد اس کباڑ خانے سے مجھے بہت سے کاغذات ملے جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ان پھٹے پرانے کاغذات میں کاغذوں میں لپٹی کچھ کتابیں بھی تھیں جن میں والٹر سکاٹ کی "دی ایبٹ" میرے ہاتھ لگی،اس گھر کے پیچھے ایک باغ تھا جس میں سیب کے درخت لگے ہوئے تھے وہیں سے مجھے ایک پرانا سا بائیک ملا۔پادری بہت ہی جی دار آدمی تھا اس نے اپنی تمام پونجی مختلف اداروں کے لئے وقف کر دی تھی سوائے کچھ فرنیچر کے جو اس نے اپنی بہن کو دے دیا تھا۔

سردیوں کے مختصر سے دنوں میں کھانا کھانے کے بعد ہم گھروں سے نکل جاتے اور خوب کھیلتے جسم کو چیر جانے والی ٹھنڈی ہوا کی بھی ہمیں پرواہ نہ تھی،ساری گلی میں ہم ہوتے اور ہماری چیخیں۔ادھر ادھر سے طرح طرح کی خوشبوئیں آتی تھیں جو ہمیں بڑی بھلی لگتی تھیں اگر کبھی اس حالت میں مجھے اپنے چچا نظر آجاتے تو میں اور میرے ساتھی ادھر ادھر چھپ جاتے اور جب تک وہ گھر میں داخل نہ ہو جاتے ہم چھپے رہتے یا اگر مین گینز کی بہن کبھی اپنی دہلیز پر آتی اور اپنے بھائی کو چائے کے لئے بلاتی،ہم اسے چھپ چھپ کر دیکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ وہ وہاں ٹھہرے گی یا فوراً اندر چلی جائے گی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمارا انتظار کیا کرتی تھی،اس کی شکل روشنی میں نکھر

جاتی،اس کا بھائی آواز سنتے ہی اندر چلا جاتا اور میں کھڑا لوہے کی سلاخوں کے جنگلے سے اسے تکتا چلا جاتا۔جب وہ حرکت کرتی تو اس کا لباس ادھر ادھر لہراتا اور اس کے گھنے بال بھی رقص کرتے دکھائی دیتے۔

ہر صبح میں بڑی بیٹھک کے فرش پر لیٹ جاتا اور پردے گرا دیتا تا کہ میں دکھائی نہ دوں اور اس کے دروازے کی طرف دیکھتا رہتا۔لیکن جب بھی وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ سے نکلتی تو دوڑ پڑتا اپنی کتابیں تھامتا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا۔دل خوشی سے جھوم اٹھتا اس کی گندمی صورت ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتی جب میں اسکے گھر کے قریب سے گزرتا میری رفتار بہت کم ہو جاتی،ہر صبح یہی کچھ ہوتا۔میں نے اس سے کبھی گفتگو تو نہیں کی تھی،ہاں کبھی کبھار ایک آدھ لفظ ضرور بول دیتا تھا لیکن پھر بھی اس کا نام میرے احمقانہ لڑکپن میں بجلی کی طرح میرے دل پر اثر کرتا۔اس کی شکل ان جگہوں پر بھی میرے ساتھ ہوتی جہاں اس کا کوئی امکان بھی نہ ہو سکتا تھا۔انتہائی غیر رومانی ماحول میں بھی اس کا سراپا میرے سامنے رہتا ایک ہفتے کی شام میری خالہ خرید وفروخت کے لئے باہر چلی گئی،مجھے بھی اس کے ساتھ جانا تھا،ہم ایسی گلی سے گزرے جہاں بڑا ہنگامہ تھا لوگ آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔بڑی چیخ وپکار تھی اور ایک آدمی جو وہاں نغمہ سرا تھا اور اس شور وغوغے میں بھی مجھے اس کا نام ہی سنائی دیتا تھا اور دل ہی دل میں میرے ہونٹ اور میری آنکھیں کئی بار آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا دل پگھل کر سینے میں سرایت کر رہا ہو لیکن پھر بھی مجھے اس کا ہی خیال رہتا۔مجھے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ کبھی معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کہوں گا لیکن پھر بھی میرا جسم گویا ایک بربط تھا جو اس کے الفاظ سن کر بج اٹھتا تھا۔

ایک شام میں اپنے ڈرائنگ روم کے عقب میں پہنچا جہاں پادری نے وفات پائی تھی۔یہ بڑی اندھیری رات تھی اور کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔بارش ہو رہی تھی،ایک ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے مجھے لگا کہ زمین پر بوندیں گر رہی ہیں،دور ایک لیمپ جل رہا تھا اور ایک کھڑکی سے روشنی ظاہر ہو رہی تھی۔میں خوش تھا کہ مجھے کچھ نظر آرہا ہے اور میرے تمام حواس ملفوف

ہو گئے ہیں، میں نے اپنی ہتھیلیاں دبائیں اور ایک چیخ نکلی جب میں نے اس کا لفظ سنا تو میں پریشان ہو کر رہ گیا۔میری پیاری۔۔۔میری پیاری، بالآخر"اس نے مجھے پکارا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کیا کہوں۔اس نے مجھے پوچھا" کیا تم آربی جاؤ گے" مجھے معلوم نہیں کہ میں نے ہاں کہا یا نہیں اس نے کہا دیکھو۔۔۔۔۔وہ تو بہت شاندار بازار ہے میں بھی چاہتی ہوں کہ وہاں جاؤں ، میں نے کہا"تو آپ جاتی کیوں نہیں" جب وہ بول رہی تھی تو وہ اپنا نقرئی بریس لیٹ اپنی کلائی پر گھما رہی تھی۔وہ بولی "میں نہیں جا سکتی کیونکہ معروف ہوں" اس کے بھائی دوسرے لڑکوں کے ساتھ لڑ رہے تھے۔میں جنگلے کے پاس اکیلا تھا،اس نے بھی کھڑکی کی سلاخ ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور اپنا سر میری طرف جھکایا ہوا تھا اور روشنی میں اس کی گردن صاف دکھائی دے رہی تھی اور اس کے بال چمک رہے تھے میں نے کہا" اگر میں گیا تو تمہارے لیئے ضرور کچھ لاؤں گا"۔

اس ملاقات کے بعد جانے میرے دل میں کیا کیا خیالات آتے رہے۔میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ہفتے کا دن آئے اور میں بازار جاؤں۔رات کو اپنے بستر پر اور دن کو کمرہ جماعت میں مجھے صرف وہ ہی وہ دکھائی دیتی تھی، صفحے پر لکھے لفظوں اور میری آنکھ کے درمیان اس کی شکل حائل ہو جاتی۔میں لاکھ پڑھنے کی کوشش کرتا مگر سب بے کار تھا میرے خیالوں پر تو آربی بازار ہی چھایا ہوا تھا۔ہفتے کو میں نے اپنی چچی سے بازار جانے کی اجازت لی،میری چچی بہت حیران ہوئی اور سوچنے لگی کہ آخر مجھے کیا کام ہو گا جب میں سکول جاتا تو میں استاد کے کسی سوال کا جواب نہ دے پاتا میرا استاد حیران ہوتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔میرے خیالات میرے قابو ہی میں نہ آتے تھے زندگی کے کسی کام میں میرا دل ہی نہیں لگتا تھا مجھے لگتا تھا کہ سب کچھ میری راہ کی دیوار بنا ہے۔ ہفتے کی صبح میں نے اپنے چچا کو یاد دلایا کہ مجھے آج شام کو بازار جانا ہے اس نے کہا"ہاں مجھے پتا ہے" میں بہت پریشان ہو گیا میں شام تک انتظار کرتا رہا اور گھڑیال کی طرف دیکھتا رہا مجھے اس کی ٹک ٹک بھی پریشان کیے دیتی تھی، میں چھت پر چلا گیا کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر جاتا، میں اپنے دوستوں کو گلی میں کھیلتا دیکھتا تھا ان کی چیخ و پکار سنتا تھا لیکن ان میں شامل ہونے کو میرا دل چاہتا ہی

نہیں تھا میں تو شیشے پر اپنا ماتھا ٹیکے کھڑا تھا اور اس کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے وہاں کھڑے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔لیکن میں کھڑا رہتا تھا۔میں وہاں ایک گھنٹہ بھی کھڑا ہو سکتا چاہے مجھے کچھ بھی نظر نہ آ رہا ہوتا بس میرے تخیل میں ایک گندمی مورت ہوتی لیکن اچانک مجھے ایک روشنی دکھائی دی ایک گردن اور ریلنگ پر ایک ہاتھ۔جب میں سیڑھیوں سے اترا میں نے دیکھا کہ چولہے کے قریب مسز مری براجمان ہے۔وہ ایک باتونی معمر خاتون تھی۔اس کا شوہر استعمال شدہ ٹکٹیں اکٹھی کرتا تھا مجھے اس کی اکتا دینے والی گفتگو کو برداشت کرنا پڑا،اور چارہ ہی کیا تھا؟اس کی گپ شپ میں کھانے کا دورانیہ ایک گھنٹہ طویل ہو گیا لیکن ابھی میرا چچا نہیں آیا تھا جس کا مجھے انتظار تھا چلیئے خدا خدا کر کے مسز مری کھڑی ہو گئی اور کہا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی کیونکہ آٹھ بجے کے بعد سرد ہوا میں اس کا چلنا مناسب نہیں۔اللہ اللہ کر کے وہ رخصت ہوئی، میں اوپر نیچے، نیچے اوپر گھومنے لگا۔کمرے میں گردش کرنے لگا، بے تابی کی وجہ سے اپنی مٹھی کو کسنے لگا۔میری چچی نے کہا" مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تمہیں بازار جانا منسوخ نہ کرنا پڑے۔

خوش بختی سے کوئی نو بجے میں نے اپنے چچا کی بیرونی دروازے پر چابی کی آواز سنی جو اندر آ رہے تھے ابھی وہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ میں نے ملتجانہ انداز سے کہا کہ مجھے بازار جانے کے لئے کچھ پیسے چاہئیں، وہ سب کچھ بھول چکے تھے،انہوں نے کہا لوگ تو اپنے بستروں میں جا چکے ہیں اور اول اول نیند کے مزے بھی لوٹ چکے ہیں اور تم جانا چاہتے ہو، میں ان کی بات سے بہت خوش نہیں ہوا،میری چچی نے ذرا گرم جوشی سے چچا سے کہا کیا آپ بچے کو کچھ پیسے نہیں دے سکتے اور جانے کی اجازت نہیں دے سکتے،آپ نے اسے بڑا انتظار کروایا ہے،چچا نے معذرت کی کہ انہیں یاد نہیں رہا تھا انہوں نے کہا کہ کام ہی کام کرتے رہنا اور ذرا سی تفریح بھی نہ ہونا بچوں پر برا اثر ڈالتا ہے،انہوں نے مجھے پوچھا کہ کہاں جاؤ گے۔میں انہیں پہلے بھی یہ بات بتا چکا تھا جب میں باورچی خانے سے باہر نکلا تو وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

میرے ہاتھ میں دو شلنگ کا سکہ تھا جو میں نے بڑی مضبوطی سے تھام لیا اور میں سٹیشن

کی طرف پہنچ گیا راستے میں لوگوں کا بڑا رش تھا۔ میں ایک تھرڈ کلاس گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ گیا جو تقریباً خالی تھا بہت ہی دیر کے بعد گاڑی نے چلنا شروع کیا یہ جل کہاں رہی تھی رینگ رہی تھی کہیں کھنڈرات تھے کہیں دریا۔ ویسٹ روا سٹیشن پہنچا تو لوگ گاڑی میں گھسنا چاہتے تھے لیکن انہیں اس کی اجازت نہیں ملی کیونکہ یہ گاڑی صرف بازار جا رہی تھی۔ بس میں ڈبے میں اکیلا ہی تھا چند لمحوں کے بعد ایک پلیٹ فارم آ گیا اور اتر کر سڑک پر پہنچ گیا میں نے دیکھا کہ کوئی دس بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ سامنے ایک بہت بڑی عمارت تھی جس میں جادوئی کرتب دکھائے جا رہے تھے میرے پاس اندر داخل ہونے کے لئے چھ پینی نہ تھے اور یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں بازار بند نہ ہو جائے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور پھرتی سے ایک شلنگ ایک تھکے ہارے آدمی کو دے دیا پھر میں ایک بڑے کمرے میں پہنچا وہاں بہت بڑے سٹالز لگے ہوئے تھے لیکن وہاں بڑا اندھیرا تھا۔ وہاں کچھ ایسی خاموشی تھی جیسا کہ گرجے میں عبادت کے وقت ہوتی ہے۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے آدھے بازار کا چکر لگا لیا کچھ لوگ سٹالز کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے۔ ایک سٹال پر دو آدمی کچھ گن رہے تھے اور میرے کانوں میں کھنکتے سکوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں وہاں کیوں آیا تھا پھر میں ایک سٹال کے قریب پہنچا وہاں میں نے ایک چینی مٹی کا گلدان دیکھا اور ایک ٹی سیٹ پر میری نظر پڑی، ہال کے دروازے پر ایک نوجوان خاتون دو جوان مردوں کے ساتھ غل غپاڑے میں مصروف تھی جب اس نے مجھے کھڑے دیکھا تو وہ میرے قریب آئی اور پوچھا کیا تم کچھ خریدنا چاہتے ہو، اس کے پوچھنے کے انداز میں کچھ سردمہری سی تھی جیسے وہ شاید اپنا فرض ادا کر رہی ہو، میرے سامنے دو مرتبان ایسٹر گارڈز کی طرح کھڑے ہوئے تھے "نہیں میڈم کچھ نہیں" میں نے کہا۔ خاتون نے اپنا رخ بدل لیا اور نوجوان لڑکوں کے پاس چلی گئی اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئی ایک دوبار اس نے میری طرف دیکھا بھی، میں اس کے سٹال کے سامنے کچھ زیادہ دیر ہی ٹھہرا۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر میں آہستہ آہستہ پرے ہٹنے لگا اور بازار میں پہنچ گیا جیب میں دو پینی کے سکوں کو اپنے چھ پینی کے ساتھ ٹکرانے لگا۔

دور سے مجھے آواز آئی کہ بجلی بند ہوا چاہتی ہے۔ میں اندھیرے میں چلتا رہا جیسے میں خود اپنا مذاق اڑا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں ایک کسک تھی اور غیض بھی۔

☆☆☆

present separation as a lifelong process and Faraz has also done that in the following lines beautifully:

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

The night of separation is a single night,
But it saps and sucks the lifelong might.

The poetical work of Faraz named "Shehr e Sukhan Arasta," is a voluminous book consisting of 1664 pages. It contains 260 poems and 427 ghazals. Most of the ghazals are devoted to his amorous experiences and he has not minced matters and has rendered his experiences in such a style as has gone a long way to popularise him. His way of reciting his poetry in "Mushairas" has also been a source of great enthusiasm for his listeners. Possessed of a masculine voice, he has been casting a spell upon his audience and viewers, no other modern poet touched so much the hearts of the public as did Faraz. That's why; hundreds of his lines are stored in the memories of the people of our times and are on the tips of their tongues. Some of his lines have become proverbial. So

we may conclude that a person who is born with a silver spoon in his mouth has been lucky enough to be one of the most highly read poets of our times. His simplicity of expression and common idiom and rather the conversational expression have worked wonders and as has been said, he has been lucky enough to be sung by the most popular singers of our time.

....

References

1۔ محبوب ظفر، احمد فراز شخصیت اور فن، ص، ۴۹

2. P.B Shelley,"Fifteen Poets of LOVE",The English Language Book Society.Oxford.Landon.P.333

3. John Donne,"Love and Divine Poems"A Nocturnalupon,St. Lucy's day,Lahore,P.270

4۔ فارغ بخاری، "ماہِ نو" احمد فراز نمبر" جنوری ۲۰۰۹ء، ص۔ ۳۰

5۔ کشور ناہید، "ماہِ نو" ایضاً، ص ۴۲

6۔ پروین شاکر، ایضاً۔ ص۔ ۷۷

☆☆☆☆

a perfect woman through out his life. In the quest of a perfect woman he has been undertaking life-long journey and has met all types of women, all sorts of ladies, all colours of fairies and has been rendering in his poetry verbatim, the essence of his experience which gives him an edge over many poets of love and has won him honours among all segments of society. His experiences have no end and therefore his poetry sounds very rich and attractive as it is all embracing.

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

You are neither a god, nor I a vision,
Why between us is there a division.

....

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

The night of union is a bygone lore,
But its ecstasy is in every pore.

"Love is the Whole history of a woman's life
but it is only an episode in man's"۳ی

Faraz is hardly in an ecstatic mood but some of

his verses are really noising especially the ghazal, which begins with this verse–

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

what a sight of wonder, how to laud
Is she an idol, or a god.

....

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نجانے مانگے

O! dear Faraz, heart is never content,
To get ever more, it is ever bent

See another vital experience of love mongers

اے فرازؔ اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تک دیکھتا رہا مجھ کو

If she was not pained at my parting,
Why her eyes kept on darting.

The poet has used the male gender meaning there by a female one. Here Faraz is following the tradition of Urdu poetry, where women were always considered boys, handsome boys.

It has also been a convention of Urdu poetry to

Even at your loss, I did not die,
How courageous ah! am I.

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

You deem formality part of love,
Not all's friendship my dear dove,

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

She broke off relations at the end,
No room left for me to contend.

کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

How I loved you, how I pine,
What a deadly fate was mine,

The reader may have well assessed the various tints and hues of his poetry especially with reference to various aspects of love and it is again interesting to note that these hues and colours are the hues and colours of the poet's own heart. He has said somewhere that he has always been in, what he calls "a romantic fever" and awfully says that he has not found

tea for a tired person, or just like a song to remove the boredom. Faraz is fabulously rich in such experiences. He comes across beauties, encounters them, loves them, and some times passes by them. He feels the sorrow of separation, the sweetness of union but his experiences are very short-lived. Like a beetle he some times, enjoys the company of flowers and then flies away. Nay this is not the whole truth about him. The whole truth about a poet is always partially known. Moreover, a poet lives in various moods and modes of feelings. Like the poetry of John Donne, we can perceive all the possibilities of love in the poetry of Ahmad Faraz, right from the soul to the body.Faraz has had the experience of love and he does not mind expressing it.

مدتوں سے یہی عالم، نہ توقع نہ امید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں! جاناں!

All hopes are deaf, speculations dumb,
The heart is crying, my love! my love!

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

I have only this to complain,
Met we late, that's the pain.

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

Our love is like a flower,
But fades soon all this bower.

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

In my ghazals thou always sing,
How to forget such a precious thing.

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

The change of weather makes me think,
How soon friends flee and shrink.

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

Let there be complaints, my dear heart!
Come dear come! only to depart,

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

The betrayals in love brought us together
I wasn't yours you were neither.

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اس طرح سے کبھی مجھے خواہش منزل نہ رہی

We travelled both dear today
The vision of goal vanished away.

All these go a long way to explain our point of view that he talks of love but love which is "every day" love, which is just like a candle which shines for a moment and then darkens everything. Love which is rosy, attractive and heart ravishing but not lasting, enduring and permanent. Modern civilization has ceased to produce, Laila Majnu, Shirin Farhad ,Romeo and Juliet, Anthony and Cleopatra, Heer Ranjha, Radha Krishna, so forth and so on. The present day love is just like a shady tree in the scorching heat, a well in the desert for the traveller and a beacon light for a voyager or rather a cup of wine or say, a cup of

is quite different from those of Wali, Meer, and Ghalib. His beloveds are connected with cultural functions, dinners domestic literary gatherings and his co-seaters in the aeroplane. She says that we don't know whether he is a chain smoker or not, but he is certainly a chain lover.(6)

Thus he is possibly not known to that love which burns and consumes, which destroys or ruins and even that love which elevates and sublimates. It is a love of comfort and leisure which may last some days, some months or say a few years. His first marriage lasts only for five years and then perhaps he chooses a spouse of his own convenience who may have reconciled with him and that is why he is always in the galaxy of beauties, in the cluster of stars and in the company of nymphs and comes to understand the psychology of this type of progressive modern young girls and that is partly the reason that some of the critics tend to consider him "a poet of teenagers" , a poet of colleges, universities and a poet of immature love. When we study his love poetry, we are really

touched by it for its variety, diversity, colourfulness, rhythmic beauty, simplicity and spontaneity. A few verses are quoted at random to have glimpses of his poetic excellence and thematic diversity.

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

Of the arrival of Mary, when I sing,
In the churches of words, the bells do ring.

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

A year has passed without her,
The times were mine,when you were hither.

تیری باتیں ہی سنانے آئے
لوگ بھی دل ہی دکھانے آئے

Every one came to talk of you
Every one came to hurt me too.

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

The painful were the times of departure,
The smiling night was turned to torture.

Mehboob Zafar, his friend and commentator asserts that Faraz has transformed love in to a passion. (1)

We may not endorse it. His poetry celebrates a love which some times degenerates into mere enjoyment and pastime, and the poet appears to be simply a flirt. There are reasons which we will discuss later on. Here it is pertinent to highlight what the true love is like. For instance, let us go through the following lines by P.B Shelley(1972-1822):

I can give not what men call love,
But wilt thou accept not,
The worship the heart lifts above.
And the heavens reject not,______
The desire of the moth for the star,
Of the night for the morrow,
The devotion to something afar
From the sphere of our sorrow? (2)

And in the same frenzy of love, John Donne accounts for what havoc love has brought;

"For I am every dead thing
In whom love wrought new alchemy

For this art did express
A quintessence even from nothingness
From dull privations, and lean emptiness;
He ruine'd me, and I am re- begot
Of absence, darkness, death; things which are not. (3)

Such passions, such havocs and thunderbolts are missing in Faraz.Perhaps the reason being that he is good at winning hearts, wooing beauties and courting fairies. His friend Farigh Bukhari, in one of his articles writes "Girls, like new cigarette brand, are placed in his briefcase, he can take up any brand , smoke it and throw it away after having a few puffs." (4)

Even Kishwar Naheed a great poet and critic and his friend in a letter endorses this point. She says "It is in her knowledge that girls of colleges and universities have been writing letters to him". (5)

His contemporary and almost equally a popular poet Parveen Shakir, calls him "a problem child of Urdu literature" and says that he is the first poet to release the tension and intensity of Ishq. His beloved

field of poetry. The one highly ennobling feature of his poetry being his love for the down trodden and the down cast. He develops a soft corner in the hearts even of those who might have repelled his fickle mindedness in love. He turns up to be a great fighter of liberty to win liberties for him and for many readers. The patronage of Nadeem and Faiz also paved the way for his stupendous success in the annals of Urdu poetry. Moreover, the simplicity of his expression, lucidity of his ideas and truthfulness and genuineness of his experience go a long way to win him a place of honour and respect. He does not, as is sometimes said of the English poet John Donne(1572-1631) perplex the minds of fair sex with nice speculations of philosophy and unlike him, Faraz engages the hearts of fair sex with softness, tenderness and homeliness of love. He does not dwell in an ivory-tower. He is on earth and does not touch the fringes of the firmament. He does not resort to Platonic or Petrarchan strains which have been exhausted by his predecessors and even his contemporaries. He talks

of love in a pure, simple andgenuine style and generally banks upon his personal experiences which give more earthliness and purity to his expression as a lover. As we will see, he does not brag of any idealism and talks of his frailties as well as "profane mistresses" very openly and warmly. Faraz reminds us of a great English poet Byron(1788-1824) who is known to be the visitor of ladies and had a great attraction for them. So much so that they came to idealise and even develop a Byronic Cult. He ravishes their hearts and wins their souls to that extent that he poses a threat to the moral sense of his country and he is ultimately exiled. Faraz has also been exiled from his country but not for amorous reasons but for his revolutionary ideas rather he imposes this banishment on him voluntarily as he finds the earth slipping under his feet, and is sure to be tortured beyond his expectations.

As a lover, as has already been said, he is a controversial figure and it so appears and can be witnessed from his poetry that he lacks the flame and fire of love which is known as "Ishq". Although,

Ahmad Faraz A Lover and A Poet

Love and Poetry in Faraz are inseparable. Both are the offsprings of a thinking mind and a feeling heart. There is no denying the fact that love enjoys a paramount importance in the world of literature, specifically poetry. Right from the ancient Greeks down to our times, love has inspired immortal pieces of literature and yet it so appears that an inundation of love remains to be composed and the fire of love yet to be rhymed. The more the poets have sung of love, the more they have touched the chords of human heart. The more they have been inspired by love, the more they have inspired their readers. No doubt the pangs of poverty, the whips of injustice, the callousness of the powerful have also deserved attention. Yet the bird of love has ever flown in the bower of poet's mind and has shed its unimaginable influence.

Faraz is one of the poets of love who have charmed human hearts and captivated human minds in our times. Right from the poetry of Dagh, Jigar, Sahir,

Faiz, Munir and many others down to Ahmad Faraz, love has found a fertile soil in the twentieth century, but Faraz appears to be the most salient love singer of our times. For so many reasons just like Dagh, Jigar, and Adam, he is on the lips and in the soul of his contemporaries.

The fact remains that Faraz remains the great love poet for many reasons, though not greatest in many ways. Born with a silver spoon in his mouth in a Syed family, the son of Muhammad Shah Barq, a poet of Pushto,Urdu and Persian languages, Faraz is placed in a literary environment and develops into poet in a great proportion and magnitude. A number of his verses have gone into the memories of thousands of his readers and many gazals, sung by great musicians which have won him fame, name and popularity. Placed on the very high pedestal of social responsibilities, he wins the hearts and minds of many of his acquaintances, endowed with a sweet voice and an attractive figure, he wins laurels in the

۲۳۔ایضاً۔(ساقی نامہ)،ص۔۴۱۸

۲۴۔کلیاتِ اقبال اردو۔"بانگِ درا"(ستارہ)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء،ص۔۱۴۷

۲۵۔ایضاً۔"بالِ جبریل"،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء،ص۔۳۵۲

۲۶۔ایضاً۔ص۔۳۵۷

۲۷۔ایضاً۔ص۔۳۶۶

۲۸۔ایضاً۔"ضربِ کلیم"(علم اور دین)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء،ص۔۴۸۸

۲۹۔ایضاً۔"بالِ جبریل"شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء،ص۔۳۱۹

☆☆☆

2۔کلیاتِ اقبال اردو(بالِ جبریل)،شیخ غلام علی اینڈ سنز فروری ۱۹۷۳ء،ص ۳۲۰

۳۔ایضاً،ص ۴۱۹

۴۔کلیاتِ اقبال فارسی،(جاوید نامہ)،شیخ غلام علی اینڈ سنز فروری ۱۹۷۳ء،ص۔۷۷۹

۵۔ایضاً

۶۔کلیاتِ اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء۔ص۔۲۰۱

۷۔ایضاً ص۔۲۰۷

۸۔قرآن مجید۔سورۃ ابراہیم۔آیت ۳۲ پارہ ۱۳

۹۔قرآن مجید۔سورۃ الاسراء،آیت ۷۰ پارہ نمبر ۱۵

۱۰۔کلیاتِ اقبال اردو(بالِ جبریل)،شیخ غلام علی اینڈ سنز فروری ۱۹۷۳ء،ص ۴۴۳

۱۱۔جاوید اقبال،(زندہ رود)،غلام علی اینڈ سنز،۱۹۸۱ء،ص۔۲۲۱

۱۲۔ایضاً

۱۳۔کلیاتِ اقبال فارسی(پس چہ باید کرد)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۵ء،ص۔۷

۱۴۔کلیاتِ اقبال اردو(ضربِ کلیم)،۱۹۷۳ء،ص۔۴۷۸

۱۵۔ایضاً۔ص۔۵۰۰

۱۶۔کلیاتِ اقبال فارسی(پس چہ باید کرد)،۱۹۷۳ء۔ص۔۸۱۸

۱۷۔کلیاتِ اقبال فارسی(پیامِ مشرق)،شیخ غلام علی اینڈ سنز فروری ۱۹۷۳ء،ص ۲۲۸

۱۸۔ایضاً۔ص ۲۵۵

۱۹۔کلیاتِ اقبال اردو(ضربِ کلیم)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء،ص۔۴۷۹

۲۰۔ایضاً۔(مومن)،ص۔۵۰۷

۲۱۔ایضاً۔"بالِ جبریل"،(مسجد قرطبہ)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۳ء،ص۔۳۸۹

۲۲۔ایضاً۔"،(طارق کی دعا)،ص۔۳۹۷

They stuck to the jurisprudence of early doctors of religious thinking, and started hating any change in tradition and the result, Muslim Umma lost its glory and grandeur. The19th and 20th centuries witnessed a holocaust which still continues. It stands in dire need of restructuring the fabric of Islam in the light of the fast changing world. We see that Iqbal's notion of struggle is the lifeblood of Muslim Ummah in particular and the whole mankind in general. His idea of change and transition is the only recipe for our ailing Millat.

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات(۲۳)

Iqbal infact believes in non-serial time which does not divide days from months and months from years. This is a continuous stream of life which requires ever new efforts.

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں(۲۴)

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں(۲۵)

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے(۲۶)

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش!
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش(۲۷)

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم(۲۸)

This is Iqbal's concept of struggle, ever more struggle which continues without any rest and respite. Only this zeal and zest, commitment to life and devotion to the cause can bring back the millennium and restore the prestige and honour of the Muslim Ummah which it has enjoyed for centuries.

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں(۲۹)

☆☆☆☆

حوالہ جات

1. Muhammad Saeed Sheikh," The Reconstruction of Religious Thought in Islam" by Allama Iqbal,(The Principle of Movement in the Structure of Islam), page 117

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی(۴۲)

Because of this grim struggle unquivering faith, and unflinching determination, they hoasted their flags over most of the world, but with the passage of time, this fire began to extinguish. This zeal began to diminish and this gusto lost its lustre. The Ummayyads and Abbasids began to roll in wealth and indulged in mutual conflicts. Khilafat degenerated into monarchy and unity of Islam was shattered and external forces played havoc. The fall of Baghdad in 1258 sapped the Muslim's energy. Moreover, intellectual somersaults weakened the Muslims. They took shelter in mysticism which deprived them of the power of action. They started taking shelter in caves and indulged in praise of Islam simply. They closed the doors on IJTEHAD which lays emphasis on ever understanding, renewing and finding out solution to the problems of life arising with the passage of time.

and order and providing the basic necessities to every one. These people were not super human beings but in fact they were the men and women of flesh and blood. They only undertook to implement the scheme of things as enshrined in the Holy Quran and illustrated by the Holy Prophet by his deeds and actions. This is why Iqbal always lauds and praises these heroic souls and their valiant exploits.

ناوک ہے مسلماں تو ہدف اس کا ہے ثریا
ہر سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج(۱۹)

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن(۱۰)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز(۲۱)

حذر ای پردگیان پردہ دری پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازین گنبد درینہ دری پیدا شد(۱۸)

What a glowing tribute, what an inspiring homage, what a beautiful and splendid delineation of human life! of man who is the lord of creation, and this is amply proved by the Muslims under the guidance of the Holy Prophet(PBUH) and his companions who strained their every nerve, used every ounce of their energy utilised the sterling qualities of head and heart, for 23 years. The banner of peace and plenty, hope and expectancy was unfurled the Holy Prophet(PBUH) endeavoured his level best to usher in an era of unique fraternity, unprecedented equality and to hither unknown sense of self respect and self security.The caliphs remained awake day in and day out to see that no one remains unfed,

unattired and unsheltered. No one fears from the savagery of uncivilised world. This was the greatest revolution history ever witnessed and this was because the Muslims knew no rest in maintaining law

human race, and ordains the angles to salute him and to bow to him respectfully.

This is amply proved by human endeavours in all fields of life. Man, the MARD_E_MOMIN of Iqbal has worked wonders because he can never luxuriate for a moment. He is always struggling forever more and evernew. This is the crown and glory of this movement to reshape and remould nature to his benefit and to the benefit of all mankind. Iqbal exalts this Super Man this MARD_E_MOMIN

"زندہ ی مشتاق شو خلاق شو"

Iqbal conclusively says without any ambiguity and proves it in his poetry and prose that man is a creative and creating force.

He pictures the celebration of the creation of man in his own characteristic way.

نعرۂ زد عشق کہ خونین جگری پیدا شد
حسن لرزہ کہ صاحب نظری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہان مجبور
خود گری خود شکنی خود نگری پیدا شد
خبری رفت ز گردون بہ شبستان ازل

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست(۱۵)

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است(۱۶)

He believes that man is capable of under-taking any change for the better and for the best and this capability has been endowed to him by his Creator so much so that he becomes the co- creator.

The well-known verses of Iqbal speak very boldly of this sublimation and grandeur and human glory. He says

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (۱۷)

These are highly eloquent expressions of Iqbal which justify the scheme of things explained by God which even the angels failed to comprehend, and God on His own account rejects the futility of creating

helplessness which have sapped them of all their power and independent reflection.

He pays a glowing tribute to Molana Room who is the poet of struggle.

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر(۱۳)

He also opposed to the mysticism which nullifies human action because according to him action is life.

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

He protests against the idea of human incapacity to carve any new paths.

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر(۱۴)

دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ(۱۰)

Iqbal's poetry infact is nothing less than a bower of hope and expectations, source of light and delight, a microcosm of vigor and vitality. Therefore, he flatly rejects all notions of human helplessness.

According to him, the concept of TQDEER as explained by certain orientalists and even some occidentalists, renders man helpless. Therefore, at a stage, Iqbal comes to denounce Hafiz Sheerazi;

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار(۱۱)

And he further considers Hafiz to be a negative force.

آں فقیہِ ملت میخوارگاں
آں امامِ امتِ بیچارگاں(۱۲)

According to him, the negation of KHUDI is negation of life and he says that Indian muslims have terribly suffered a lot because of their notions of

چہ لذت یا رب اندر ہست و بود است
دلِ ہر ذرہ در جوشِ نمود است
شگافد شاخ را چون غنچۂ گل
تبسم ریز از ذوقِ وجود است(۶)

دمادم نقش ہای تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست(۷)

This is not an empty boast "God has himself propounded that He has conquered every thing for man"

وسخرلكم الشمس والقمردآءبين وسخرلكم ليل والنهار(۸)ــــــــــــــولقد كرّمنا بنى آدم(۹)ـ

Iqbal says and how beautifully:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے

نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے(۳)

How beautifully and artistically, Iqbal has rendered his idea of struggle and striving in the process of evoluation of life. He rejects all taboos and impediments and believes that human ego is a terrible sword which sweeps away every thing which is stopping it to forge ahead. He says that this "KHUDI" is the greatest universal awakening and does not care for endless oceans, topless mountains, unlimited deserts, it rather surpasses time which becomes its petty servant and knows no limits and dwells in eternity. Time can not slow its speed. It soars, it mounts, it delves deep and conquers all which comes in its way and Iqbal goes to the extent of considering man to be able to create a brave new world. This is his

creative power, he candidly states:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ماہ جز کافر و زندیق نیست(۴)

He goes to say.

در شکن آں را کہ نہ آید ساز گار
از ضمیرِ خود دیگر عالم بیار(۵)

Iqbal's ego knows no rest no respite. He may say with American poet Robert Frost

The woods are lovely dark and deep
But I have promises to keep
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep

He may crave of going to the utmost limits like the Ulysses of Tennyson, who is old but is replete with gusto and zeal.

Iqbal's philosophy of struggle is very comprehensive. He believes that man is the lord of creation. What is in the universe, is at his disposal and therefore change is the spice of life which partly is the result of human struggle and partly the inevitable scheme of things.

Iqbal's view of Struggle in the Making of life

Indefatigable endeavours, ceaseless strivings, endless efforts go to the making of the warp and woof of human existence and they, by all means, are the pillars on which the edifice of human existence is erected, and this view point is not only Iqbalian but is endorsed by all scientific and biological evaluations. Iqbal, in all his poetical works and prose goes a long way to substantiate this vital truth of life. In his lecture "The principle of movement in the structure of Islam", he unambiguously rejects the old idea of static living. He further says "as a cultural movement, Islam rejects the old view of the universe and preaches a dynamic view"

Iqbal considers development and progress to be an inevitable principle. In this article, he further states with reference to Islamic revolution. " The world-life intuitively sees its own needs and at critical moments, defines its own direction"[۱]

This is why Iqbal advocates a free will, capable of

forging ahead and seeking forever new outlets, avenues and gateways.

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں(۲)

This endorses his view point of change and transition. He believes that human actions are not pre-determined and pre-decided and human will which is tantamount to human ego, works all the wonders. The human ego has a magical power to reshape and remould the "dull dense life".

This is why, Iqbal very clearly elevates human assertion and human ego and defining it, he asserts.

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے

English Essays